تاریخ ریاست سوا

و

سوانح حیات جنابان گل گل شہزادہ

یعنی

شاہ عبدالودود خان معمار ریاست سوا

از

محمد آصف خان سوات ثبت

تاریخ ریاست سوات

و

سوانح حیات جناب میاں گل گل شہزادہ

یعنی

شاہ عبدالودود خان معمار ریاست سوات

از

محمد آصف خان سوات سٹیٹ

فیروز سنز پشاور

ے

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل

قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

عرفی

۵

ہوا اپنے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اِس شہر سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت کو چاہو مانندِ سیلِ رواں چل
یہ وادی ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

اقبالؔ

مشہور آدمیوں کی سوانح عمری نوعِ انسان کی ترقی کا
مفید ذریعہ ہے جس طرح کہ پہاڑوں پر چاروں طرف
روشنی پھیل جاتی ہے۔ اُسی طرح ان کی روحانی روشنی
آئندہ نسلوں کے واسطے اپنی چمک جاری رکھتی ہے

(ڈاکٹر اسمائلس مصنف سیلف ہیلپ وغیرہ)

مشاہیر کی سوانح عمری اور تاریخ کے مطالعے
سے زندگی بنانے میں بہت کچھ مدد ملتی ہے۔

(حالی)

عرضِ مصنف

اِس کتاب کی ترتیب و تصنیف میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے:۔

۱۔ تاریخ خورشید جہان

۲۔ پٹھانوں کی تاریخ ——— از۔ قاضی عطاء اللہ خان مرحوم

۳۔ تذکرۂ اخوند ——— از۔ دروزیہ صاحب

۴۔ دربار اکبری ——— از۔ مولانا آزاد

۵۔ اٹک سے اُس پار ———

۶۔ انقلاب افغانستان ——— از۔ عبدالحمید خان

۷۔ تاریخِ ہند ——— مُصنفہ۔ محمد قاسم فرشتہ (تاریخ فرشتہ)

۸۔ ایران عہد ساسان ——— از۔ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین

۹۔ پشتو بائبل ——— ترجمہ۔ قاضی عبدالرحمان۔

اِن مذکورہ کتابوں سے استفادہ صرف بادشاہ صاحب کی سرگزشت سے پہلے حصہ اوّل میں تاریخی تسلسل میں حاصل کیا گیا ہے۔

(محمد آصف)

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	حصہ اوّل	
۱	دیباچہ	۱۹
۲	شاہراہِ حیات	۳۰
۳	ریاست سوات و متعلقات	۳۱
۴	اسلام سے قبل کا سوات	۳۲
۵	سوات میں اسلام کا داخلہ	۳۷
۶	یوسف زئی پٹھانوں کا سلسلۂ نسب اور قبولِ اسلام	۴۰
۷	یوسف زئی دوسرے علاقوں میں	۴۲
۸	سوات اور وجہ تسمیہ	۴۳
۹	یوسف زئی کا سوات پر قبضہ، کابل سے اخراج	۴۴
۱۰	یوسف زئی کی اولین تنظیم	۴۶
۱۱	ظہیر الدین بابر اور یوسف زئی	۴۷
۱۲	اکبر اعظم، پیر روشن اور یوسف زئی	۴۹
۱۳	اکبر کے بعد	۵۹
۱۴	اورنگ زیب اور یوسف زئی	۶۰
۱۵	اورنگ زیب کے بعد	۶۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۶	احمد شاہ ابدالی اور یوسف زئی	۶۲
۱۷	رنجیت سنگھ، سید احمد بریلوی اور یوسف زئی	۶۴
۱۸	بریلوی کے بعد	۶۳
۱۹	سوانی پٹھان	۶۶
۲۰	تفصیل قوموں کی	۶۷
۲۱	صاحب سوات، رجل عظیم	۷۰
۲۲	صاحب سوات کے بعد	۱۱۲
	حصہ دوئم بادشاہ صاحب کی سرگزشت	
۲۳	سن پیدائش و بچپن	۱۲۷
۲۴	بارعب شخصیت اور مکتب عمل کی تعلیم	۱۲۹
۲۵	دیوانہ میاں گل	۱۳۲
۲۶	سید بادشاہ کی جد وجہد	۱۳۴
۲۷	سید بادشاہ کے بعد	۱۳۹
۲۸	علاقہ بابوزئی	۱۴۴
۲۹	امیر بادشاہ کے بعد	۱۴۵
۳۰	پارٹی ردّ و بازی، کی تشریح	۱۴۶
۳۱	فریضۂ حج اور اسلامی ممالک کی سیاحت و شہزادہ شیریں جان کا اختلاف	۱۴۹
۳۲	سبدو شریف پر شہزادہ شیریں جان کا حملہ	۱۵۱
۳۳	اختلاف کے وجوہات اور بابوزئی کی حکومت	۱۵۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۴	جنگ سیدو کی عارضی صلح کے بعد	۱۵۸
۳۵	کاشیلی کی لڑائی	۱۶۰
۳۶	قمبر کی لڑائی	۱۶۳
۳۷	پشتو کا زمانہ (قبائلی عہد)	۱۶۵
۳۸	خدائی امداد اور درس عمل	۱۶۸
۳۹	پشتو عہد میں ہتھیار اور جنگ کے طریقے	۱۷۱
۴۰	دریا سوات کے پار علاقوں پر نواب دیر کا قبضہ اُسکے وجوہات اور آزادی	۱۷۲
۴۱	مشترک حکومت کی دعوت	۱۷۶
۴۲	۱۹۱۴ء میں عبدالجبار شاہ کی حکومت	۱۷۷
۴۳	چکدرہ، دلبار، میں سکونت اور جدوجہد	۱۸۰
۴۴	عمائدین موسےٰ خیل کا جرگہ	۱۸۳
۴۵	نواب دیر کی لشکری امداد سے سوات پر حملہ	۱۸۴
۴۶	سیدو کی فتح اور مانیار کی لڑائیاں	۱۸۶
۴۷	نواب صاحب کے پاس دیر میں	۱۸۷
۴۸	سوات کا ناکام حکمران عبدالجبار	۱۸۹
۴۹	تھانہ مالاکنڈ میں ایک کانفرنس، بابوزی کی حکومت	۱۹۰
۵۰	نواب دیر کے خلاف متحدہ محاذ	۱۹۱
۵۱	۱۹۱۵ء میں سوات کی حکمرانی اور تعمیر ریاست	۱۹۳
۵۲	حکمران سوات بننے کے بعد پہلی کامیابی	۱۹۶
۵۳	شہزادہ شیریں جان کی شہادت	۱۹۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۵۴	عبدالعزیز ہشت نگری کی کارروائی	۱۹۷
۵۵	استحکام حکومت اور فوجی تنظیم	۱۹۸
۵۶	۱۹۱۷ء میں نواب دیر کا دوسرا حملہ سوات پر	۱۹۹
۵۷	نواب دیر کا تیسرا حملہ سوات پر	۱۹۹
۵۸	۱۹۱۸ء میں نواب صاحب کا چوتھا حملہ سوات پر	۲۰۰
۵۹	ایک خواب ایک حقیقت	۲۰۰
۶۰	وسعت حکومت	۲۰۱
۶۱	اس دور کا سوات اور خوانین	۲۰۳
۶۲	جرائم اور جرمانے	۲۰۵
۶۳	ایک واقعہ ایک حکایت	۲۰۸
۶۴	ایک مثال ایک لطیفہ	۲۱۲
۶۵	خوانین کی ذہنیت	۲۱۳
۶۶	فوجی ڈسپلن سے مذاق	۲۱۴
۶۷	جاہلیت اور دیدہ دلیری	۲۱۷
۶۸	اللہ کے فقیر	۲۱۸
۶۹	آمدورفت کے ذرائع	۲۲۰
۷۰	قلعوں کی تعمیر ریاستی ڈیفنس	۲۲۰
۷۱	اصلاحات	۲۲۱
۷۲	قوانین کا نفاذ	۲۲۲
۷۳	عید کے نرالے تہوار	۲۲۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۷۴	تعلیم سوات میں	۲۲۶
۷۵	پیہم مشکلات ادین زئی کے محاذ پر	۲۲۸
۷۶	ادین زئی کی بغاوت ڈپٹی پولٹیکل ایجنٹ کے ایما پر مزید مشکلات	۲۳۰
۷۷	علاقہ ادین زئی کی واپسی	۲۳۸
۷۸	کانا خور بند اور بونیر کی تسخیر کے منصوبے	۲۳۹
۷۹	درۂ کوہستان بحرین پر قبضہ	۲۴۰
۸۰	بونیر پر قبضہ اور انگریز کے ساتھ سیاسی چال	۲۴۱
۸۱	ایک افسوس ناک واقعہ اور ادائے فرض	۲۴۳
۸۲	کانا، پورن، وغیرہ علاقوں کا لشکر	۲۴۶
۸۳	۱۹۲۴ء میں نواب امب کی لشکر کشی	۲۴۷
۸۴	ملکی انتظامات اور کانا چکیر کی تسخیر	۲۵۰
۸۵	کوہستان ایک مضبوط طاقت	۲۵۵
۸۶	مستقل تقسیم اراضی	۲۵۷
۸۷	انگریزوں کے ساتھ تعلقات	۲۶۲
۸۸	ولی عہد کا تقرر	۲۶۴
۸۹	انگریزی حکومت کا ریاست کو تسلیم کرنا	۲۶۶
۹۰	تسخیر کوہستان	۲۶۶
۹۱	لارڈ اِردن سوات میں	۲۶۸
۹۲	ملکی انتظامات و طریق کار	۲۷۲
۹۳	محکمۂ قضا کی تنظیم	۲۷۳

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۹۴	ہمارے قوانین	۲۷۴
۹۵	کورٹ فیس وغیرہ	۲۷۵
۹۶	کچھ تعمیری کارگزاریاں	۲۷۶
۹۷	کوہستان کے تین دروں کی تسخیر	۲۷۷
۹۸	پٹن کوہستانی تنظیم کا مرکز	۲۷۸
۹۹	علاقہ کوہستان میں انتظام حکومت	۲۸۰
۱۰۰	خوابوں کی دنیا اور میرے خواب	۲۸۲
۱۰۱	ریاستی عوام کو غیر مسلح کرنا	۲۸۸
۱۰۲	زندگی کا عظیم کارنامہ بقول سرگرفتھ گورنر سرحد	۲۹۱
۱۰۳	اسلحہ عوام سے لینے کے بعد	۲۹۴
۱۰۴	مثالی امن	۲۹۵
۱۰۵	لشکر میں اضافہ	۲۹۶
۱۰۶	موٹر لاریوں کی آمد اس دیس میں	۲۹۷
۱۰۷	باغبانی سے متعلق اصلاحات	۲۹۸
۱۰۸	پارچہ بافی سے متعلق اصلاحات	۳۰۰
۱۰۹	فرسودہ رسومات کا انسداد	۳۰۲
۱۱۰	تعلیم کے لئے مجدد جہد	۳۰۲
۱۱۱	شفاخانوں کا اجرا	۳۰۵
۱۱۲	پشتو زبان سے ہماری دلچسپی	۳۰۵
۱۱۳	انتظام حکومت	۳۰۸

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۱۴	دو سو سال کے قدیمی تنازعات پیچیدہ مقدموں کے فیصلے	۳۱۰
۱۱۵	فوجی اور ملکی تنظیم	۳۱۶
۱۱۶	جیل خانے اور تعطیلات	۳۱۷
۱۱۷	تعیرات اور بعض ناموں کی تبدیلی	۳۱۹
۱۱۸	وادیٔ کلام	۳۲۱
۱۱۹	تعمیرِ پاکستان کی جدوجہد میں ہمارا حصہ	۳۲۳
۱۲۰	کشمیر کے محاذ پر	۳۲۵
۱۲۱	بارہ دسمبر ۴۹ء حکومت سے رضاکارانہ دستبرداری	۳۲۷
۱۲۲	حکمرانی کے بعد	۳۳۲
	حصہ سوئم	
۱۲۳	ہمارے بچپن اور جوانی کے عہد میں ضروریات زندگی کے نرخ	۳۳۹
۱۲۴	ہمارے متعلق دوسرے ممالک اور ان کے تاجدار	۳۴۳
۱۲۵	ہمسایہ ریاستیں اور ان کے حکمران	۳۴۸
	حصہ چہارم - بابائے سوات کردار کے آئینے میں	
۱۲۶	حکمرانی سے فارغ ہو کر	۳۵۵
۱۲۷	روزمرہ پروگرام	۳۵۹
۱۲۸	پاکستان کے لئے دعائیں	۳۶۳
۱۲۹	دنیاوی دھندے	۳۶۳
۱۳۰	شکار	۳۶۴
۱۳۱	سواتِ کی تعمیرِ نو میں حصہ	۳۶۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۳۳	دودش	۳۶۸
۱۳۴	شب بیداری	۳۷۴
۱۳۴	اوصاف، اخلاق وعادات	۳۷۶
۱۳۵	کردار کا ایک غازی	۳۸۹
۱۳۶	مرد آہن	۳۹۲
۱۳۷	عوام اور حکام کا رابطہ	۴۰۰
۱۳۸	آخری آرام گاہ کی تعمیر	۴۰۰
۱۳۹	ایک عظیم افسادی کارنامہ	۴۰۱
۱۴۰	خاندان شاہی کے دوسرے محترم اراکین	۴۱۱
۱۴۱	ایک پیکر وفا	۴۱۳
۱۴۲	مخلص قیادت	۴۱۴
	حصہ پنجم۔ "مینو سواد"	
۱۴۳	صحت افزا مقامات	۴۱۹
۱۴۴	قابل دید عمارات	۴۲۱
۱۴۵	رقبہ پیداوار	۴۲۲
۱۴۶	مشہور پہاڑ	۴۲۳
۱۴۷	دو جھیلیں	۴۲۴
۱۴۸	مذہب	۴۲۴
۱۴۹	ریاست کے عوام	۴۲۵
۱۵۰	نئے انکشافات	۴۲۶
۱۵۱	ہم اور ہمارا ماحول حرف آخر	۴۳۱

دیباچہ

مملکتِ خداداد پاکستان کے شمال مغربی سرحد پر بلند و بالا پہاڑیوں کے درمیان گھری ہوئی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس میں میدانی علاقہ کم اور پہاڑی زیادہ ہے اسی ریاست کو ریاست سوات اور ریاست یوسف زئی کہتے ہیں۔ یوں تو قدرت نے بھی اس خطۂ ارضی کے تخلیق میں فیاضی سے کام لیتے ہوئے وادیٔ سوات وہ شادابی اور رنگینی عطا کی ہے کہ اس مختصر سے خوشگوار علاقے کو اگر قدرت کا ایک شاہکار کہا جائے تو بجا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وادی سوات قدرتی رعنائی۔ دلچسپ اور دلفریب مناظر کا ایک مرقع ہے۔ لیکن چالیس سال پیشتر تو اس رنگین ماحول کی حیثیت ایک گم گشتہ جنت کی تھی۔ انسان نے ہی وحشت اور بربریت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے بداخلاق سے اس خوبصورت وطن کو ظلم و تشدد کا مسکن بنایا تھا۔ رنگین آبشاروں اور دلنواز مناظر کے اس دیس کو جب فولادی مومن کی قیادت میسر آئی۔ تب انسانی جد و جہد اور تعمیر نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وادیٔ سوات کی قدرتی رعنائی اور حسن۔ انسانی خلوص اور تعمیر کی محتاج تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا جانے کہ اس کا کیا حشر ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں اور بالخصوص ہمارے ماحول میں باتیں بنانے والے بہت زیادہ ہیں۔ اور کام کرنے والے خال خال۔ ایک تعمیری انسان اپنا خون پسینہ ایک کر کے کوئی کام کر لیتا ہے۔ دوسرا تماشائی ہوتا ہے جھٹ کہہ دیتا ہے کہ اس میں تو یہ نقص ہے وہ نقص ہے وغیرہ نکتہ چینی سے آسان

کام دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ خود سرانہ اور غیر منظم زندگی میں انسان کی اخلاقی حالت کچھ ایسی ہو جاتی ہے۔ کہ بسا اوقات اپنے اخلاقی گراوٹ کے ساتھ اپنے مسکونہ خطۂ ارضی کے قدرتی حسن کو بھی داغدار کر دیتا ہے — تو یہی حالت حکومت بننے سے پہلے سوات کی بھی تھی۔ سرحدی ریاستوں میں سوات نسبتاً ایک کمسن ریاست ہے۔ لیکن فی زمانہ یہ کمسن ریاست ہی ہر لحاظ سے دوسری ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ممتاز ہے۔ نہ صرف یہ کہ ریاستوں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اپنے سادہ مختصر قسم کے اسلامی کامیاب طرزِ حکومت۔ امن و امان۔ عدل و انصاف کے لئے تو دنیا میں مشہور ہے۔ گذشتہ دس سال سے تو سوات کی شہرت اور نیک نامی عالمگیر صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چالیس سال پہلے سوات کے لوگوں نے باوجود ہر نادانی کے انتخاب امیر کے سلسلے میں نہایت دانائی اور دانشمندی سے کام لیا تھا۔ سوات کی شہرت نیک نامی اور موجودہ ترقی یافتہ حالت اس کی شاہد ہے کہ کسی خطۂ ارضی میں بسنے والوں کی خوشحالی اور ترقی کا دارومدار صحیح قسم کی مخلصانہ قیادت پر منحصر ہوتا ہے۔ سستی قسم کی نعرہ بازی سیاسی ہنگامے، اور پارٹی بازیاں۔ کم از کم اپنے خیال میں تو قطعاً مفید ثابت نہیں ہوئیں۔ ریاست سوات کی قیادت مخلصانہ تعمیری جدوجہد کے سلسلے میں دوست اور دشمن دونوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے اور اس لحاظ سے یہ ریاست نہ صرف پٹھان قوم بلکہ ملت اسلامیہ کے لئے باعث فخر و مسرت ہے کہ اس ریاست کے قوانین۔ عدالتی نظام۔ ایڈمنسٹریشن کے طور طریقے۔ سادہ اور مختصر ہونے کے باوجود کامیاب اور مفید ثابت ہو چکے ہیں۔ یہاں کا طرزِ حکومت اور طریق کار دفتری تنظیم۔ اس ریاست کے بانی کی خداداد صلاحیتوں اور فطری ذہانت کا نتیجہ ہے۔ اس ریاست کے ابتدائی ایام اور تشکیل حکومت کے سلسلے میں کسی تقلید یا نقل کی ضرورت محسوس

نہیں ہوئی ہے۔

ریاست سوات کی حیثیت دوسری ریاستوں سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک قومی ریاست ہے۔ یہ ریاست انگریزوں کی وفاداری یا تعاون کے سلسلے میں نہیں بنی بلکہ انگریزوں نے اس کی تعمیر کی راہ میں ہر قسم کے روڑے اٹکائے تھے۔ لیکن خدائی امداد کے سہارے یہ ریاست آخرکار معرض وجود میں آ ہی گئی۔

اس ریاست کے قوانین اور حکومتی نظام کو اس ریاست کے لاکھوں عوام کی سرفروشانہ حمایت اور تائید حاصل ہے بلکہ یہاں کا حکومتی نظام ریاست کے چھ لاکھ باشندوں کی خواہشات اور اُمنگوں کا مظہر ہے۔ اس کے قوانین یہاں کے لوگوں نے خود بنائے ہیں۔ حکومت کے ہر شعبے کی تشکیل میں یہاں کے مخصوص حالات اور عوام کے فائدے کو پیش نظر رکھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں حصولِ انصاف میں عوام کو کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ اس لئے یہاں کے لاکھوں عوام کی قدرتی طور پر یہ خواہش ہے کہ

ان کی موجودہ طرزِ حکومت برقرار رہے جس نے نہایت

قلیل عرصے میں ان لوگوں کو راحت اور مسرت سے ہمکنار

کیا ہے۔ سرحدی اور قبائلی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے بہادر اور جیالے لوگوں کی یہ بھی خواہش ہے کہ بیسویں صدی کے سائنسی علوم سے اس طریقے سے استفادہ کیا جائے کہ یہ لوگ عہدِ حاضرہ کے تقاضوں سے بھی عہدہ برا ہو سکیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی تہذیب۔ سادگی، حریت پسندانہ۔ قبائلی روح کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔

وہ عظیم فولادی انسان جو کہ اس ریاست کا بانی ہے اور جس کی عظمت اور مومنانہ کردار اس خطۂ زمین کے ترقی اور رنگینی کے باعث ہیں۔ عوام الناس میں بادشاہ صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ بادشاہ صاحب نہ صرف یہ کہ اس ریاست کے بانی اور حکمران

اوّل ہیں بلکہ صاحب سوات کے جانشین بھی ہیں۔ صاحب سوات کے گدی نشین کی حیثیت سے بادشاہ صاحب کی ذات لاکھوں پٹھانوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز ہے،

ریاست سوات کا مرکزی شہر مینگورہ ہے۔ مینگورہ شہر کی ترقی، وسعت اور خوبصورتی۔ عہدِ جہانزیبی کی مرہون منت ہے۔ اس مختصر سے پہاڑی ماحول میں مینگورہ ہر لحاظ سے ایک قابل صفت ابھرتا ہوا شہر ہے۔ مینگورہ کے خوبصورت بازار پر سے تقریباً ہر روز شام کے پانچ بجے ایک خوبصورت سی خاکی رنگ کی بس لاری گذرتی ہے۔ اسی بس کی اگلی سیٹ کر ایک سفید ریش بوڑھا آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے اپنے مخصوص احباب اور ملازموں کے ساتھ بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک دلفریب قسم کی فاتحانہ مسکراہٹ اس کے نورانی اور باوقار چہرے پر کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعینہٖ ایسی رنگین مسکراہٹ جو کسی عظیم فن کار کے چہرے پر اس وقت نظر آتی ہے جب کہ وہ اپنے "شاہکار" کو مکمل اور کامیاب دیکھتا ہے۔ پچھتر سال کا یہ سفید ریش مگر جوان ہمت اور عالی وقار انسان ریاست سوات کا بانی ہے جسے دیکھ کر بے اختیار چہروں پر رونق آجاتی ہے۔ یہی وہ عظیم انسان ہے جسے ہم صحیح معنوں میں ایک آہنی انسان کہہ سکتے ہیں۔ اس بڑھاپے کے عالم میں بھی بادشاہ صاحب کی جوان ہمتی اور چستی کا امتحان لینا مقصود ہو تو پھر کسی دن پہاڑ میں جوانوں کے ساتھ انہیں شکار کھیلتے ہوئے دیکھ لیجئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بانیٔ ریاست سوات بادشاہ صاحب کا شمار دنیا کے ان نامور اور قابل صفت انسانوں میں ہے جن کی ذات اور جن کا مضبوط کردار قوموں کی تقدیر بدلانے کا باعث ہوتا ہے۔

حکیم مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں مردِ مومن کے کردار کا جو خاکہ پیش کیا ہے۔ عہدِ حاضرہ میں بادشاہ صاحب کی ہستی اس کا ایک حقیقی نمونہ ہے۔ ریاست سوات کے متعلق اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اردو زبان میں اس قسم کی کوئی تاریخی

سے پڑھ سکے۔ مشکل اور دقیق الفاظ استعمال کرنے کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوتا ہے کہ بعض لوگ خواہ مخواہ اپنی علمیت اور قابلیت کا غلط مظاہرہ کرتے ہیں۔

(۴) جس زبان میں کتاب لکھی جائے زبان پاک اور خالص ہونی چاہیئے مجھے یہ طریقہ بھی پسند نہیں ہے کہ اردو کی تحریر میں پشتو یا عربی کے الفاظ داخل ہوں۔ لہٰذا یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ زبان خالص ہو۔

چنانچہ انہی مذکورہ بالا شرائط پر کاربند رہ کر میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ میں کوئی بہت مشہور مصنف یا عالم نہیں ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی مجھے یقین ہے کہ سرزمین سوات کی قدیمی عظمت۔ تاریخی حالات سے لوگوں کی دلچسپی اور شوق۔ بانی ریاست سوات کی خودبیان سرگزشت۔ یوسف زئی پٹھانوں کی تاریخی عظمت۔ قابل فخر روایات اور شجاعانہ جدوجہد کی کہانی۔ ان تمام امورات میں اتنی کشش اور خوبصورتی ضرور ہے کہ یہ میری علمی کمزوریوں اور فنی خامیوں کی پردہ پوشی کر سکیں گی اور اگر ان تمام کے باوجود قارئین کو کچھ خامی نظر آئے تو معذرت خواہ ہوں۔

صاحب سوات اور ان کے خاندان کے ہر فرد کے ساتھ میری والہانہ عقیدت اور محبت کے باوجود میں نے حسب الحکم بادشاہ صاحب ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں ایک لفظ بھی مبالغے کا نہ آجائے۔ لہٰذا فنی لحاظ سے جو کچھ بھی ہو لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ مجموعہ ایک مجموعہ حقائق ضرور ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ اسے بانی ریاست سوات کی نہ صرف تائید حاصل ہے بلکہ اس کا حصہ دوئم ان کی سوانح عمری خود ان ہی کی زبان ہے۔ اس لئے

اس کتاب کی ترتیب و تصنیف میں ایک قسم کے شریک بھی ہیں۔

اس کتاب کے حصے ہیں ۔ حصہ اوّل اور حصہ چہارم و خصب نجم راقم الحروف کے قلمی اور دماغی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اور حصہ دوئم و سوئم بادشاہ صاحب کی طرف سے ہے۔ جسے اردو کا جامہ میں نے پہنایا ہے اور پھر اوّل سے اخیر تک جو کچھ لکھا گیا ہے بادشاہ صاحب کو سنایا گیا ہے اور ان سے واقعات کی اصلاح لی گئی ہے۔ بادشاہ صاحب کی قوتِ حافظہ بھی ضرب المثل ہے۔ موصوف کو نہ صرف ریاست سوات اور پٹھان قوم کی مسلسل تاریخ ہے بلکہ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ بھی یاد ہے۔

بادشاہ صاحب کو پاکستان کے ساتھ شدید محبت ہے۔ تعمیرِ پاکستان کی جدوجہد میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ اس وقت بھی پاکستان ہی بادشاہ صاحب کی نیک دعاؤں کا مرکز ہے۔ سوات کو پاکستان کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں۔

اب اس کے بعد اس خوب صورت اور جنت نظیر دیس کی تاریخی داستان شروع ہو جاتی ہے۔ یوسف زئی قبیلے کے جیالے پٹھانوں کا وطن۔ ریاست سوات جسے موجودہ وقت میں ایک ایشیائی سوئٹزرلینڈ بنانے کی ہر ممکن اور مخلصانہ سعی جاری ہے۔ وہ خوشگوار سرزمین جو کم از کم اس وقت تک تو مغربی سیاسیات کے تباہ کن اثرات سے بالکل محفوظ ہے۔ فرقہ بندی کے زہریلے اثرات سے بھی پاک ہے۔ اور جس میں اسلامی تہذیب۔ افغانی روایات، سادہ تمدن اور پشتو زبان اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ چھوٹی سی ریاست کس طرح معرضِ وجود میں آئی۔ اس کی کہانی خود اس ریاست کے بانی

کی زبانی سنئے فقط ؎

اُولوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں

سمندر پھاڑتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

محمد آصف خان

بانئے ریاست سوات میاں گل ۔ گل شہزادہ
عبدالودودخان بادشاہ صاحب اولین حکمران سوات
۱۹۱۶ء تا ۱۲ دسمبر ۱۹۴۹ء

حصّۂ اوّل

شاہراہِ حیات

یہ آدمی کی گزرگاہ یہ شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
جبیں پہ کاتبِ تاریخ کی جلی تقدیر
گلے سے سینکڑوں نقشِ قدم لگائے ہوئے
گزرتے وقت کے گرد و غبار کے نیچے
حسین جسم کی تابندگی چھپائے ہوئے
گذشتہ دور کی تہذیب کے منازل کو
جواں ماں کی طرح گود میں سلائے ہوئے
یہ آدمی کی گذرگاہ یہ شاہراہ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے

جعفری

ریاستِ سوات و متعلقات رقبہ اور آبادی

ریاستِ سوات کی آبادی چھ لاکھ ہے۔ کل رقبہ چار ہزار مربع میل ہے۔ اس ریاست کے شمال میں ریاست چترال۔ جنوب میں ضلع مردان۔ مغرب میں ریاستِ دیر۔ اور مشرق میں ریاست امب اور دریائے سندھ بہتا ہے۔ دریائے سوات ۸۴ میل تک ریاست کے وسط سے گذرتا ہے۔ دریائے سوات کے دونوں طرف زرخیز زمینوں میں چاول کی کاشت کی جاتی ہے۔

قدرتی حصّے تقسیم

یہ ریاست مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم ہے

(۱) وادیٔ سوات کا خوبصورت اور خوشگوار علاقہ

(۲) وادیٔ کانا۔ عزر بند جو کہ خشک پہاڑی علاقہ ہے

(۳) کوہستان۔ علاقہ کوہستان جو پہاڑی علاقہ ہے

(۴) علاقہ بونیر۔ بونیر بھی خشک علاقہ ہے۔

سوات ایک قدیمی علاقہ ہے

ریاست سوات کا علاقہ جو موجودہ وقت میں نہ صرف قدرتی مناظر کے رنگینی اور شادابی کے لئے مشہور ہے بلکہ بہترین طرزِ حکومت اور اعلیٰ نظم و نسق کے لئے بھی کافی شہرت

حاصل کر چکا ہے۔ زمانہ قبل از مسیح سے لے کر موجودہ زمانے تک مسلسل اہمیت۔ اسے ہر دور میں حاصل رہی ہے۔ عہد قدیم کی یادگاریں کھنڈرات کی صورت میں اپنے دامنوں میں اس خطہ ارضی کے پُر شکوہ ماضی کی داستانیں لئے ہوئے سنا رہی ہیں ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

غالبؔ

اسلام سے پہلے سوات کے حالات

سوات کی تاریخ یوں تو بہت پرانی ہے لیکن قدیمی دستاویزات سے سوات کے جو حالات معلوم ہو چکے ہیں ۳۲۶ ق۔ مسیح سے شروع ہوتے ہیں۔ جب کہ سکندر اعظم یونان سے تسخیر عالم کے ارادے دل میں لے کر نکلا۔ اس زمانے میں سوات آباد تھا۔ سوات میں آباد لوگ بدھ مت کے پیرو تھے۔ سوات کے بدھ حکمران نے ایک روایت کے مطابق تیس ہزار فوج کے ساتھ سکندر اعظم کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا گیا۔

سوات سکندر یونانی کی گزرگاہ

یہیں سے گزرے ہیں تیمورؔ نادرؔ و چنگیز
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے

۳۲۶ سال قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ سکندر اعظم ایران کو فتح کر کے کابل کے راستے ہندوستان کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ چنانچہ کابل کے علاقہ کونڑ سے ہوتا ہوا وادئ سوات میں داخل ہوا۔ وادئ سوات میں دریائے سوات کے پار شمالی کنارے پر آباد ایک گاؤں "بانڈئی" کے قریب دریائے سوات کو عبور کر کے دریا کے جنوبی کنارے

پر پہاڑ کے دامن میں آباد قصبہ منگلور کے قریب ایک میدان میں بمعہ اپنی فوج کے مقیم ہو گیا۔ اور پھر یہاں سے روانہ ہو کر دشوار گزار پہاڑوں اور کٹھن راہوں کو عبور کرتا ہوا دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب میں داخل ہوا۔ واضح رہے کہ سکندر اعظم کے زمانے سے متعلق یادگاری چیزیں انگریزی حکومت کے ماہرین آثار قدیمہ سوات سے برآمد کر کے لے گئے ہیں۔ سکندر کے زمانے میں سوات کا راجہ آرسن تھا جسے سکندر نے مغلوب کیا تھا۔

سکندر اعظم کے بعد

۳۰۴ ق م قبل مسیح جب سکندر اعظم کے بعد اس کے مشہور جرنیل سلیوکس نے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کیا تو سوات۔ بونیر اور سرحد کے یہ علاقے راجہ چندر گپت کو بخش دیئے چندر گپت نے سوات کے لوگوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی تھی۔ ان لوگوں کے معاملات میں بہت کم دخل دیتا تھا۔

راجہ کنشک

۴۵ء میں جب کہ پشاور راجہ کنشک کا دارالحکومت تھا تو سوات اور بونیر کے علاقے راجہ کنشک کے قلمرو میں شامل تھے۔ یہاں کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے حکمرانی کے دھندوں سے اُکتا کر کبھی کبھی کنشک آرام کے لئے سوات کی خاموش فضاؤں میں آجاتا اور پھر یہاں کچھ عرصہ رہ کر واپس راجدھانی کو چلا جاتا۔ راجہ کنشک کے دورِ حکومت میں سوات کا علاقہ بدھ مذہب کے ایک متبرک مقام کی حیثیت سے مشہور تھا۔ یہاں کے لوگ فارغ البال اور آسودہ حال تھے۔ سوات میں سینکڑوں خانقاہیں تھیں۔ دور دراز کے علاقوں سے لوگ ان خانقاہوں میں عبادت کرنے کے لئے آتے تھے

رام راجہ

راجہ کنشک کے بعد سوات کے بدھ راجاؤں میں "رام راجہ" ایک مشہور راجہ گزرا ہے۔ رام راجہ کا پایۂ تخت خدوخیل تھا۔ خدوخیل کے علاقے میں رام کنڈ نامی ایک تالاب رام راجہ کی یادگار اب بھی موجود ہے۔

راجہ وراٹھ اور بیٹی راجہ

رام راجہ کی وفات کے بعد "وراٹھ" سوات کے بدھ حکمرانوں میں ایک قابل ذکر حکمران تھا۔ ۲۰۰ء میں سوات اور بونیر کے علاقے "راجہ وراٹھ" کے قلمرو میں شامل تھے۔ وراٹھ کا دارالحکومت تخت بھائی تھا۔ لیکن راجہ کنشک کی طرح "وراٹھ" بھی سال میں کچھ عرصہ کے لئے سوات آتا تھا۔ اور سوات کی مرکزی خانقاہ میں راہبوں کے ساتھ عبادت میں شامل ہوتا تھا۔ راجہ وراٹھ کے بعد راجہ بیٹی سوات کا حکمران بن گیا۔ سوات کے مختلف علاقوں میں بدھ راجاؤں کے عہد حکومت کے جو آثار ملتے ہیں۔ سب کے سب پہاڑوں میں ہیں۔ پہاڑی دروں کے اندر چٹانوں کے اوپر بدھ حکمران محلات اور قلعے تعمیر کیا کرتے تھے۔ چٹانوں پر بنائے ہوئے قلعوں کی تسخیر بہت مشکل ہوا کرتی تھی۔ سوات کے مختلف علاقوں میں بعض میدانی مقامات سے بھی بدھ کے آثار برآمد ہو چکے ہیں۔ قصبہ منگلور کے قریب کھیتوں کے درمیان ایک ڈھیری پر زمانہ بدھ کے کھنڈرات پائے گئے ہیں۔ منگلور کے لوگوں نے کھدائی کر کے اس زمانے کے بنائے ہوئے تراشیدہ پتھر برآمد کئے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو اپنے مکانوں کی تعمیر میں بھی یہی بنے بنائے پتھر استعمال کئے ہیں۔ زمانہ بدھ کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سنگتراشی کا فن انتہائی عروج پر تھا۔

بلند چٹانوں کو بعض مقامات پر تراش کر اس میں مختلف قسم کے بُت بنائے گئے ہیں ان پر فن کاروں نے بعض ایسے دشوار گزار مقامات پر اپنے فن کے تراشیدہ نمونے بنائے ہیں کہ وہاں تک ہر انسان کا پہنچنا مشکل ہے۔ تاہم چست و چالاک چرواہوں کی دستبرد سے سنگتراشی کے یہ نادر شاہکار محفوظ نہ رہ سکے۔ سوات کے پہاڑوں کا پتھر قدرتی طور سے بھی تراش کے لئے بہت موزوں ثابت ہوتا ہے۔ مینگورہ کے قریب "کاٹینلی" گاؤں ہے۔ اسی گاؤں کے متصل پہاڑ کے دامن میں ایک قدیمی قبرستان برآمد ہو چکا ہے۔ اس قبرستان کی قبروں میں مردوں کی ہڈیوں کے ساتھ ساتھ "پانی" کا مٹی کا بنا ہوا ایک ایک گھڑا بھی رکھا ہوا ساتھ دیکھا گیا ہے، مسلمانوں میں تو مُردوں کے ساتھ قبر میں گھڑا رکھنے کا کوئی رواج نہ اب ہے اور نہ پہلے تھا۔ اِس لئے یہی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ بھی زمانہ بُدھ کی یادگار ہے۔ اور شاید ان لوگوں میں مُردوں کے ساتھ پانی یا کسی اور چیز کا بھرا ہوا "گھڑا" رکھنے کا بھی رواج ہو۔ خیر جو کچھ بھی ہو لیکن زمانہ بُدھ کی عجیب یادگاریں بعض مقامات پر پائی جاتی ہیں۔

راجہ ہوڈی

راجہ بیٹی کے بعد سوات کے بُدھ حکمرانوں میں پھر ہوڈی ایک مشہور راجہ گزرا ہے مینگورہ اور مردان روڈ پر مینگورہ سے چھ میل کے فاصلے پر جانب مغرب برلبِ سڑک "ہوڈی گرام" ایک گاؤں ہے جو کہ راجہ ہوڈی کے نام پر آباد ہے اور ہوڈی کی یادگاروں میں سے ہے۔ مسلمان حکمرانوں اور مسلمان قوم کی عالی ظرفی ہے کہ عہد قدیم کے ان یادگاروں کے نام تبدیل نہیں کئے ہیں۔ اس طرح کے ناموں کے دوسرے گاؤں بھی سوات میں موجود ہیں۔ مثلاً "دنگرام" "پنجی گرام" وغیرہ۔

"راجہ گیرا" سوات کا آخری بُدھ حکمران

بُدھ حکمرانوں میں سوات کا آخری بُدھ حکمران راجہ گیرا تھا۔ گیارہویں صدی کے آغاز میں راجہ گیرا کی حکومت سوات میں قائم تھی۔ 'ہوڈی گرام' کے قریب ایک پہاڑ کی چوٹی پر راجہ "گیرا" کا فوجی مستقر تھا جس کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں۔

سوات میں چینی سیّاحوں کی آمد

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ بُدھ حکمرانوں کے عہد میں سوات کو ایک مقدس اور متبرک مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ ایک خاموش اور پُرسکون وادی تھی۔

دریائے سوات جو اس زمانے میں دریائے "سوسٹو" کے نام سے مشہور تھا کے کنارے سینکڑوں خانقاہیں آباد تھیں۔ بُدھ کے ایک متبرک مقام کی حیثیت سے سوات کی شہرت چین، جاپان اور تبت کے ملکوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ چین اور دوسرے علاقوں سے سیّاح اور زائرین سوات آتے تھے۔ چین کے جو مشہور سیّاح سوات میں آئے تھے ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:۔

- ۴۰۳ء۔ فاھین، چین کا ایک مشہور سیّاح کوہ ہندوکش سے ہوتا ہوا سوات پہنچا اور پھر کافی عرصہ سوات میں رہا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں سوات اور بونیر وغیرہ خطوں کے باشندوں کا مذہب بُدھ لکھا ہے۔
- ۵۱۹ء میں ایک دوسرا چینی سیّاح "سنگ یون" کافرستان سے ہوتا ہوا سوات کے خطے میں وارد ہوا۔ سنگ یون نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ سوات میں بُدھ مذہب عروج پر ہے۔ رات کے وقت خانقاہوں میں اتنی کثرت سے گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں کہ تمام فضا گونج اٹھتی ہے۔ دریائے "سوسٹو" کے کنارے بہت

سی خانقاہیں آباد ہیں۔ سوات سرسبز اور شاداب علاقہ ہے۔ یہاں کے باشندوں کا گذارہ کھیتی باڑی پر ہے۔

سنہ ۶۳۰ء میں چین کا مشہور سیاح "ہیون سانگ" کابل سے ہوتا ہوا سوات پہنچا۔ ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں سوات کے باشندوں کے مذہب کے بارے میں لکھا ہے کہ سوات میں بدھ مذہب زوال پر ہے۔ دریائے سوات کے کنارے آباد خانقاہیں اکثر ویران ہو چکی ہیں۔ ہیون سانگ نے سوات کے باشندوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں کے باشندے خوش اخلاق اور محنتی ہیں۔

آخری چینی سیاح

سنہ ۷۵۲ء چین کا آخری سیاح "وکنگ" تھا جو سنہ ۷۵۲ء میں سوات آیا اور اس خانقاہ میں راہب بن گیا۔ چونکہ چین کے وسیع ملک میں بدھ مذہب عروج پر تھا اس لئے چین کے سیاحوں کو سوات کے ساتھ بھی دلچسپی تھی۔

وادئ سوات میں دینِ اسلام کا داخلہ

خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے عہد میں اسلامی لشکر نے خراسان کو فتح کر لیا تو خراسان کا علاقہ نورِ اسلامی سے منور ہو گیا اور پھر رفتہ رفتہ تمام افغانستان میں اسلام پھیلتا گیا۔ حتیٰ کہ عباسی دورِ خلافت میں تمام افغانستان دین اسلام کی روشنی سے منور ہو گیا۔ لیکن چترال، دیر اور سوات کے علاقے ہنوز اس سعادت سے محروم تھے حتیٰ کہ محمود غزنوی کا دور آ گیا۔

سلطان محمود غزنوی کا حملہ سوات پر

بغرض اشاعتِ اسلام

گیارہویں صدی کے آغاز میں سوات کا آخری بدھ حکمران گیرا تھا۔ مینگورہ سے مردان جاتے ہوئے جی۔ ٹی۔ روڈ پر آباد گاؤں ہوڈی گرام کے متصل ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر بدھ حکمران گیرا نے چھاؤنی بنائی تھی۔ اس پہاڑی مستقر میں راجہ گیرا اپنی فوج سمیت مقیم تھا۔ اس چھاؤنی کو فتح کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لئے کہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے راستے سب ہی دشوار گزار تھے اور ایسے تھے کہ ہر طرف سے چڑھائی کرنے والے گیرا کی فوجوں کی زد میں آتے تھے۔

سلطان محمود غزنوی نے باجوڑ کے راستے سوات پر حملہ کیا۔ سلطان باجوڑ کے راستے علاقہ دیر پر سے ہوتا ہوا سوات کے علاقہ شموزئی میں بمعہ اپنی فوج کے داخل ہوا۔ علاقہ شموزئی میں مقیم ہو کر محمود صاحب نے اپنی فوج دو حصوں میں تقسیم کی۔ چنانچہ ایک حصہ فوج کو خواجہ ایاز کی تحویل میں دے کر انہیں دریائے سوات کے شمالی کنارے پر آباد علاقوں مثلاً نیک پی خیل۔ شموزئی۔ شامیزئی وغیرہ فتح کرنے اور نیز ان علاقوں میں دین اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے روانہ کر دیا اور دوسرے حصہ فوج کو خود سلطان محمود اپنے ساتھ لیکر دریائے سوات کو عبور کر کے جنوبی علاقے میں داخل ہوا۔ محمود صاحب فاتحانہ شان سے بڑھتے ہوئے ہوڈی گرام پہنچ گئے نوجوان سالار پیر خوشحال کو گیرا کے پہاڑی مستقر فتح کرنے پر مامور کیا۔ کہا جاتا ہے کہ گیرا کی پہاڑی چھاؤنی کو فتح کرنے میں غازی لشکر کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا

پڑا۔ گیرا تک پہاڑی مستقر تک پانی پہنچانے کے لئے زمین دوز پائپ لائن بچھائی تھی۔ چنانچہ کئی دن کے بعد غازی سالار پیر خوشحال کو اس لائن کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ پیر خوشحال نے گیرا کی فوج تک آب رسانی کا سلسلہ منقطع کر دیا تو گیرا کے فوجی تنگ آ گئے۔ ایسے میں پیر خوشحال نے ایک زوردار حملہ کر کے غازی لشکر کو پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا دیا۔ گیرا کو شکست دی گئی۔ لیکن خود غازیوں کے کمانڈر پیر خوشحال بھی اس مقابلے میں شہید ہو گئے۔ گیرا کی اس لڑائی میں ایک روایت کے مطابق فاتح لشکر کو بھی کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن گیرا کی شکست کے بعد سوات سے بدھ اقتدار رخصت ہو گیا۔ اسی پہاڑ کے دامن میں پیر خوشحال کی زیارت آج بھی مرجع خلائق عام ہے اور سوات میں زیارتِ غازی بابا" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح دوسرے شہید مجاہدین کی قبریں بھی موجود ہیں۔

شکست کے بعد

راجہ گیرا کی شکست اور قتل ہونے کے بعد سوات کے بدھ باشندے جنہوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ بھاگ کر کوہستانوں میں چلے گئے۔ محمود غزنوی کے ہمراہ اس جہاد میں پٹھانوں کے دلازاک قبیلے کا سردار یکلے اپنے قبیلے سمیت شامل تھا۔ ان کے علاوہ سواتی پٹھان بھی شامل تھے۔ لہٰذا محمود صاحب نے سوات میں سواتی اور دلازاک پٹھانوں کو ہی آباد کر دیا۔ اور یہ علاقہ پٹھانوں کی تحویل میں دے دیا۔ اس طرح سوات کی خوبصورت سرزمین دین اسلام کی ضیا پاشیوں سے منور ہو گئی ۱۴۰۰ھ تک اس علاقے میں دلازاک اور سواتی آباد رہے لیکن ۸۰۲ھ کے بعد سواتیوں اور دلازاک میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ آخر کار سوات کے علاقے سے سواتیوں نے دلازاک قبیلے کو بے دخل کر دیا۔ دلازاک پٹھان سوات سے نکلے

توضلع مردان اور پشاور کے علاقوں میں جاکر آباد ہو گئے

یوسف زئی پٹھان اور ان کا شجرۂ نسب

پٹھان قوم جو کہ مختلف قبیلوں میں تقسیم ہے۔ علاقہ سوات میں آباد پٹھان قبیلے کو یوسف زئی کہتے ہیں۔ یہ ایک محترم اور طاقت ور قبیلہ ہے۔ علاقہ سوات میں یہ لوگ چار سو سال سے آباد ہیں۔ یہ علاقہ انہوں نے بزور شمشیر حاصل کیا ہے۔ یوسف زئی کا اصلی تعلق " گارد اور نوشکی سے ہے۔ علاقہ سیستان میں دشت لوط کے کنارے نوشکی کا علاقہ ہے۔ یوسف زئی قبیلہ پٹھانوں کی ایک قوم خشتی کی ایک شاخ ہے۔ خشتی کی تین مشہور شاخیں گگیانٹری، ترکلانی اور محمد زئی بھی ہیں، یوسف زئی کا مفصل سلسلۂ نسب درج ذیل ہے:۔

قیس عبدالرشید پٹھانوں کا مورث اعلےٰ

مشہور صحابی اور اسلام کے نامور سپہ سالار حضرت خالدؓ بن ولید[1] بھی نسلاً افغان قبیلے سے تھے۔ خالدؓ بن ولید جب مسلمان ہوئے تو اس زمانے میں افغان کوہستان غور میں آباد تھے۔ حضرت خالدؓ نے مسلمان ہونے کے بعد اپنے قومی بھائیوں افغانوں کو بھی اسلام کی دعوت پہنچائی۔ افغان قوم میں ابتدا ہی سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ جب بھی کوئی قومی یا مذہبی معاملہ پیش آتا ہے تو قومی جرگہ طلب کرتے ہیں اور پھر جرگے میں کوئی متفقہ فیصلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خالدؓ کا پیغام جب افغانوں کو ملا تو قومی جرگے میں اس پر بحث ہوئی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ ایک نمائندہ وفد " قیس " کی سرکردگی میں مدینہ منورہ جائے اور دین اسلام سے متعلق خود رسول کریمؐ سے مل کر معلومات حاصل کریں۔ اس قرارداد

---

[1] پٹھانوں کی تاریخ " مرتبہ قاضی عطاء اللہ خان صاحب مرحوم صفحہ ۱۰ جلد اوّل

کے مطابق قیسؓ کی سرداری میں معزز افغانوں کا ایک وفد مدینے پہنچ گیا۔ آنحضور صلعم سے ملنے کے بعد قیس معہ اپنے رفیقوں کے مسلمان ہوگئے۔ سرورِ کونینؐ نے خوش ہوکر "قیس" کو "عبدالرشید" کا خطاب عطا فرمایا۔ اور ساتھ ہی اسکے اعزازی خطاب سے بھی سرفراز فرمایا۔ یاد رہے کہ ملکؔ وہی قدیمی خطاب ہے جو کہ بنی اسرائیل نے اپنے اولین بادشاہ "طالوت" کو دیا تھا۔ افغانوں کا یہ وفد کچھ عرصہ تو مدینے میں رہا۔ حضرت خالدؓ نے اس دوران میں اپنی لڑکی کی شادی بھی قیس عبدالرشید کے ساتھ کردی۔ قیس اپنے ہمراہیوں سمیت جب واپس اپنے وطن کوہستان غور کے لئے روانہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعے پر بھی قیس کو "ھذا ابطان دین" کہہ کر مخاطب فرمایا۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ یہی "بطان" لفظ ہی بگڑ کر "پٹھان" بن گیا۔ واللہ اعلم

اب یہ امر کہ پٹھان کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے اور یا آرین نسل سے جداگانہ بحث ہے۔ ہمارا تعلق تو یوسف زئی قبیلے کے سلسلہ نسب سے ہے جو کہ بہرصورت پٹھان قوم کا ہی ایک محترم قبیلہ ہے اور پٹھان قوم کا سلسلہ نسب چودہ سو سال سے کم و بیش قیس عبدالرشید سے شروع ہوتا ہے۔ کوہستان غور کا علاقہ ہی پٹھانوں کا قدیمی مسکن ہے۔ پٹھان اسرائیلی ہیں یا آرین۔ اس بحث میں ہم پڑنا نہیں چاہتے۔ ؎

"چنیں شدیم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد"

اقبالؔ

قیس عبدالرشید

قیس کے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام قرشبونؔ تھا۔ دوسرے کا نام 'شرجنونؔ' اور تیسرے کا نام 'غرغشتؔ' تھا۔ چنانچہ اسی اول الذکر قرشبونؔ کی اولاد نے بعد میں یوسف زئی، محمد زئی، خلیل، مہمند، داؤد زئی، گگیانی، قبیلوں کی

صورت اختیار کر لی۔ اب یوسف زئی کی تفصیل یوں ہے کہ قیس کا بیٹا قرشبون اور قرشبون کا ایک بیٹا کند اور اسی کند کا ایک فرزند خشتی تھا۔ خشتی کے تین بیٹے مندی، مکدر اور ترک تھے۔ اول الذکر مندی کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ جن میں ایک کا نام یوسف دوسرے کا نام عمر تھا۔ یوسف کی اولاد بڑھتی گئی۔ جس نے یوسف زئی قبیلے کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور عمر کی اولاد منڈنڑ مشہور ہوئی۔ چچا زاد بھائیوں کی حیثیت سے یوسف زئی اور منڈنڑ دونوں قبیلے ہر دشمن کے برخلاف دوش بدوش لڑتے ہیں پٹھانوں کے قبائل میں غالباً یوسف زئی کی آبادی زیادہ ہے اور اسی قبیلے کی پشتو دوسرے قبائل کے پشتو کے مقابلے میں زیادہ فصیح ہے۔ یوسف زئی قبیلہ اندرونی طور سے تین شاخوں میں تقسیم ہے۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

(۱) اکوزئی جو کہ وادی سوات میں آباد ہیں

(۲) نولیزئی جو کہ بونیر کے علاقے میں آباد ہیں

(۳) ملیزئی ریاست دیر میں آباد ہیں

منڈنڑ۔ تحصیل مردان۔ تحصیل صوابی اور وادی چملہ میں آباد ہیں۔

یوسف زئی دوسرے علاقوں میں

مذکورہ بالا متصل علاقوں کے علاوہ یوسف زئی قبیلے کے افراد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھی آباد تھے۔ چنانچہ فرخ آباد۔ کرنال۔ بھوپال اور ریاست رام پور میں یوسف زئی بکثرت آباد تھے۔ جن میں خاص طور سے نواب رامپور کا خاندان قابل ذکر ہے روھیل کنڈ اور بریلی میں بھی یوسف زئی کی آبادی تھی۔ ٹونک[1] کا مجاہد اور اولوالعزم نواب امیر خان کا تعلق نسب بھی علاقہ بونیر کے ایک مشہور گاؤں "ایلئی" سے تھا

---

[1] ٹونک کا نواب امیر خاں

یوسف زئی ایک مردم خیز قبیلہ ہے۔

ریاست سوات کا علاقہ اور وجہ تسمیہ

انگریزی اقتدار سے قبل مالاکنڈ ایجنسی کا علاقہ سخاکوٹ تک سوات میں شامل تھا اور اسی سارے علاقے کو سوات کہتے تھے۔ علاقہ ایجنسی پر انگریزی تسلط قائم ہوگیا۔ تو سوات کی سرحد لنڈاکی تک محدود ہوکر رہ گئی۔ اسی مقام پر اب ریاستی حکومت کی کسٹم چوکی ہے اور اسی لنڈاکی سے مدین تک کے خوشگوار اور جنت نظیر وادی کو سوات کہتے ہیں۔ سوات کو سوات کیوں کہتے ہیں۔ اس کے متعلق معقول معلومات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ "سُوَ" "ات" سے سوات بن گیا۔ "سُوَات" کے معنی سورج کی مانند چمکنے والا۔ بعض کہتے ہیں کہ ابتدا میں اس کا نام "سواد" تھا جو کہ بگڑ کر سوات بن گیا۔ یونانی تواریخ میں سوات کو "اساکنوئی" لکھا گیا ہے اور یہ لفظ سنسکرت کے لفظ "آسوا" سے غالباً لیا گیا ہے۔ جس کے معنی شہسواری کے ہیں۔ ایک مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ ہندوستان میں لکھا ہے کہ سلطان محمود کے زمانے میں یعنی کہ گیارہویں صدی عیسوی میں علاقہ سوات کو سوات نہیں کہتے تھے۔ بلکہ سوات اور باجوڑ کے علاقے "قیرات" "ناروین" کے نام سے مشہور تھے۔ محمود غزنوی نے سوات کو فتح کیا تو سوات میں پٹھان قوم کے ایک قبیلے سواتی پٹھانوں کو آباد کیا۔ واضح رہے کہ سواتی نام پٹھانوں کا ایک مختصر قبیلہ ہے۔ جو کہ آج کل دریائے سندھ کے پار "الائی" وغیرہ علاقوں میں آباد ہیں۔ اسی قبیلے کی سکونتی وطن بننے سے اس علاقے کا نام بھی سوات ہوگیا۔ ورنہ گیارہویں صدی سے پہلے اس علاقے کو سوات نہیں کہتے تھے۔ بہرصورت اس ضمن میں مستند معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ ہوسکتا ہے کہ سواتی پٹھانوں کی آبادکاری کے بعد یہ علاقہ

سوات[1] کے نام سے مشہور ہو چکا ہو۔ اندرونِ ریاست موجودہ وقت میں سوات سے مراد تو یہی ہے۔ مدین سے لنڈاکی تک کی خوشگوار وادی ہے۔ ریاست سوات اور متعلقات سے مراد وادی سوات۔ وادی کانا۔ غوربند۔ کوہستان اور بونیر کے تمام خطوں پر مشتمل علاقہ ہے۔ جس کا دارالحکومت سیدو شریف ہے۔

علاقہ سوات پر یوسف زئی کا قبضہ اور کابل سے ہجرت

چودھویں صدی کی ابتدا میں اطراف کابل میں یوسف زئی نے ایک منظم اور طاقت ور قبیلے کی حیثیت اختیار کی۔ مرزا ابو سعید کے فرزند اور شہنشاہ بابر کے بھتیجے مرزا الغ بیگ نے تخت کابل پر قبضہ کرنے کے لئے یوسف زئی قبیلے سے امداد کی درخواست کی چنانچہ یوسف زئی قبیلے کے سرفرشانہ تعاون سے ہی مرزا الغ بیگ کابل کا حکمران بن گیا چونکہ یوسف زئی نے ہی اسے تخت کابل پر بٹھایا تھا۔ لہٰذا دربار کابل میں یوسف زئی کا اثر بہت بڑھ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب اِدھر اُدھر کے غاروں میں چھپے ہوئے بھگوڑے مغل کابل پہنچ گئے۔ اب مغلوں کو مغل دربار میں یوسف زئی پٹھانوں کا اثر و رسوخ ناگوار گزرنے لگا۔ چنانچہ ان مغلوں نے مرزا الغ بیگ حکمران کابل کو بہت جلد یوسف زئی سے برگشتہ خاطر کر دیا۔ الغ بیگ کو کہا گیا کہ تمہاری حکومت تو یوسف زئی کے رحم و کرم پر ہی منحصر ہے لہٰذا اس قبیلے کو ختم کر دو۔ الغ بیگ بھی وہ مائی کا لال تھا کہ ذرہ بھی توقف نہ کی انتہائی ڈھٹائی اور طوطا چشمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے محسنوں کے احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ ان پر فوج کشی کر دی۔ ایک پرامن قبیلے پر بے خبری میں حملہ کرنے کے باوجود الغ بیگ کو شکست ہوئی۔ بدقسمتی سے الغ بیگ کو شکست دینے کے باوجود یوسف زئی نے تخت کابل پر قبضہ نہ کیا۔ الغ بیگ نے محسوس کیا کہ طاقت اور تشدد کے ذریعے یوسف زئی کو کچلنے کا سودا مہنگا

---

[1] ہر نام میں معنویت ڈھونڈنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (محمد آصف)

پڑتا ہے۔ اب اُس نے یہ چال چلی کہ دوبارہ یوسف زئی کے ساتھ صلح کر کے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ یوسف زئی کی آمد و رفت دربار کابل میں پھر سے جاری ہو گئی اب الغ بیگ نے دھوکے سے یوسف زئی کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ایک مقررہ پروگرام کے مطابق مرنا الغ بیگ نے یوسف زئی قبیلے کے تمام سرکردہ اکابرین اور سرداروں کو شاہی محل میں دعوت پر بلایا۔ اور پھر عین دسترخوان پر بیٹھے ہوئے مصروف خوراک تھے۔ الغ بیگ کے آدمی ان پر ٹوٹ پڑے اور سب کو قتل کر دیا خوش قسمتی سے دو سردار ملک احمد اور شیخ ملی بچ گئے۔ جنہوں نے راتوں رات اپنے قبیلے کو اطراف کابل سے نکالا۔ اور ہجرت کی۔ یہ مظلوم اور تباہ حال قبیلہ اپنے سردار ملک احمد کی سرکردگی میں "شلمان" کے راستے پشاور کی طرف روانہ ہوا۔ کچھ عرصہ میں خلیل، مہمند، اور محمد زئی قبیلے بھی آکر ساتھ شامل ہو گئے۔ پشاور اور اطراف پشاور پر اُن ایام میں دلازاک قابض تھے۔ چنانچہ ملک احمد نے ہشت نگر کے علاقے پر قبضہ کر کے محمد زئی کو ہشت نگر میں آباد کر دیا اور خود بمعہ دوسرے قبائل کے آگے بڑھے۔ مختصر یہ کہ چند سالوں کے بعد بیچارے دلازاک پٹھان اٹک سے پار ہو گئے۔ نیکی کا بدلہ برائی تو یوسف زئی الغ بیگ اور مغلوں سے ہی سیکھ کر آئے تھے۔ دلازاک جنہوں نے ابتدا میں ان مہاجر قبیلوں کو اپنے ہم قوم بھائی سمجھ کر ان کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے تھے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ مہاجر تو ان ہی کو مہاجر بنا کر ہی دم لیں گے۔ پشاور اور اطراف پشاور کا علاقہ دلازاک سے لے کر یوسف زئی نے خلیل اور مہمند کو اس علاقے میں آباد کر دیا۔ اور خود ضلع مردان میں آباد ہو گئے۔ ضلع مردان میں آباد ہونے کے بعد یوسف زئی کی آمد و رفت سوات میں بھی جاری ہو گئی۔ سوات کا علاقہ ان دنوں سواتی پٹھانوں کے قبضے میں تھا۔ سلطان "ولیس" سوات کا حکمران تھا۔ جب کہ یوسف زئی نے یہ جنت نظیر اور شاداب وادی دیکھی تو سوات پر تابعین ہونے کے لئے منصوبے بنانے لگے۔ ایک روایت کے

مطابق اخوند درویزہ یا اس کے بزرگوں نے بھی یوسف زئی کو سوات پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ بہرصورت ملک احمد نے یوسف زئی کے بچوں، بوڑھوں اور مستورات کو مردان میں چھوڑ کر بقیہ قبیلے کے افراد کو ساتھ لیکر براستہ بالاکنڈ سوات پر حملہ کر دیا۔ بٹ خیلہ، اللہ ڈنڈ، تھانہ وغیرہ علاقوں کو فتح کرتے ہوئے یوسف زئی سوات میں داخل ہو گئے۔ قسمت یاور تھی۔ مسلسل لڑائیاں لڑکر بارہ سال کے طویل عرصہ کے بعد سواتی پٹھانوں کو سوات کے حدود سے بیدخل کرنے میں یوسف زئی کامیاب ہو گئے سواتی پٹھان ضلع ہزارہ کی طرف بھاگ گئے۔ سوات پر یوسف زئی کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بونیر کا علاقہ بھی یوسف زئی نے فتح کر لیا۔ باجوڑ کا علاقہ فتح کر کے یوسف زئی نے ترکلانی قبیلے کے حوالے کر دیا۔ ملک احمد اور شیخ ملی نے سوات، بونیر اور ضلع مردان کے علاقے یوسف زئی اور منڈنڑ کے درمیان اس طرح تقسیم کئے۔ کہ

(۱) تحصیل مردان۔ تحصیل صوابی اور وادی چملہ کے علاقے منڈنڑ کو دیدیئے۔ بقایا علاقے یوسف زئی میں اس طریقے سے تقسیم کئے

(۲) وادی سوات اکوزئی کو

(۳) بونیر کا علاقہ نویزی کو۔

(۴) دیر کا علاقہ ملیزی کو دیا گیا۔ یہ تینوں یوسف زئی کی شاخ ہیں۔

یوسف زئی کی پہلی تنظیم

شیخ ملی ملک احمد کا مشیر اور صلاح کار یوسف زئی کا ایک قابل دانشور اور عالم انسان تھا چنانچہ ملک احمد اور شیخ ملی کی سرکردگی میں سوات میں یوسف زئی کی آبادی کا منصوبہ جب تکمیل کو پہنچ گیا تو پھر یوسف زئی نے ملک احمد کو

باقاعدہ سردار بنا کر ایک قسم کی حکومت بنائی۔ شیخ ملی کو اس حکومت کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ لیکن یہ صرف اندرونی قبائلی تنظیم تھی۔ شیخ ملی نے دفتر شیخ ملی کے نام سے پشتو میں ایک کتاب لکھی۔ شیخ ملی جو کہ اپنے وقت کا ماہر مالیات بھی تھا نے اس کتاب میں تقسیم اراضیات جسے پشتو میں "ویش" کہتے ہیں کے طریقے اور قوانین وضع کئے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ یوسف زئی قبیلے کیلئے تقسیم (ویش) کی رہنما تھی۔ بلکہ چودھویں صدی کے پشتو ادب کے سلسلہ نثر کی ایک دستاویزی یادگار بھی ہے۔ پشتو کے بلند پایہ مفکر خوشحال خان خٹک نے بھی سوات نامے میں دفتر شیخ ملی کا ذکر کیا ہے۔ شیخ ملی کی تقسیم کا طریقہ اگرچہ کوئی ترقی پذیر طریقہ نہیں تھا بلکہ مستقل آبادکاری اور زراعتی ترقی کے لئے مضر بھی تھا۔ تاہم اس زمانے کے حالات کے مطابق اور نیز چودھویں صدی کے سیاسی اتار چڑھاؤ کے مطابق ایک ایسا منصوبہ ضرور تھا کہ یوسف زئی اس پر متفق ہو گئے سوات میں تو بیسویں صدی کے آغاز تک یہ فرسودہ طریقہ جاری رہا۔ اور کوئی اس قسم کا دماغی انسان پیدا نہ ہو سکا کہ تقسیم کے مذکورہ طریقے کو بدل دیتا تاوقتیکہ بانیٔ ریاست سوات بادشاہ صاحب نے حکمران ہو کر سوات کو اس دردِ سر سے نجات دلائی۔ ملک احمد کے بعد خان کجو اور علی اصغر یوسف زئی کے نامور اور بہادر سردار گزرے ہیں۔

ظہیر الدین بابر اور یوسف زئی

جب کابل کا حکمران الغ بیگ فوت ہوا تو ظہیر الدین بابر نے تخت کابل پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب بابر تسخیر ہندوستان کے لئے لشکر سمیت اس راستے سے جا رہا تھا تو کچھ دلازاک پٹھانوں کے اکسانے پر

اور کچھ اس خیال سے کہ یوسف زئی کے دلوں میں مغلوں کے لئے خواہ مخواہ عناد ہوگا۔ اس لئے آگے بڑھنے سے پہلے ان کو کچلنا ضروری ہے۔ بابر نے یوسف زئی کے علاقوں پر فوج کشی کر دی۔ ہزاروں آدمی بے گناہ قتل کئے اور لہلہاتے کھیتوں کو تاراج کر کے یوسف زئی کے کئی گاؤں جلا دیئے۔ قہر و غضب کا ایک مجسم دیوتا بن کر بابر ضلع مردان کے قریب موضع "کاٹ لنگ" میں مقیم ہو گیا اور یوسف زئی کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے سوچنے لگا کہ اس دوران میں یوسف زئی کے معزز سرداروں کا ایک وفد بطور جرگہ بابر کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ یوسف زئی عمائدین کے ساتھ ملاقات ہونے کے بعد بابر کو یوسف زئی کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے میں زیادہ فائدہ نظر آیا۔ اس زمانے میں یوسف زئی کا سردار شاہ منصور تھا۔ بابر نے یوسف زئی کے ساتھ صلح کر لی۔ یوسف زئی عمائدین کو خلعت اور انعامات دیئے۔ یوسف زئی کے علاقے پر برائے نام ایک ہزار روپیہ سالانہ خراج مقرر کیا اور پھر تعلقات کو زیادہ خوشگوار بنانے کے لئے سردار شاہ منصور کی لڑکی کے ساتھ بابر نے شادی بھی کر لی۔ اس طریقے سے بابر نے یوسف زئی اور مغلوں کی دشمنی دوستی سے بدلنے کی کوشش کی تو اس کے بعد تسخیر ہند کے لئے آگے بڑھا۔ ہندوستان میں بھی اُسے ایک پٹھان بادشاہ ابراھیم لودھی سے نبرد آزما ہونا تھا۔

شہنشاہ بابر نے ہندوستان فتح کیا۔ اس کی وفات ہونے کے بعد جب ہمایوں تخت نشین ہو گیا تو یوسف زئی پھر خود مختار ہو گئے۔ ہمایوں بے چارے کو تو اپنے ہی عقرب صفت بھائیوں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ یوسف زئی کی طرف توجہ کیسے کرتا اور پھر جب شیر شاہ سوری ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ تو وہ بھی پٹھانوں کی اپنی ہی حکومت تھی۔ لہذا جلال الدین اکبر کے

عہد تک یوسف زئی نے آرام اور فراغت کی زندگی بسر کی۔ لیکن اکبر کے عہد میں یوسف زئی کو پھر جنگی مہمات میں مصروف ہونا پڑ گیا۔ پیر روشن نے مذہبی رنگ میں چٹانوں میں اقتدار حاصل کیا تو سوات اور بونیر کے علاقے بھی اس کے حلقہ اثر میں شامل تھے۔

جلال الدین اکبر۔ پیر روشن اور یوسف زئی

شہنشاہ جلال الدین اکبر اعظم کے عہد میں مغل فوج نے دو دفعہ سوات اور بونیر کے علاقوں پر چڑھائی کی۔ ایک تو اکبر کو یوسف زئی کی خود مختاری بھی کھٹکتی تھی اور پھر پیر روشن کے مذہبی اقتدار اور عروج نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر پیر روشن اپنے منصوبوں اور ارادوں میں کامیاب ہو جاتا تو ہندوستان میں مغل اقتدار خطرے میں پڑ جاتا۔

پیر روشن کے حالات

سوات اور بونیر کے علاقوں پر اکبر کے فوج کشی کا باعث چونکہ پیر روشن کا مذہبی اقتدار تھا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس موقعے پر پیر روشن کے مذہبی اقتدار اور اس کی زندگی کے سرسری حالات بیان کئے جائیں۔ بازید نامی ایک شخص جس نے پندرہویں صدی میں ہندوستان میں مغل شہنشاہیت کی بنیادوں کو ہلایا تھا۔ جنوبی وزیرستان کے علاقہ کانی گرم میں عبداللہ نامی ایک مشہور عالم دین کا فرزند تھا۔ باپ عالم تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے فرزند "بازید" کی تعلیم و تربیت میں بھی کافی انہماک سے کام لیا۔ جوان ہو کر بازید نے نوجوانی میں گھوڑوں کی سوداگری شروع کی اور اسی کاروباری سلسلے میں ایک بار جب بازید ہندوستان گیا۔

تو اتفاقاً بازید کی ملاقات مُلا سلیمان گاہبغری سے ہوگئی۔ بازید سلیمان کی شخصیت اور عقاید سے متاثر ہوگیا حتےٰ کہ بازید نے مُلا سلیمان کی بیعت کرلی۔ ملا سلیمان جو کہ عقیدہ تناسخ کا قائل تھا۔ اس نے بازید کو بھی تناسخ کا قائل کرادیا۔ بازید جب ہندوستان سے واپس اپنے وطن پہنچ گیا۔ تو اس نے زہد و عبادت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اکثر برہنہ پا پھرتا تھا تاکہ پاؤں کے نیچے اگر چیونٹی یا کوئی اور جاندار کیڑا آجائے تو ہلاک نہ ہو۔ بازید کے باپ عبداللہ کو جب بازید کے باپ کا پتہ چل گیا، تو اس نے بازید کو سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ لیکن بازید باز نہ آیا۔ اپنے عقائد پر ڈٹا رہا۔ بازید کے باپ عبداللہ نے آخر کار بازید کو قتل کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ بازید پر اس نے خنجر کا وار کیا۔ بازید زخمی ہوگیا۔ اپنے ہی باپ کے ہاتھوں مجروح ہوکر بازید نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا۔ اور اسی حالت میں روانہ ہوکر علاقہ "ننگرہار" چلا آیا۔ ننگرہار میں بازید نے ایک سردار ملک احمد کے ہاں پناہ لی۔ کچھ عرصہ کے بعد ننگرہار سے پشاور چلا آیا۔ اب اس نے باقاعدہ اپنے عقاید کی تبلیغ شروع کی۔ حتےٰ کہ مریدوں کی ایک جماعت بنائی۔ بازید یعنی پیر روشن کے نام سے مشہور ہوکر اس کی مقبولیت کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ جمال الدین نامی ایک کمہار پیر روشن کے معتقدین اور مریدوں میں اس کا خاص معتمد تھا۔ جمال الدین کے علاوہ ایک شاعر بھی پیر روشن کے منظور نظر مریدوں میں سے تھا۔ اس شاعر کا نام "ارزانی" تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بقول "اخوند درویزہ" پیر روشن کی مشہور کتاب خیر البیان اسی ارزانی کے شاعرانہ ذوق کی یادگار ہے لیکن پیر روشن خود بھی باکمال انسان تو تھا۔ اس کے لئے خیر البیان جیسی ایک کتاب لکھنی کچھ مشکل کام نہیں تھا۔ خیر البیان "پشتو زبان میں لکھی ہوئی ایک کتاب تھی جس میں پیر روشن نے اپنے عقاید بیان کئے ہیں۔ یہ ایک قسم کی منشوری کتاب تھی۔

ہشت نگر اور اطراف تیراہ میں اور نیز ضلع پشاور کے اردگرد ان تمام علاقوں میں اب بازید کے مریدوں کی تعداد ہزاروں سے بڑھ گئی۔ بحیثیت ایک روحانی پیشوا یا مذہبی سربراہ کے پیر روشن نے جب اپنی حیثیت مضبوط کر لی تو اس نے باقاعدہ عمایدین اور سرداروں کو دعوت نامے بھیجے اور انہیں اپنے مریدوں میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ کابل کے مغل صوبے دار محسن خان کو بھی پیر روشن نے اسی قسم کا ایک خط لکھا۔ محسن خاں کو جب بازید کا خط ملا تو اسے غصّہ تو بہت آیا لیکن بازید کی پوزیشن اب مضبوط تھی۔ لہٰذا محسن خاں نے کھلے بندوں بازید پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کی۔ اس دوران میں بازید نے اپنے مریدوں کا باقاعدہ لشکر بنایا اور بیت المال قائم کیا۔ اپنے لئے ایک خاص مہر تیار کرائی۔ بازید کی مہر پر فارسی زبان کا یہ شعر کندہ تھا۔ ؎

سبحان الملک الباری جدا کرد نور از نارے
صادی المضلین بازید انصارے

شہنشاہ اکبر کو جب بازید کے مذہبی اقتدار کا پتہ چل گیا تو اس نے کابل کے صوبے دار محسن خان کو بازید کی گوشمالی کے لئے لکھا۔ صوبے دار کابل نے ایک جرّار لشکر کے ساتھ کابل سے آکر بازید کو ہشت نگر میں گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ پابہ جولان کابل لے گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کابل سے رہا ہو کر بازید واپس آگیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بازید نے رشوت دیکر خود کو آزاد کرایا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ بازید نے کابل میں اپنے عقائد سے توبہ گار ہو کر رہائی حاصل کر لی۔ بہر صورت جس طرح بھی ہو بازید رہا ہو کر اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں اکبر اعظم دین الٰہی کی ترویج میں مصروف تھا۔ اور جابجا ... اکبر کی مخالفت ہو رہی تھی۔

۱۵۸۰ء میں ہندوستان کے مشہور عالم دین ملا محمد جونپوری نے اکبر کے برخلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ اب تو پیر روشن نے بھی کھلے بندوں اکبر کی مخالفت شروع کی اور اکبر کے خلاف جہاد کو جائز قرار دیا۔

۱۵۸۵ء میں جب اکبر کی فوج راجہ مان سنگھ کی سرکردگی میں کابل جا رہی تھی تو مازید کے حکم سے یوسف زئی اور منڈنڑ قبیلوں نے دریائے کابل کے شمالی طرف سے اور خود بازید نے دریائے سندھ کی مغربی طرف سے شاہی فوج پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں شاہی فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ سرکاری لشکر اور قافلے کے آٹھ ہزار افراد مجروح اور زخمی ہو گئے۔ جلال الدین اکبر کو جب ان واقعات کی اطلاع ملی تو اس نے محسوس کیا کہ بازید کی طرف سے مزید غفلت باعث تباہی ہو گی۔ اب سوات اور بونیر کے علاقے جو خود مختاری کا دم بھی بھرتے تھے اور بازید کے حلقۂ اثر میں بھی شامل تھے۔ چنانچہ اکبر نے سوات اور بونیر کو بزور شمشیر مطیع کرنے کا ارادہ کر لیا۔

۱۵۸۶ء میں اکبری فوج کا حملہ

سوات اور بونیر کے علاقوں پر

شہنشاہ اکبر نے زین خان کوکہ کو پانچ ہزار فوج دے کر یوسف زئی اور منڈنڑ قبیلوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ زین خان باجوڑ کے راستے "ادین زئی" کے علاقے میں داخل ہو گیا اور پھر ادین زئی سے چل کر سوات پہنچ گیا۔ لیکن سوات پہنچ کر زین خان نے خود کو کمزور محسوس کیا۔ اس نے اکبر اعظم کو دیکھا کہ سوات اور بونیر کی تسخیر کے لئے زیادہ فوج کی ضرورت ہے۔ اکبر نے حکیم ابوالفتح کی سرکردگی میں پانچ ہزار فوج مزید بھیجدی۔ لیکن جنرل مذکور نے سوات پہنچکر علیحدہ

کیمپ لگایا۔ وہ خود کو زین خان کا ماتحت تصور نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ درباری وزیر تھا۔ زین خان کی بھی یہی حالت تھی کہ وہ اپنے آپ کو عسکری کمانڈر کی حیثیت سے حکیم سے بہتر سمجھتا تھا۔ اب حالت یہ تھی کہ زین خاں اپنے کیمپ میں آرام سے پڑے ہوئے ہیں اور حکیم صاحب اپنے کیمپ میں علم و حکمت کے موتی لٹا رہے ہیں۔ حالانکہ اکبر نے دونوں کو تسخیر یوسف زئی کی عظیم مہم کو سر کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ آخر کار زین خان نے اس صورت حال سے اکبر کو مطلع کر دیا۔ چنانچہ اکبر نے بھی اس دفعہ ستم ظریفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہنشاہ طرافت راجہ بھیش داس بیربل کی سرکردگی میں مزید پانچ ہزار فوج بھیجدی۔ بعد مشکل یہ تینوں پانچہزاری متحد ہوئے اور پندرہ ہزار کے جرار لشکر کے ساتھ کوہ کڑاکوڑ کے راستے بونیر روانہ ہوئے، بونیر کے علاقے میں "ریگا" کے مقام پر شاہی فوج مقیم ہوئی۔ اسی مقام پر پینے کا پانی حاصل کرنے کے لئے ایک کنواں بھی کھودا۔ یوسف زئی قبائل اکثر رات کو حملہ کرتے۔ شبخون مارنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ لہذا راجہ بیربل اور حکیم صاحب دونوں کے تو اوسان خطا ہو گئے۔ زین خان البتہ فوجی انسان تھا۔ اس نے دونوں کو تسلی دی اور بہت سمجھایا کہ یہ قبائلی لشکر ہے۔ چند دنوں میں خود بخود منتشر ہو جائے گا۔ لیکن بیربل[1] اور حکیم دونوں دارخطا ہو کر واپس روانہ ہوئے۔ چنانچہ یوسف زئی لشکر نے اس بھاگتے ہوئے لشکر پر حملہ کر کے ہزاروں افراد لشکر کے ہلاک کئے۔ زین خان تو کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اکبر کے چہیتے بیربل اور حکیم صاحب دونوں قتل ہو گئے۔ اکبر کو اپنے درباری بیربل کے مارے جانے کی اطلاع ملی تو بہت غمگین ہوا۔ اب اس نے یوسف زئی کو مطیع کرنے کے لئے راجہ ٹوڈر مل کو منتخب کیا۔

---

[1] بیربر

۱۵۸۵ء راجہ ٹوڈرمل اور بازید کے غلا تبلیغی مہم

سوات اور بونیر کی تسخیر کی پہلی مہم ناکام ہوگئی تو اکبر نے راجہ ٹوڈرمل کو ایک جرار لشکر کے ساتھ سوات اور بونیر کی تسخیر کے لئے روانہ کردیا۔ ٹوڈرمل اٹک کے قلعے میں مقیم ہوگیا۔ لڑائی کو طول دے کر اس نے جنگی تدابیر سے زیادہ سیاسی تدابیر سے کام لیا۔ یوسف زئی قبیلے میں اثر ورسوخ کو استعمال کرکے اپنے تعلقات پیدا کئے۔ آخر کار یوسف زئی کا لشکر منتشر کرنے اور انہیں صلح کرنے اور آئندہ کے لئے پرامن رہنے کے لئے آمادہ کرلیا۔ اس طریقے سے بغیر کسی جنگ کے یوسف زئی کی مہم سر کرلی۔ پیر بازید کے مذہبی اثر کو ختم کرنے کے لئے بھی حکمت عملی سے کام لیا گیا۔

۱۵۸۶ء سیّد علی شاہ ترمذی المشہور پیر بابا

انہی ایام میں جب کہ راجہ ٹوڈرمل قلعہ اٹک میں مقیم تھا۔ ایک سال پہلے سیّد علیشاہ صاحب ترمذی المعروف "پیر بابا" بونیر آئے اور پانچ کلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ سیّد علی شاہ صاحب جو بڑے نامی بزرگ گزرے ہیں اور پٹھانوں میں "پیر بابا" کے نام سے مشہور ہیں۔ پانچ کلی میں پیر بابا کا پرشکوہ مزار آج بھی مرجع خلائق عام ہے۔ پٹھانوں کے ہر قبیلے کے سینکڑوں افراد ہر سال موسم بہار میں پیر بابا کے مزار کے طواف کے لئے آتے ہیں۔ شاید ہی پٹھان قوم میں ایسا کوئی فرد ہو جو کہ پیر بابا کے نام سے واقف نہ ہو۔ دور دراز جنوبی اضلاع کوہاٹ اور بنوں کے پٹھانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر پیر بابا کے مزار پر صدق دل سے کوئی سوال شادی کے لئے کرے تو اس کی مراد ضرور پوری ہوتی ہے چنانچہ آج تک مذکورہ علاقوں سے عشق ومحبت کے مایوس مریض پیر بابا

کے مزار پر آتے رہتے ہیں۔

سید علی شاہ صاحب ترکستان کے ایک گاؤں "ترمذ" کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ہمایوں کی فوج میں ملازم تھے۔ سید علی شاہ صاحب جوان ہوئے تو انہیں بھی فوج میں ملازم کروادیا۔ اس موقعے پر سید علی شاہ نے اپنے والد سے کہا کہ ہم سادات ہیں۔ ہمارا کام بادشاہوں کی ملازمت نہیں بلکہ ہمارا کام تو زہد و عبادت اور دین حق کی اشاعت ہے۔ سید علی شاہ کی طبیعت ابتدا ہی سے زاہدانہ تھی۔ لہٰذا فوج میں ان کی شمولیت برائے نام تھی ہر وقت زہد و عبادت میں مصروف رہتے۔ پیروں اور فقیروں سے ملتے حتےٰ کہ فوج سے الگ ہو گئے۔ جن دنوں ہمایوں شیر شاہ کی فوج سے شکست کھا کر ہندوستان سے بطرف ایران جا رہا تھا تو سید علی شاہ صاحب ان دنوں گجرات پنجاب میں مقیم تھے۔ اسی جگہ اپنے والد کے ساتھ بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ والد ہمایوں کے ہمرکاب جا رہے تھے بیٹے کو سینے سے لگایا اور پھر ایک ہمیانی اشرفیوں کی بھری ہوئی سید علی شاہ کو پیش کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بیٹا تم سچ کہتے تھے۔ اب مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بزرگوں کا نام روشن کرو گے۔" یہ کہہ کر باپ بیٹا جدا ہو گئے۔ بعد میں شیر شاہ کے سپاہیوں نے سید علی شاہ سے اشرفیوں کی وہ ہمیانی بھی چھین لی۔ اس طرح سید علی شاہ صاحب ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنا وقت زہد و عبادت میں بسر کرتے رہے۔ جب اکبر کی حکومت ہندوستان میں مضبوط ہو گئی تو سید علی شاہ صاحب نے بونیر میں سکونت اختیار کر لی۔ بونیر کو مستقل مرکز بنا کر آپ نے پیر روشن کے برخلاف مذہبی اصلاح کی تحریک شروع کی۔ مشہور عالم اخوند درویزہ نے سید علی شاہ صاحب کے دست مبارک

پر بیعت کر کے انہیں اپنا مرشد تسلیم کیا۔ اخوند درویزہ کے مرید ہونے پر پیر روشن کے خلاف تحریک تیز ہو گئی۔ ہشت نگر میں پیر روشن کے ساتھ ہزاروں افراد کی موجودگی میں ایک مباحثہ ہوا۔ پیر بابا صاحب بھی شریک تھے لیکن پیر روشن قائل نہ ہو سکے۔ اس کے بعد سوات میں کاٹیلی کے مقام پر پیر روشن اور اخوند صاحب درویزہ کے درمیان پھر ایک مباحثہ ہوا۔ لیکن پیر روشن اپنے عقاید پر ڈٹے رہے حتیٰ کہ اخوند صاحب درویزہ نے اپنی عالمانہ شمشیر بے نیام کی۔ پیر روشن کے برخلاف کفر کا فتویٰ دے دیا۔ اسے کافر اور بے دین قرار دیا گیا۔ بجائے پیر روشن کے اسے پیر تاریک کا خطاب دیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد پیر روشن پیر تاریک ہی مشہور ہوئے۔ ۱۵۸۸ء میں پیر روشن علاقہ تیراہ میں فوت ہو گیا۔

پیر روشن کے بعد سوات اور بونیر کے علاقوں سے پیر روشن کے مذہبی اثرات ختم ہونے شروع ہو گئے۔ پیر روشن کا فرزند "جلالہ" اس کے مریدوں کا سردار بن گیا۔

اکبر کے برخلاف "جلالہ" نے بھی کچھ عرصہ تو لڑائی جاری رکھی۔ آخر کار گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ اب سوات اور بونیر کے علاقوں پر "پیر بابا" اور اخوند درویزہ کا روحانی اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ بازیدی تحریک ناکام ہو گئی۔ بعض لوگوں اور افغان تاریخ کے بعض محققین کا خیال ہے کہ پیر روشن کی تحریک دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جو مغل اقتدار کے برخلاف پٹھانوں میں پیر روشن نے شروع کی تھی۔ بہر صورت جو کچھ بھی تھا پیر روشن اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آج تک پٹھانوں میں پیر تاریک کے نام سے مشہور ہے۔ اخوند درویزہ نے ہی اس کے مذہبی اقتدار اور اثر و رسوخ کا خاتمہ کرایا ہے۔ چنانچہ بازید کے بعد سوات اور بونیر کے علاقے شہنشاہ اکبر کی عملداری

ہیں شامل ہو گئے۔

"اخوند درویزہ" کی شخصیت

اخوند درویزہ کا اصلی نام عبدالرشید تھا اور علاقہ ننگرہار (افغانستان) کا باشندہ تھا۔ لیکن عمر کا زیادہ حصہ پشاور اطراف پشاور اور سوات۔ بونیر میں گذار چکا ہے۔ یوسف زئی پٹھانوں میں بالخصوص سوات اور بونیر کے علاقوں میں "اخوند درویزہ" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ سوات اور بونیر کے لوگ تو اب بھی اس کے معتقد ہیں۔ پشاور شہر کے کوہاٹی دروازے سے باہر وسیع قبرستان میں اخوند درویزہ کا روضہ اب بھی ایک زیارت کی حیثیت رکھتا ہے۔ علاقہ سوات اور ہشت نگر میں پیر روشن کے ساتھ علمی مباحثے کر کے اخوند درویزہ نے اپنی ساکھ بٹھائی۔ اور پھر پیر بابا کے مرید اعلیٰ ہونے کی وجہ سے بھی لوگ معتقد ہو چکے تھے۔ اخوند درویزہ ایک عالم اور فاضل انسان تھا۔ بقول خوشحال خان خٹک یوسف زئی تو اس کو مجتہد سمجھتے تھے۔ علاقہ سوات میں اخوند صاحب نے بحیثیت مذہبی عالم کے بہت کام کیا ہے۔ سوات اور پٹھانوں کے دوسرے علاقوں میں یہ طریقہ ہے کہ مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم مسجدوں میں ہی رہائش رکھتے ہیں۔ یہ مسجد ہی ان کے ہوسٹل یا بورڈنگ ہیں۔ جس محلے یا گاؤں کی مسجد میں جتنے طالب علم پڑھتے ہیں۔ ان کو روٹی بھی گاؤں والے دیتے ہیں۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ طالبعلموں کے پاس ایک ٹوکری اور ایک برتن ہوتا ہے۔ ہر صبح و شام ایک طالب علم وہی ٹوکری اور برتن لیکر محلے یا گاؤں میں پھرتا ہے۔ ہر گھر کے دروازے پر جاکر آواز دیتا ہے۔ چنانچہ روٹی کا ایک ٹکڑہ گھر والے اس کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں اور برتن میں کچھ سالن بھی ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح گاؤں کے تمام گھروں سے یہ طالب علمانہ خراج

وصول کر کے روٹی کی بھری ہوئی ٹوکری اور سالن سے بھرا ہوا برتن مسجد میں لے آتے ہیں پھر سب طالب علم مل کر کھاتے ہیں۔ گدائی کا یہ عجیب و غریب طریقہ اخوند درویزہ نے ہی ایجاد کیا ہے۔ پشتو زبان میں گدائی کو "درویزہ" (دریوزہ) بھی کہتے ہیں۔ غالباً ایسی مناسبت سے اخوند عبدالرشید بھی اخوند درویزہ مشہور ہوئے تھے۔ موجودہ زمانے میں اس گدایانہ طریقے کو لوگ طالب علمان دین کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں اور خیال ہے کہ ملا طبقے کی بگڑی ہوئی حریصانہ ذہنیت، آرام طلب زندگی، تنگ نظری وغیرہ کا باعث یہی گدایانہ خوراک ہے۔ خوشحال خان خٹک نے ملا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"اے ملا صاحب تم تو ہمارے سردار اور امام تھے۔ تمہارا منصب تو بہت عظیم ہے لیکن ایک ٹکڑہ روٹی کے عوض اپنی عظمت بیچ کر تم نے خود کو ہم لوگوں کا غلام بنا دیا مانگ مانگ کر روٹی کھانے والے قوموں کی امامت کیسے کر سکتے ہیں؟"

ہو سکتا ہے کہ یہ طریقہ فرسودہ اور نقصان دہ ہو۔ لیکن اس کے بدلہ میں کوئی اور طریقہ جو بہتر اور شایان شان ہو ابھی رائج نہیں ہے۔ مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے اکثر غریب ہی ہوتے ہیں۔ مالدار کا بیٹا انگریزی تعلیم حاصل کر کے کسی تحصیل یا تھانے کا انچارج افسر بن جاتا ہے۔ غریب طالب علم مذہبی تعلیم حاصل کر کے کسی مسجد کا انچارج امام بن جاتا ہے۔ اور اگر کسی خوش نصیب کو سنگ مرمر کی بنی ہوئی عالیشان مسجد کی امامت مل جائے تو بس مزے ہیں۔

بانیٔ ریاست سوات "بادشاہ صاحب" مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مذہبی تعلیم کی افادیت اور عظمت کا احترام کرتے ہوئے سیدو میں اپنے ولی عہد

کے ایما پر شاندار دارالعلوم بنوایا ہے۔ جس میں مذہبی تعلیم حاصل کی جاتی ہے — یہ دارالعلوم اور اس کا انتظام موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ سکولوں اور کالجوں سے کم نہیں ہے۔

اخوند درویزہ ایک عظیم عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں "تذکرہ" اور "مخزنِ اخوند" دو کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔ اوّل الذکر کتاب فارسی میں لکھی گئی ہے اور "مخزن" پشتو کی کتاب ہے جو کہ پیر روشن کی خیر البیان کے مقابلے میں لکھی گئی تھی۔ یہ بھی اس زمانے کے پشتو ادب کے سلسلہ نثر کی ایک یادگار ہے۔

اخوند درویزہ کا شمار پٹھان قوم کے مشہور عالموں میں ہوتا ہے۔ بہت ہی عابد اور زاہد انسان تھے۔

جلال الدّین اکبر کے بعد

شہنشاہ اکبر کے بعد جہانگیر اور شاہ جہان دونوں مغل بادشاہوں نے یوسف زئی کے متعلق حکمت عملی سے کام لیا۔ شاہ جہان نے تو یوسف زئی کے مقابلے میں خٹک قبیلے کو زیادہ اہمیت دے کر اسے طاقت ور بنا دیا اور خٹک قبیلے کے افراد کو یوسف زئی کے علاقے میں آباد کرایا۔ چنانچہ ضلع مردان کا مشہور قصبہ "لوند خوڑ" اور اس کے مضافاتی گاؤں خٹکوں کے ہیں اور عہد شاہ جہانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خٹک قبیلے کی پشت پناہی کر کے پھر یوسف زئی اور خٹک کو آپس میں لڑاتا رہا۔ اس طرح خود مغل آرام سے رہے لیکن یہ حالت تو اس وقت تک تھی کہ جب تک شاہ جہان بادشاہ رہا۔ اورنگ زیب کے عہد میں حالات نے کچھ اور صورت اختیار کر لی۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں

اپنے باپ شاہ جہاں کو قید میں ڈال کر اورنگ زیب ہندوستان کا بادشاہ ہوا تو کچھ عرصہ کے بعد یوسف زئی پھر خود مختار ہوئے۔ اورنگ کے عہد میں بھی ابتدائی سالوں میں یوسف زئی اور خٹک قبیلوں کی باہمی آویزش جاری رہی۔ لیکن جب خوشحال خان خٹک نے مغل اقتدار کے خلاف علم آزادی بلند کیا تو یوسف زئی اور خٹک قبیلوں کی دشمنی دوستی میں بدل گئی۔ ابتدا میں تو یوسف زئی بھی خوشحال خان کی قومی تحریک سے وابستہ رہے لیکن بعد میں اورنگ زیب نے ان کی دکھتی رگ پکڑ لی، اور حکمت سے کام لیا۔ اورنگ زیب نے مشہور صوفی اور بزرگ حضرت بنوریؒ صاحب کے صاحبزادوں کو آلہ کار بنا کر علاقہ سوات میں یوسف زئی قبیلے میں تبلیغ کے لئے بھیجا۔ جنہوں نے سوات آکر یوسف زئی کو شہنشاہ اورنگ زیب کے مقابلے میں پُرامن رہنے کی تلقین کی۔ اورنگ زیب کی پارسائی اور زہد کے قصے بیان کئے اور ان لوگوں سے کہا کہ اورنگ زیب جیسے خدا رسیدہ حکمران سے الجھنا مناسب نہیں کہ اس کا انجام بھی اچھا نہ ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد اورنگ زیب کی عملداری اور حکومت میں شامل ہونے کا تقاضہ یہ بھی تھا کہ ان لوگوں پر کوئی مالیہ یا خراج مقرر کرتا لیکن اورنگ زیب نے یہاں بھی دانائی سے کام لیا۔ ان لوگوں سے کہا ..... کہ

"میں اپنے لئے یا حکومت کے لئے آپ لوگوں سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ البتہ حضرت بنور صاحبؒ میرے بزرگ مرشد ہیں انکے صاحبزادوں اور اولاد کے لئے آپ لوگ دائمی وظیفہ اگر تسلیم کریں تو یہ کار ثواب بھی ہے اور شہنشاہ وقت کی تابعداری اور فرماں برداری کا ایک ثبوت بھی ہے"

چنانچہ

ان لوگوں نے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ جائداد کے لحاظ سے ہر گھرانے پر مقررہ نذرانہ سالانہ تسلیم کر لیا۔ ایک روپیہ جائداد (۲۰ جریب) پر ایک روپیہ وظیفہ حضرت بنورؒ کی اولاد کے لئے منظور کیا گیا۔ چنانچہ یہ مقررہ نذرانہ اب تک سوات کے یوسف زئی پٹھان نہایت سعادت مندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ بانی ریاست سوات بادشاہ صاحب خود بھی ذاتی جائداد پر یہ نذرانہ باقاعدگی کے ساتھ دیتے ہیں۔ حضرت بنورؒ صاحب کے ورثا ضلع کوہاٹ سے آکر ہر سال وصولی کرتے ہیں۔ اس طریقے سے اورنگ زیب نے یوسف زئی اور خٹک قبیلوں کے اتحاد کو ختم کر دیا..... خوش حال خان کی جد و جہد میں اگر یوسف زئی بھی شامل رہتے تو پھر صورت حال کچھ اور ہوتی۔

خوشحال خان خٹک سوات آیا تھا اور یوسف زئی عمائدین نے اس کے شایان شان مہمان نوازی اور احترام میں بھی کوئی دقیقہ فروگذار نہ ہونے دیا۔ لیکن جس مقصد کے لئے خوشحال خان ان کو آمادہ کرنا چاہتا تھا یوسف زئی اس کے لئے تیار نہ ہو سکے۔ لہٰذا خوشحال خان کو سوات سے ناکام واپس ہونا پڑا۔ اگرچہ ابتدا میں مغل صوبیدار مہابت خان نے یوسف زئی علاقے میں لنگر کوٹ کا قلعہ بنوانے وقت یوسف زئی پر نارو امظالم بھی کئے تھے۔ اور زیادہ تر اسی واقعہ سے متاثر ہو کر خوشحال خان خٹک نے اعلانیہ بغاوت مناسب سمجھی۔ لیکن اس قسم کے واقعات کے باوجود پٹھانوں کو متحد کرنے کا خواب خوشحال خان کا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بقول خوشحال خان اورنگ زیب کے پاس مناصب اور اعزازات تھے اور پٹھان عمائدین مناصب کے شیدائی تھے لہٰذا اورنگ زیب کی سیاست کامیاب رہی۔ لیکن دائمی عظمت اور کامرانی بحیثیت ایک مفکر اور افغان دانشور خوشحال خان کو ہی نصیب ہوئی۔ چنانچہ اس طریقے سے سوات کا علاقہ اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کا ایک حصہ رہا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد

اورنگ زیب کے بعد ۱۷۴۸ء تک سوات اور بونیر دیر اور باجوڑ کے یہ علاقے آزاد اور خود مختار رہے۔ اس دوران میں مغل حکمرانوں میں کوئی مضبوط حکمران پیدا نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب کے بعد تو خود بخود مغل اقتدار روبہ زوال ہو گیا۔ لہٰذا ان علاقوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ اگرچہ یہ علاقے اس دوران میں خود مختار اور آزاد رہے۔ لیکن ان لوگوں کی اپنی بھی کوئی خاص تنظیم قائم نہ ہو سکی۔

۱۷۴۹ء احمد شاہ ابدالی اور یوسف زئی

افغان اتحاد میں یوسف زئی صرف احمد شاہ ابدالی کے عہد میں ہی شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد کوئی مثال نہیں ملتی۔ احمد شاہ ابدالی ہی وہ عظیم الشان اور مدبر حکمران تھا۔ جس نے بکھرے ہوئے افغان قبائل کو متحد کرنے کی جدوجہد کر کے ایک لڑی میں پرو دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پٹھان قوم کو دنیا میں صرف ایک بار متحد کرنے کی سعادت احمد شاہ ابدالی نے حاصل کی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کی حکومت اور اس کا انتخاب افغانی روایات اور قومی دستور کے عین مطابق تھا۔ احمد شاہ کی حکومت صحیح معنوں میں افغانوں کی قومی حکومت تھی۔ پٹھانوں کے ہر قبیلے کے نمائندے احمد شاہ کی مجلس مشاورت میں شامل تھے۔ مجلس مشاورت ایک قسم کا قومی ایوان تھا جس میں پٹھان قوم کے ہر قبیلے کو مناسب نمائندگی حاصل تھی۔ اسی قومی ایوان کے فیصلے نافذ ہوا کرتے تھے۔

احمد شاہ کی فوج اور سول سروس میں بھی ہر قبیلے کو منصفانہ نمائندگی حاصل تھی۔ احمد شاہ کی حکومت کے تین اہم مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) بکھرے ہوئے پٹھان قبائل کی متحدہ قومیت اور ملت اسلامیہ کے ساتھ ملحق۔

(۲) افغانوں کی ایک مضبوط حکومت۔

(۳) قابل فخر افغانی روایات کی ترویج۔

احمد شاہ ابدالی کی شخصیت صحیح معنوں میں افغانی اوصاف اور اسلامی اصولوں کی آئینہ دار تھی۔ لہذا پٹھان قوم کے ہر قبیلے نے احمد شاہ کی آواز پر لبیک کہا۔ اس میں یوسف زئی بھی شامل تھے۔ آج کے بعض لیڈروں کی طرح احمد شاہ افغانوں کو "نیا ازم" یا خود غرضی کی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ وہ افغانوں کو ایک بلند کردار قوم کی حیثیت سے دیکھنے کے متمنی تھے۔ پٹھانوں کے ہر قبیلے نے احمد شاہ ابدالی کی حکومت رضاکارانہ طور سے تسلیم کی تھی۔ لہذا احمد شاہ کے عہد میں خود مختاری اور ماتحتی کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ لیکن یہ خوشگوار حالت صرف احمد شاہ کی زندگی تک رہی۔ اس کے بعد اتحاد ختم ہوا۔

احمد شاہ کے بعد

احمد شاہ ابدالی کے بعد پھر کوئی مضبوط شخصیت ایسی پیدا نہ ہو سکی جو کہ افغان قبائل کے اتحاد کو برقرار رکھنے کا باعث ہوتی۔ لہذا یوسف زئی پھر خود مختار ہو گئے۔

۱۸۲۳ء میں جب سردار اعظم خان گورنر کشمیر نے سکھوں پر حملہ کیا تو یوسف زئی قبیلے نے درآنی لشکر کا ساتھ دیا۔ اس جنگ کے بعد امیر دوست محمد خان کے بھائیوں کے درمیان تخت کابل کے لئے کش مکش شروع ہو گئی۔ اس باہمی نفاق اور خود غرضی کا نتیجہ یہی نکلا کہ کشمیر اور پشاور پر سکھ قابض ہو گئے۔

یوسف زئی قبیلے کے لوگ کابل کے سرداروں سے بدظن ہو کر پھر سے خود مختار ہو گئے

رنجیت سنگھ اور یوسف زئی

خدا کی شان دیکھئے کہ صوبہ سرحد کے خود غرض اور اقتدار پرست خوانین کے بدولت پٹھانوں کو سکھوں کی غلامی کا جوا بھی گلے میں ڈالنا پڑ گیا۔ ابتدا میں سید احمد بریلوی معہ رفیقوں کے جب سوات آئے تو سوات کے لوگوں نے بڑی عقیدت ظاہر کی اور سوات کے مختلف دیہات میں سید صاحب کی مہمانی ایک شہنشاہ کی طرح کی گئی۔ ابتدا میں سید صاحب کا ساتھ دینے میں یوسف زئی نے حسب معمول جوش و خروش ظاہر کیا۔ جب سید احمد بریلوی نے سکھوں کو شکست دے کر پشاور پر قبضہ کر لیا تو اس جہاد میں یوسف زئی نے بھی حصہ لیا تھا۔ لیکن بعد میں یوسف زئی قبیلے اور سید صاحب کے مابین مذہبی اختلافات پیدا ہوئے تو یوسف زئی نے سید صاحب سے علیحدگی اختیار کی۔ سید احمد صاحب کے شہید ہونے کے بعد پھر یوسف زئی نے سکھوں کے برخلاف کسی لڑائی میں خاص حصہ نہیں لیا۔

سید احمد صاحب بریلوی کی شہادت کے بعد

سید احمد صاحب بریلوی کی ..... شہادت کے بعد سوات میں یوسف زئی کی اخلاقی حالت خراب ہو گئی۔ اس زمانے میں یوسف زئی کا تعلق کسی تنظیم یا حکومت سے نہیں تھا۔ یہ لوگ خود سرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ سوات میں کوئی مضبوط شخصیت نہیں تھی کہ ان لوگوں کو کنٹرول کرتی۔ لہٰذا ۱۸۴۵ء تک کا زمانہ ان لوگوں کے لئے ایک عہدِ ظلمت تھا۔ حالات یوں تھے کہ باوجود مسلمان ہونے کے یہ لوگ جہل اور بدعات کے لائشوں میں مبتلا ہو گئے۔ باطل رسومات اور تباہ کن رواجوں کا سلسلہ عروج پر تھا۔

سوات کے لوگ بغض اور حسد کے لئے مشہور ہو گئے۔ انسانی زندگی کی اہمیت ختم ہو گئی۔ یہ لوگ معمولی باتوں کو درمیان میں لاکر قتل اور خون کا بازار گرم دیتے تھے۔ جہل کی حالت یہ تھی کہ دو آدمیوں کا معمولی تنازعہ دو پارٹیوں کی لڑائی بن جاتی۔ اب یہاں مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ کس طرح ایک معمولی واقعہ دو پارٹیوں کے درمیان خونریزی اور نفاق کا باعث بنا۔

سوات کے کسی گاؤں میں ایک مجرے میں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک ہی گاؤں کے دو آدمی تھے۔ کوئی دشمنی ان کی نہیں تھی۔ اچھے خاصے تعلقات تھے۔ اتفاقاً ایک چڑیا آگئی اور مجرے میں درخت پر بیٹھ کر چہچہانے لگی اور پھر چند منٹ کے بعد اڑ گئی۔ اب بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے کہا کہ یار عجیب بات میں نے دیکھی کہ بالکل کالے رنگ کی نرالی جیسی چڑی تھی دوسرے نے کہا کہ اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری نظر تو خاصی کمزور ہو چکی ہے کہ تمہیں سفید چیز بھی کالی نظر آتی ہے جب کہ وہ چڑیا بالکل سفید رنگ کی تھی۔ اس کے پر تو بالکل دودھیا رنگ کے سفید اور چمکدار تھے۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں پر کالے تھے سیاہ و سفید کی اس بحث نے بالآخر تکرار کی صورت اختیار کی۔ تکرار کی نوبت تلخ کلامی اور گالی گلوچ تک پہنچ گئی۔ نتیجہ ہاتھا پائی کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔ بڑھتے بڑھتے بات بڑھ گئی۔ گاؤں والوں کو پتہ چل گیا۔ دونوں کے متعلقین اور حمایتی موقع پر پہنچ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو پارٹیوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی۔ کئی آدمی زخمی اور ہلاک ہو گئے۔

یہ حالت تھی اس علاقے کی دنیا سے دور پہاڑوں کے درمیان گھرے ہوئے اس ماحول میں ان لوگوں نے آپس میں ختم ہونے کے ارادے کئے ہوئے تھے۔ کہ قدرت نے ان کی رہنمائی کے لئے انہی میں سے ایک برگزیدہ اور مصلح انسان پیدا

کیا۔ اس مصلح اور عظیم انسان کا نام عبد الغفور تھا جو آگے چل کر انیسویں صدی کا عظیم انسان ثابت ہو گیا اور صاحب سوات اخوند صاحب سوات کے ناموں سے مشہور ہو گیا۔ صاحب سوات نے یوسف زئی کی اخلاقی اصلاح اور مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کی تنظیم اور اتحاد کے لئے بھی کامیاب جدوجہد کی۔ آج کے سوات کی خوشحالی، فراغت، مضبوط حکومت اور تعلیمی ترقی جو کچھ بھی ہے دراصل اسی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو کہ اخوند صاحب سوات نے سوات کے لئے شروع کی تھی اور پھر جس کی تکمیل اخوند صاحب کے شیر دل اور فولاد صفت پوتے بادشاہ صاحب کے ہاتھوں ہوئی اور جسے مزید فراغت اور رنگینی کا جامہ اسی بادشاہ صاحب کے عزیز فرزند اور جانشین والئے سوات پہنا رہے ہیں۔ سلسلۂ عروج جاری ہے۔

سواتی پٹھان

پیشتر اس سے کہ اخوند صاحب سوات کے حالات بیان کئے جائیں یہاں پر ان سواتی پٹھانوں کے سرسری حالات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو کبھی سرزمین سوات میں آباد تھے اور جن کو یوسف زئی پٹھانوں نے سوات سے نکالا ہے۔ یہ واضح رہے کہ سواتی پٹھانوں کو سوات میں آباد ہونے کی وجہ سے سواتی نہیں کہا جاتا ہے، بلکہ سواتی پٹھان ان کا قبائلی نام ہے اور غالباً انہی کا مسکن ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ بھی سوات کے نام سے مشہور ہو چکا ہے۔

سواتی پٹھانوں کے سلسلۂ نسب کے متعلق مستند معلومات حاصل کرنے میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ "خورشید جہاں" ایک افغانی تاریخ ہیں ان کے متعلق مصنف تاریخ مذکور نے لکھا ہے کہ ان کے متعلق مستند معلومات نہیں ملتیں۔ یہ لوگ خود کو "تاجک" نسل بھی سمجھتے ہیں۔ ابتدا میں کورم کے کنارے ایک علاقہ سلمان

میں آباد تھے۔ پھر تیراہ سے اٹھ کر ہشت نگر اور ہشت نگر سے اٹھ کر پھر سوات میں آباد ہوئے۔ تھے کہ یوسف زئی نے ان کو سوات سے بھی بے دخل کر دیا "تاریخ افغانان دیگان" میں ان کو شلمان کے قدیمی باشندوں کے نام سے لکھا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ تواریخ میں ان کے متعلق کچھ حالات سلسلۂ نسب کے ہوں لیکن اس موقع پر ہم اس قسم کے معلومات حاصل نہ کر سکے اور پھر ہمارا تعلق بھی صرف ریاست سوات کی تاریخ اور بانیٔ ریاست کے سوانح سے ہے۔ موجودہ وقت میں سواتی پٹھان دریائے سندھ کے پار علاقہ "آلائی" میں آباد ہیں۔ بہرصورت یہ درست ہے کہ یہ لوگ افغان ہی ہیں۔ تہذیبی لحاظ سے بھی یہ پٹھان ہیں۔ لہٰذا ان کو تاجک نسل کہنا کچھ غلط معلوم ہوتا ہے۔ علاقہ سوات میں ان کو محمود غزنوی نے آباد کیا تھا۔ سلطان کے ساتھ جہاد میں بھی یہ لوگ شریک تھے۔

ریاست سوات میں آباد لوگوں کی تفصیل قومیت

یہ ریاست جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے یوسف زئی پٹھانوں کی ریاست ہے۔ اس میں اکثریت بھی یوسف زئی پٹھانوں کی ہے تاہم دوسری قوموں کے کچھ لوگ بھی سوات اور بونیر کے علاقوں میں آباد ہیں جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

(۱) یوسف زئی پٹھانوں کی غالب اکثریت کی زبان پشتو۔

(۲) کوہستانی جو کہ کوہستانی علاقوں میں آباد ہیں یہ لوگ افغان نسل نہیں ہیں۔ ان کی زبان بھی پشتو نہیں ہے بلکہ ہندکو سے ملتی جلتی کھوداری بولی جاتی ہے۔

(۳) اجڑ گوجر زراعت پیشہ اور مویشی پالنے والے ہیں۔ دودھ فروشی بھی ان کا پیشہ ہے۔ اکثر پہاڑوں میں آباد ہیں ان کی بولی بھی پشتو نہیں ہے۔ ہندکو سے ملتی جلتی

ایک بولی آپس میں بولتے ہیں لیکن پشتو بھی بولتے ہیں۔

(۴) پراچہ قوم مختلف بازاری قصبات اور دیہات میں آباد ہیں۔ تجارت پیشہ لوگ ہیں اور سوات کی تجارت پر یہی حاوی ہیں۔ پرامن رہنے والے شہری ہوتے ہیں نماز، روزہ اور حج کے یہ لوگ نسبتاً زیادہ پابند ہوتے ہیں۔

ریاست سوات میں حکومت بننے کے بعد ان سب کو مساوی قسم کے شہری حقوق حاصل ہیں۔ پُرامن اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تعلیم سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ حالانکہ اس ماحول میں حکومت بننے سے پہلے ان اقلیتی قوموں کے لوگوں کی زندگی خوانین اور جابر پٹھانوں یعنی اکثریتی قوم کے ہاتھوں ایک دردناک عذاب کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ یہ بے چارے اپنے گھروں میں کوئی اچھی چیز مثلاً قالین، رضائی اچھے کمبل یا کراکری کے سامان بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ خوانین ان کو لوٹتے تھے۔ اور جبراً ان سے روپیہ بھی وصول کرتے تھے۔ ان کو جائداد خریدنے یا پختہ مکان بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ بس ان لوگوں کی زندگی تو خوانین کے رحم و کرم پر منحصر تھی اور یہ مجبور تھے کہ باوجود ہر قسم استعداد کے خوانین کے بنائے ہوئے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہائش کریں۔ اس قسم کے مکانوں کو پشتو میں "کھنڈر" کہتے ہیں اور اس میں رہنے والے کو کرایہ دار نہیں بلکہ فقیر کہتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے مکانوں میں رہنے والے مالک مکان کو کئی ٹیکس ادا کرتے ہیں اور ان پر بیگار بھی مقرر ہوتی ہے کئی قسم کے ظالمانہ نذرانے۔ شادی بیاہ کی تقریبوں پر بھی مالک مکان اور علاقے کے خان کو دیئے جاتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں بادشاہ صاحب کی حکومت بننے کے بعد اس قسم کے تمام مظالم ختم ہوگئے۔ ان لوگوں کو مساویانہ شہری حقوق حاصل ہوگئے۔ موخرالذکر تجارت پیشہ طبقے کی زندگی تو آج کل خوشحالی اور فراغت کا نمونہ ہے اور بڑی مغرورانہ شان سے رہتے ہیں، حکومت سوات کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ ان سب لوگوں کو آپس میں برادرانہ اور مساویانہ

طرز کی زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھلائے اور ان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ کہ ہم سب مسلمان ہیں اور مسلمان سب بھائی بھائی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یہ عالی شان مکانوں میں رہتے ہیں۔ موٹر کاروں میں اڑتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ حکمران خاندان کے منصفانہ ذہنیت اور مومنانہ کردار کا نتیجہ ہے کہ سوات میں اب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔

شہروں کی وسعت اور رنگینی میں اضافہ ہو گیا اور ہو رہا ہے۔ آج سے چالیس سال پیشتر ایسی حالت کہاں تھی۔ اس خوبصورت اور پر فضا ماحول میں چند جابر خوانین نے بھیڑیوں کی طرح ہڑبونگ مچائی تھی اور بے چارے عوام بکریوں اور بھیڑوں کی طرح خوف زدہ اور ہراساں زندگی بسر کرتے تھے۔ کسی بھی خان کی ذرا سی ناراضگی۔ اس کے کسی کھنڈر میں رہنے والے بدنصیب فقیر کے لئے موت کا پیغام بن جاتی تھی۔

صاحبِ سوات

حکایتِ قدِ آں یار دلنواز کنم
بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

اخوند صاحبِ سوات انیسویں صدی کا رجلِ عظیم

ریاست سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں کوہ گیرا کے دامن میں میٹھے اور شفاف پانی کا ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ اسی چشمے کے متصل ایک عالی شان جامع مسجد ہے اور اسی مسجد کے صحن میں ایک خوبصورت حوض مختصر روضہ ہے۔ اسی روضے میں انیسویں صدی کے ایک عظیم انسان اور ملتِ اسلامیہ کے بہادر سپوت اپنے عہد کے شیر دل مجاہد اخوند صاحبِ سوات ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہ صاحبِ سوات کی آخری آرام گاہ ہے۔ سوات کی یہ مثالی ریاست بھی اس برگزیدہ انسان کی مخلصانہ جدوجہد اور بے لوث مصلحانہ زندگی کی ایک یادگار ہے،

- اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد،
- معاشرے کی اصلاح اسلامی اصولوں کی بنیاد پر،
- اسلام کے صحیح اصولوں کی ترویج اور اشاعت،
- غیر شرعی اور باطل رسومات کا خاتمہ،
- جہل اور بدعات کا انسداد،

انیسوین صدی کے عظیم بر گزید انسان
صاحب سوات کا مقبرہ سیدو شریف میں

و انگریزوں کے ساتھ جہاد اور پٹھان قوم میں جذبۂ جہاد کی بیداری یہ سب آپ کے زندۂ جاوید کارنامے ہیں۔ ریاست سوات کو اب بھی اسی مقدس انسان کی اولاد کی قیادت کا شرف حاصل ہے۔ یہ خوب صورت روضہ اب بھی اسّی لاکھ پٹھانوں کے لئے ایک مرکز عقیدت ہے۔

پیدائش اور وطن قومیت

صاحب سوات کا پیدائشی وطن سوات ہے۔ آپ کا اسم گرامی عبدالغفور تھا عوام الناس میں آپ اخوند صاحب سوات "صاحب سوات" "سید و بابا صاحب" کے ناموں سے مشہور تھے اور اب بھی ہیں۔ آپ کے والد کا نام عبدالواحد تھا۔ سوات کے علاقہ "شامیزی" کے ایک گاؤں موضع "جبڑی" میں آپ ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ قومیت کے لحاظ سے آپ صافی مہند ہیں۔ صافی کرلانی قبیلے کی ایک شاخ ہے جو کہ افغان قبائل میں ایک معزز قبیلہ ہے۔

بچپن اور تعلیم

اخوند صاحب کی طبیعت ابتدا ہی سے پاکبازانہ تھی۔ ایام طفولیت میں جس گائے کا دودھ پیتے تھے۔ اس گائے کو بھی آپ خود ہی رسی سے پکڑ کر چرایا کرتے تھے۔ محض اس خیال سے کہ اگر گائے کو چرنے کے لئے آزاد چھوڑا جائے تو کسی دوسرے شخص کے کھیت کا فصل کھا جائے گی۔ اس لئے آپ خود ہی اسے اپنی نگرانی میں چرایا کرتے تھے۔ غور کا مقام ہے کہ اس زمانے میں جب کہ سوات میں دوسروں کا مال ہضم کرنے کا سلسلہ عروج پر تھا۔ آپ کی تعلیم بھی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ بچپن کا زمانہ تھا جب آپ کی پاکبازی کا یہ عالم تھا تو پھر آگے چل کر کیا ہوگا۔

آپ کی عمر جب آٹھ سال کی ہوئی تو آپ نے "بڑ گولا" کے ایک مولوی صاحب سے ابتدائی تعلیم اور لکھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں سوات میں تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع نہیں تھے۔ نہ تو کوئی مدرسہ تھا اور نہ دار العلوم تھے۔ لہٰذا شائقین علم کو باہر جانا پڑتا موضع بڑ گولا میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ بھی تحصیل علم کے عظیم مقصد کے لئے وطن عزیز کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ سوات سے نکل کر آپ ضلع مردان کے ایک قصبہ "گوجر گڑھی" چلے آئے۔ گوجر گڑھی میں مولانا عبدالحکیم صاحب سے کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے ضلع پشاور کے بعض مقامات مثلاً چمکنی، زیارت کاکا صاحب وغیرہ میں

مشاہیر علماء سے آپ نے علمی استفادہ کیا۔ اوائل عمر ہی سے آپ کو علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی علوم کا بھی شوق تھا۔ جن دنوں آپ زیارت کاکا صاحب میں مقیم تھے تو آپ نے زیارت کی مسجد میں چلہ کشی کر کے روحانی فیض بھی حاصل کیا تھا۔

حضرت جی پشاوری کے حضور میں

علوم باطنی کے شوق میں آپ مرشد کامل کی تلاش میں پشاور روانہ ہوئے۔ ان ایام میں حضرت جی پشاوری سلسلہ نقشبندیہ کے ایک مشہور بزرگ تھے۔ چنانچہ آپ نے پشاور تک کا یہ سفر جلجلاتی دھوپ میں ننگے پاؤں طے کیا۔ اس سفر میں آپ نے بہت صعوبتیں برداشت کیں۔ حضرت جی پشاوری کے حضور میں پہنچکر آپ اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور دوسرے مریدوں کی طرح ذکر میں مشغول رہنے لگے۔ ایک دن ذکر کرتے ہوئے آپ وجد میں آئے اور آواز بلند ذکر کرنے لگے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں چونکہ آواز بلند ذکر کرنا منع ہے۔ اس لئے دوسرے مریدوں نے

جاکر حضرت جی سے آپ کی شکایت کی کہ سواتی بلند آواز سے ذکر کرتا ہے۔ حضرت جی ناراض ہوئے اور آپ کو بلا کر کہا کہ آپ پشاور سے چلے جائیں۔

مرشد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آپ نے پشاور کو چھوڑ دیا۔ اور نہایت غمگین اور اداس ہو کر پشاور سے روانہ ہوئے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اب ہندوستان جا کر ہی کسی مرشد کو تلاش کروں گا۔ اسی سوچ میں مگن جا رہے تھے کہ راستے میں ایک مولانا صاحب ملے۔ مولانا صاحب نے آپ کے حالات سے خبردار ہو کر آپ کو اپنے ساتھ روانہ کیا اور تورڈھیری میں مولانا محمد شعیب المعروف شیخ صاحب کے پاس لے گئے۔ شیخ صاحب ان دنوں سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ تھے۔ چنانچہ تورڈھیری میں آپ نے شیخ صاحب سے بیعت کی۔ شیخ صاحب نے بھی آپ کو زیادہ مخلص اور صادق پا کر زیادہ توجہ کی۔ لہذا بہت جلد آپ اسرار باطنی سے واقف ہو گئے اور پھر کافی عرصہ مرشد کی خدمت میں آپ تورڈھیری میں رہے۔ لیکن ۱۸۱۶ء میں جب شیخ صاحب فوت ہوئے تو آپ نے بھی تورڈھیری کو چھوڑ دیا۔

بیکی میں ریاضت کے بارہ سال

تورڈھیری کو چھوڑ کر آپ نے دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں "بیکی" میں سکونت اختیار کی۔ بیکی میں مسلسل بارہ سال تک آپ زہد و عبادت و ریاضت اور چلہ کشی میں مصروف رہے۔ آرام و آسائش کی چیزیں اور دنیاوی مسرت کے تمام سامان ترک کر چکے تھے۔ بارہ سال کے اس طویل عرصے میں آپ نے کبھی مرغن روٹی یا سالن وغیرہ نہیں کھائے۔ اس دوران میں آپ "شموخا" کی پکائی ہوئی روٹی استعمال کرتے رہے۔

واضح رہے کہ شموخا پشتو میں ایک بوٹی کو کہتے ہیں جو کہ ایک قسم کی گھاس ہے

اس بوٹے کے بیج "باجرے" کے دانوں جیسے ہوتے ہیں لیکن باجرے کے دانوں سے قدرے باریک ہوتے ہیں۔ اسی کو پیس کر پھر اس کے آٹے سے روٹی پکاتے ہیں۔ یہ روٹی بدذائقہ جیسی ہوتی ہے۔ مسلسل بارہ سال یہ بدذائقہ روٹی استعمال کرنا صاحب سوات کی مضبوط قوتِ ارادی کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ ریاضت کی دنیا میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے۔

ایک انگریز مصنف ڈاکٹر بلیو نے لکھا کہ:۔

"اُن دنوں صاحب سوات اخوند بیکی کے نام سے مشہور تھے اور طریقہ قادریہ کا مشہور سبق۔ انت الہادی انت الحق لیس الہادی الا ھُو کا ورد کیا کرتے تھے اور یہی آپ کا عقیدہ تھا۔ بیکی میں رہتے ہوئے آپ کے تقدس اور بزرگی کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا۔ ہزاروں عقیدت مند خدمت میں حاضر ہونے لگے اور لوگ قائل ہوتے گئے۔

بیکی سے نمل کو

۱۸۲۸ء میں بعض نامساعد حالات کی بنا پر آپ نے بیکی کو چھوڑ دیا۔ دریائے سندھ کے دوسرے کنارے آباد ایک گاؤں "نمل" میں مقیم ہوئے۔ نمل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پٹھان خوانین اور سید احمد صاحب بریلوی کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ غالباً انہی اختلافات سے بچنے کی خاطر آپ نے بیکی کو بھی چھوڑ دیا۔ نمل میں ہرات کے ایک مشہور عالم دین مولانا رسول شاہ صاحب سے آپ نے مزید علمی استفادہ بھی کیا۔

نمل سے سلیم خان ہیں اور اخوند کا اعزازی خطاب

نمل میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد موضع سلیم خاں کے باشندوں نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ سلیم خاں کو اپنے قیام کا شرف عطا کریں۔ چنانچہ ان لوگوں کے پیہم اصرار پر آپ نمل سے سلیم خان آ گئے۔ سلیم خاں میں آپ کی شہرت دن بدن بڑھتی گئی۔ اسی گاؤں میں عوام الناس نے آپ کو اخوند کا اعزازی خطاب بھی دیدیا۔

اخوند

واضح رہے کہ اخوند اگرچہ فارسی لفظ ہے لیکن پشتو زبان میں اخوند کے معنی بالکل وہی ہیں جو کہ انگریزی میں ڈاکٹر، یا عربی میں علامہ کے ہوتے ہیں۔ اخوند کا خطاب اس زمانے میں پٹھانوں کی طرف سے ہمیشہ اس نامور عالم دین کو دیا جاتا جو کہ نہ صرف بہت بڑا عالم دین ہو بلکہ ایک مجتہد فاضل بھی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے عقیدت مندوں نے آپ کو اخوند کا خطاب دیا۔ اگرچہ فی زمانہ اخوند کے معنی ملا کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ سوات کے ماحول میں اخوند درویزہ کے بعد پھر صاحب سوات کو ہی اخوند صاحب سوات کا خطاب ملا ہے۔ سلیم خاں میں آپ کے مریدوں اور معتقدین میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ اب آپ کی شہرت افغانستان تک پہنچ چکی تھی۔

سکھوں کے برخلاف میدان جہاد میں

۱۸۳۵ء میں امیر دوست محمد خان والئے کابل نے پشاور کے قریب شیخان کے مقام پر سکھوں کے برخلاف محاذ قائم کیا تو صاحب سوات

کے اثر و رسوخ اور عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے امیر نے صاحب سوات کو بھی سکھوں کے برخلاف جہاد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ آپ نے امیر کابل کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جانباز مجاہدین کے ایک دستے کے ساتھ محاذ جنگ پر پہنچ گئے اور امیر کے ساتھ مل کر جہاد میں حصہ لیا۔ فتح یقینی تھی۔ لیکن انگریزوں کی شرارت آمیز مداخلت کی وجہ سے امیر صاحب بددل ہو گئے اور نتیجے کا انتظار کئے بغیر ۱۱ مئی ۱۸۳۵ء کو درۂ خیبر کے راستے واپس کابل چلے گئے۔ اس کے بعد صاحب سوات بھی غم اور غصے کی حالت میں باجوڑ کے راستے سوات روانہ ہوئے۔ اسی جہاد میں شامل ہو کر آپ انگریزوں کے خطرناک ارادوں اور عیار ذہنیت سے واقف ہوئے کہ کس طرح یہ چالاک اور شرارتی قوم دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑا کر ہمیشہ اپنا مطلب حاصل کرتے ہیں۔ ہزاروں میل دور دراز کے جزیروں سے آئے ہوئے یہ مکار سوداگر کتنے خطرناک ہیں۔ ملت اسلامیہ کے یہ سب سے بڑے خطرناک دشمن کسی صورت میں بھی مسلمانوں کو معاف نہیں کرتے۔ یہ ہر قوم اور ہر مذہب کے عروج کو گوارہ کریں گے۔ لیکن یہ کبھی برداشت نہیں کرتے کہ دنیا میں پھر مسلمان طاقتور ہو جائیں۔

یہ وہ عیار ہیں کہ ہمیشہ دوستی کا لبادہ اوڑھ کر دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے بجز انگریز اور ہندو کے، یہ دونوں اپنے لئے بڑے با اصول اور منصف مزاج ہوں گے۔ لیکن دوسروں کے لئے ہمیشہ ظالم اور غاصب ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی دوستی دشمنی سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

چوبیس سال کے بعد اپنے عزیز وطن کو

ستمبر ۱۸۳۵ء میں صاحب سوات باجوڑ کے راستے سوات پہنچ گئے۔ چوبیس

سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ علاقہ شامیزی کے ایک گاؤں سے عبدالغفور نامی ایک ہونہار طالب علم تحصیل علم کے لئے سوات سے باہر مسافر بن کر گیا تھا اب چوبیس سال کے بعد وہی طالب علم، علم اور عرفان کے ایک سمندر کو سینے میں سمائے ہوئے ایک عظیم عالم برگزیدہ انسان اور بہادر مجاہد کی حیثیت سے سوات کی خوب صورت وادی میں واپس پہنچ گیا۔

؎ یہ رُتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

وادئ سوات میں پہنچکر آپ کچھ عرصہ ملوچ کی ایک مسجد میں رہے۔ اس عرصہ میں آپ کے والدین چل بسے تھے۔ ملوچ سے آپ زنگیلا چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ رہے تو پھر ھوڈی گرام کے قریب دامن کوہ میں غازی بابا کی زیارت میں مقیم ہو گئے۔ زیارت میں کچھ عرصہ زہد و عبادت میں گذارنے کے بعد آپ اسی پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیوں پر سے ہوتے ہوئے مرغزار پہنچ گئے۔ کوہ مرغزار کی چوٹی پر ایک غار کو صاف کر کے اس میں مقیم ہو گئے۔ ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے جب مرغزار کی غار میں آپ نے کچھ عرصہ بسر کیا تو سپل بانڈی کے میانگاں صاحبان کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور آپ کو موضع سپل بانڈی میں قیام کی دعوت دی چنانچہ اس مخلصانہ دعوت کو منظور کرتے ہوئے آپ مرغزار سے سپل بانڈی چلے آئے۔ اور سپل بانڈی میں مقیم ہو گئے۔

شادی خانہ آبادی

سپل بانڈی میں مقیم ہونے کے بعد جب کچھ عرصہ گزر گیا تو صاحب سوات نے سُنّتِ رسُول صلعم کی پیروی میں اسی گاؤں کی ایک پاکباز عفیفہ خاتون سے شادی کر لی۔ خاتون کا تعلق بھی خاندان سادات سے تھا۔ چنانچہ اسی محترم خاتون سے ہی

آپ کے دو فرزند عبدالحنان اور عبدالخالق پیدا ہوئے۔

۵

"ماہ سوے آسماں آید ہمے"

سیدو شریف میں آمد

۱۸۴۵ء میں اخوند صاحب سوات، سیل بانڈی کو چھوڑ کر دائمی سکونت کے لئے سیدو چلے آئے۔ کوہ گیرا کے دامن میں آباد اس چھوٹے سے خاموش شہر کی حیثیت تو اس وقت بس ایک چھوٹے سے گاؤں کی تھی۔ معمولی آبادی تھی۔ لیکن اب چونکہ اخوند صاحب اپنی زندگی کے عظیم مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر چکے تھے لہذا سیدو شریف میں سکونت دائمی اختیار کرنے کو موزوں خیال کیا۔ سوات اور متعلقہ علاقوں میں بسنے والوں کی اخلاقی حالت اس وقت خراب تھی۔ لہذا آپ نے اصلاح کے لئے میدان عمل میں آنے کی ضرورت محسوس کی۔ سیدو شریف میں ابتدا میں آپ نے محلہ میانگاں میں سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر پٹھانوں کے محلے میں آ گئے۔ یہاں آپ نے ایک رہائشی مکان بھی بنوایا، اور لنگر جاری کیا۔ معتقدین کی آمد و رفت دن بدن بڑھتی گئی۔ تو آپ نے محسوس کیا کہ یہ مقام بھی رہائش کے لئے موزوں نہیں ہے۔ لہذا آپ نے اسی مقام کو منتخب کیا کہ جہاں اب پانی کا چشمہ ہے۔ اسی جگہ آپ نے رہائش کے لئے ایک مکان، ایک مکان لنگر کے لئے، اور ایک مسجد تعمیر کرائے۔ اور یہی وہ مسجد ہے جو کہ آپ کی عظمت کی یادگار فن تعمیر اور خوبصورتی کے لحاظ سے پاکستان بھر کی چند ایک عالیشان مسجدوں میں سے ہے اور جسے بادشاہ صاحب باٹی ریاست سوات نے ہی تعمیر کرایا ہے۔ یہ خوب صورت مسجد سوات، دیر، چترال اور باجوڑ کے علاقوں

میں اپنی نظیر آپ ہے۔ سیدو شریف میں مقیم ہونے کے بعد آپ کی شہرت سابق صوبہ سرحد اور افغانستان کے حدود اور سرحدوں سے بھی آگے بڑھ کر ایران، عراق اور شام تک پہنچ گئی۔ دور دراز کے قبائلی علاقوں سے اب ہر قبیلے کے لوگ جوق در جوق سیدو شریف میں آنے لگے۔ نہایت قلیل عرصہ میں آپ نے سوات کو جہل اور بدعت کی الائشوں سے پاک کر دیا۔ علم و عرفان کے اس پاکیزہ دریا سے پٹھانوں کے ہر قبیلے کی کھیتیاں یکساں سیراب ہونے لگیں۔

اخلاقی اصلاح کا سلسلہ سوات میں شروع ہو گیا

سوات میں حکومت الٰہیہ

تجدید دین اور پٹھانوں کی اخلاقی اصلاح کے ساتھ ساتھ اخوند صاحب استبداد کے اس عالمگیر سیلاب کی تباہ کاریوں سے بھی غافل نہیں تھے — جو انگریزی حکومت کے روپ میں سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے اب آزاد قبائلی علاقے کی طرف بڑھتا آرہا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ تو اخوند صاحب کو سوات اور ملحقہ علاقوں کے بچاؤ کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ آزادی اور تہذیب کے تحفظ کی خاطر آپ نے ایک مضبوط شرعی حکومت قائم کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ چنانچہ مسلسل جدوجہد کے بعد آپ نے سوات اور بونیر کے عمائدین کا ایک اجلاس سیدو شریف میں طلب فرمایا۔ اس اجلاس میں دیر اور باجوڑ کے سرکردہ افراد بھی موجود تھے۔ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ کہ

آپ لوگوں کو آنے والے خطرات سے غافل نہیں ہونا چاہیئے
شرعی حکومت کا قیام ایک وقتی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک

قومی اور مذہبی فریضہ بھی ہے۔ برٹش اقتدار کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم منظم اور متحد ہو جائیں۔ ہمیں اپنے خانگی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر متحد ہونا چاہیئے اور دشمن کے مقابلے میں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننا چاہیئے۔ ان اغراض و مقاصد کے لئے ہمارے پاس شرعی حکومت سے عمدہ ذریعہ اور کوئی نہیں ہے جس کے ذریعے ہم متحد ہو کر اپنا تحفظ کر سکیں۔

یاد رکھو۔ اگر اس موقعے پر آپ لوگوں نے ذرا سی بھی غفلت ظاہر کی تو پھر غلامی مقدر ہو چکی ہے اور اس سیاہ دیو کا لقمہ بننے سے پھر ہم بچ نہیں سکتے۔ ہمیں اپنے اعمال اور کردار کو بالکل اسلامی سانچے میں ڈھالنا چاہیئے۔ خداوند کریم ہمارے ساتھ ہے"

آپ کی تقریر ایسی موثر اور کارگر ثابت ہوئی کہ یوسف زئی خوانین اور عمائدین خود شرعی حکومت کے قائم کرنے کے لئے متفق ہو گئے۔ خوانین اور سرکردہ افراد کے اتحاد اور اتفاق کے لئے مہینوں اور سالوں جس جد و جہد کی ضرورت تھی..... صاحب سوات کی ایک ہی بصیرت افروز تقریر سے وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

امیرِ شریعت کا انتخاب

امیرِ شریعت کے انتخاب کا مسئلہ پیچیدہ تھا۔ ان لوگوں نے اخوند صاحب سوات کو خود یہ منصب سنبھالنے کو کہا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ "عزیزو! میری جد و جہد اس مطلب کے لئے نہیں کہ میں خود امیر بن جاؤں۔" چنانچہ اس

مقصد کے لئے آپ نے ضلع ہزارہ کے موضع ستھانہ کے سید اکبر شاہ کا نام پیش کیا۔ سید اکبر شاہ سے بھی یہ لوگ واقف تھے۔ اس کی قابلیت اور خاندانی تقدس مسلمہ تھی۔ سید اکبر شاہ مشہور صوفی بزرگ سید علی شاہ ترمذی مشہور پیر بابا کی نسل سے متعلق تھے۔ نیز سید اکبر شاہ کے دادا سید زمان شاہ بھی اپنے وقت کے مشہور صوفی اور عابد تھے۔ خاندانی خصوصیات کے علاوہ خود سید اکبر شاہ کی شخصیت بھی قبائل میں جانی پہچانی تھی۔ سید اکبر شاہ کافی عرصہ سید احمد بریلوی کے معتمد خصوصی رہ چکے تھے، لہٰذا ایک مدبر سیاستدان بھی تھے۔ چنانچہ سید اکبر شاہ کو ہی امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ صاحب سوات نے خود سب سے اول سید اکبر شاہ کی بیعت کی۔ موضع غالیگی کو دارالخلافت قرار دیا گیا۔ اس طرح صاحب سوات کی جدوجہد میں سوات کی پہلی شرعی حکومت قائم ہو گئی۔

۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۶ء تک

سید اکبر شاہ کی حکومت

اب یہ امر واضح ہو گیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل وادی سوات میں انگریزوں کے برخلاف جہاد کرانے کے لئے تیاری شروع ہوئی اور سب سے اول صاحب سوات نے ہی اس کی ابتدا کی اور مطابق شریعت امیر کا مقرر کرنا اسی غرض کے لئے تھا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

سوات کی نئی حکومت کے پیش نظر دو اہم ترین مسئلے تھے۔ جہاد کی تیاری، اور دفاع کا استحکام۔ چنانچہ سید اکبر شاہ نے بھی اپنی تمام توجہ انہی امور کی طرف مبذول رکھی اور اپنی پوری قوت صرف کی۔ لیکن سوات کے لوگ جو کافی عرصہ سے

خود سرانہ اور غیر منظم زندگی گذارنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اب ان کے لئے حکومتی پابندیاں اور قانونی ضابطوں کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔

اس کے علاوہ سید اکبر شاہ نے یہ بھی غلطی کی کہ حکومت کے عہدے باہر کے لوگ مقرر کئے۔ فوج کے لئے سپاہی بھی اکثر غیر سواتی بھرتی کئے۔ باہر کے لوگ کچھ سختی بھی کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سات سال کے اندر سوات کی یہ پہلی شرعی حکومت ناکام ہو گئی

بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء میں سید اکبر شاہ بھی فوت ہو گئے۔ سوات کے لوگ حکومت سے بددل تو ہو چکے تھے۔ لہذا رہا سہا اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ ایک انگریز مصنف سر ہیربوٹ ایڈورڈ نے لکھا ہے۔ کہ

"اگر سوات کی شرعی حکومت اور مجاہدین قبائل کا سرغنہ سید اکبر شاہ زندہ ہوتے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔"

سید اکبر شاہ کے بعد اس کے بیٹے مبارک شاہ نے امیر بننے کی کوشش کی۔ لیکن قوم نے اسے امیر تسلیم نہ کیا۔ اخوند صاحب سوات کے فرزند عبد الحنان نے بھی امیر بننے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن خود اخوند صاحب نے اس کو منع کیا اور فرمایا۔ کہ

"منصب امارت کی عظیم ذمہ داریوں کو عزیز من تم نبھا نہ سکو گے لہذا میں تائید نہیں کروں گا۔"

چنانچہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے صرف ایک سال پہلے ۱۸۵۶ء میں سوات کی شرعی حکومت ختم ہو گئی۔

غزائے بُنیر ستمبر ۱۸۶۳ء

صاحب سوات کی زندگی کا عظیم کارنامہ

"مومن فقط اوامرِ حق کا غلام ہے"

سرحد اور پشاور پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے سوات اور بونیر پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے استحکام اور مضبوطی کی خاطر انگریزوں نے سرحد کے قبائلی علاقوں پر بھی قبضہ کرنا ضروری تصور کیا۔

"ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے مصنف ڈاکٹر ڈبلیو ہنٹر کے قول کے مطابق ہندوستان کی سرحد پر ایک باغی کیمپ" اور کیمپ میں رہنے والوں کا جذبۂ جہاد ہندوستان میں انگریزی حکومت کے استحکام میں بری طرح حائل ہو رہا تھا۔ چنانچہ باغی کیمپ سے مراد سرحدی آزاد قبائلی علاقہ تھا۔ انگریزوں کی کوشش یہی تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے پٹھانوں کے جذبۂ حریت کو کچل دیں۔ علاقہ بونیر کی وادی چملہ میں ملکا" ایک گاؤں ہے اور یہی گاؤں ہندوستانی مجاہدین کا صدر مقام تھا۔

عبداللہ نامی ایک شخص اُن دنوں مجاہدین کے امیر تھے ۱۸۶۳ء میں جب ضلع مردان کے جنوبی علاقوں میں انگریزی فوج نے نقل و حرکت شروع کی تو اسی امیر المجاہدین عبداللہ نے ضلع مردان کے سرکردہ خوانین کو خطوط لکھ کر اس خطرے سے خبردار کیا۔ مردان کے

جنوبی علاقوں میں انگریزی فوج کی نقل و حرکت بونیر پر چڑھائی کے لئے ابتدائی اقدام تھا۔ چنانچہ اس کے بعد بہت جلد یعنی ستمبر ۱۸۶۳ء میں انگریزی فوج کا ایک دستہ شکار کے بہانے سورکادی (ایک پہاڑ) کے دامن میں پہنچگیا اور بقول شاعر ؎

آلودہ کرد پنجۂ از خون عاشقاں
ایں طرفہ تر کہ بہر کہ نگارا بہانہ ساخت

انگریزوں نے عیاری سے کام لیا۔ لیکن انگریزی فوج کی نقل و حرکت اور سرحدات پر فوجی اجتماع کو اہالیان بونیر نے پٹھانوں کے جذبۂ آزادی اور عزت ملی کے لئے ایک چیلنج سمجھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے متحد ہو کر لڑنے کا ارادہ کیا اور ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا کہ جہاد میں شمولیت اور رہنماؤں کے لئے "صاحب سوات" کو دعوت دی جائے۔ اس غرض کے لئے اہالیان بونیر کا ایک نمائندہ وفد سیدو شریف میں اخوند صاحب سوات کے حضور میں حاضر ہوا۔ مجاہد اسلام صاحب سوات کی عمر اس وقت ستر سال کی تھی۔ باوجود کمزوری اور ضعیف العمری کے آپ نے بونیری وفد کی اس درخواست کو خندہ پیشانی کے ساتھ منظور کیا۔ چنانچہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو آپ تن تنہا سیدو شریف سے جہاد کے لئے روانہ ہوئے۔ سوات کی وادی میں فوراً یہ خبر پھیل گئی کہ اخوند صاحب جہاد کے لئے جا رہے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ جوق در جوق روانہ ہو کر اخوند صاحب کے ساتھ شامل ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو صاحب سوات چار ہزار پیادہ سرفروش غازیوں اور ایک سو بیس سواروں کے ایک دستے کے ساتھ محاذ جنگ "امبیلہ" کے مقام پر پہنچ گئے۔ اسی مقام پر آج ریاست سوات کی کسٹم چوکی ہے اور چوکی کے بالمقابل ایک خوب صورت ریسٹ ہاؤس اور مسجد یادگار بنی ہوئی ہیں۔ اسی مسجد میں صاحب سوات نماز پڑھتے تھے۔ امبیلہ کے محاذ پر امیر المجاہدین عبداللہ نوشہ مجاہدین

کے ساتھ پہلے سے ہی موجود تھے۔ چنانچہ فریقین نے تین مختلف گھاٹیوں پر مورچے قائم کئے۔ انگریزی فوج کے کمانڈر بریگیڈیر جنرل سر نیول چیمبرلین تھے۔ جس کے ساتھ سات ہزار مسلح فوج، توپ خانے، اور چار ہزار باربرداری کے جانور تھے۔ فریقین نے ایک دوسرے پر حملے شروع کئے۔ اخوند صاحب کی جہاد بونیر میں شمولیت کی خبر سنکر دیر اور باجوڑ کے آزاد قبائل بھی اپنے اپنے سرداروں کی سرکردگی میں کافی تعداد میں آآکر شامل جہاد ہوتے گئے۔ قبائلی مجاہدین کے اس شاندار اتحاد کو دیکھکر پشاور کے چیف کمشنر مسٹر جیمز اور جنرل چیمبرلین کے اوسان خطا ہو گئے، اب انہیں صاحب سوات کی عظیم شخصیت کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ مرکزی حکومت کو مزید کمک بھیجنے کے لئے تار پر تار دیئے جانے شروع ہوئے۔ پنجاب کے کونے کونے اور ہر چھاؤنی سے امدادی فوج اکٹھی کر کے محاذ جنگ پر روانہ کر دی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میانمیر چھاؤنی کے کمانڈر کو گورنر پنجاب کی حفاظت کے لئے چوبیس سپاہیوں کا ایک دستہ مہیا کرنا مشکل ہو گیا حتےٰ کہ وائسرائے ہند کی حفاظتی فوج کے کچھ دستوں کو بھی محاذ جنگ پر روانہ کر دیا گیا۔

جانباز مجاہدین انجام سے بے نیاز ہو کر پوری بے جگری اور مردانگی سے برٹش فوجوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ قبائلی ٹھانوں نے بے سروسامانی کے عالم میں گوریلا جنگ کے وہ جوہر دکھائے کہ انگریزوں کا فاتحانہ غرور خاک میں مل گیا۔ پہلے حملے میں برطانوی فوج کو جو تربیت یافتہ فوج تھی اور ہر قسم کے جدید اسلحہ سے لیس تھی ایسی منہ کی کھانی پڑی۔ کہ بقول ڈبلیو ہنٹر آگے بڑھنا ناممکن تھا اور پیچھے ہٹنا شکست سے بدتر۔

اخوند صاحب سوات ایک پہاڑی پر مقیم تھے۔ ساتھ ہی نماز کے لئے مسجد بنوائی تھی۔ جب نماز کا وقت ہوتا تھا تو مؤذن باقاعدہ اذان دیتا۔ محمود اور ایاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اس خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جس کی راہ میں توحید کے یہ متوالے سر کٹانے نکلے تھے۔

قبائلی پٹھان گوریلا جنگ لڑنے میں اس قدر ماہر تھے کہ دشمن کے بڑے بڑے فوجی ماہرین بھی داد دیئے بغیر رہ نہ سکے۔

انگریزی فوج کی تعداد تو اب دس ہزار سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ خدا کی شان دیکھئے کہ ایک طرف برطانیہ جیسی عظیم حکومت کی دس ہزار منظم اور تربیت یافتہ فوج۔ ہر قسم کے اسلحہ اور توپوں کے ساتھ آزمودہ کار فوجی کمانڈروں کی کمان میں لڑ رہی تھی اور دوسری طرف بے سروسامان مجاہدین تھے جن کے پاس دیسی ساخت کی رائفلیں لاٹھیاں، اور کلہاڑیاں تھیں۔ لیکن بایں ہمہ ۱۴ نومبر ۱۸۶۳ء تک یہ حالت ہو گئی کہ انگریزی فوج میں اب کھل کر لڑنے کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔

۲۰ نومبر ۱۸۶۳ء کو انگریزی فوج اور مجاہدین کے درمیان ایک خوں ریز معرکہ ہوا۔ جس میں انگریزی فوج کے کمانڈر اعلےٰ جنرل چیمبرلین خود بھی زخمی ہو گئے انہوں نے اپنے عہدے کا چارج میجر جنرل گاروک کو دے کر اپنے زخمی ہونے کو غنیمت سمجھ کر میدان کارزار سے نکل کر جرنیلی انگریزی ہسپتال کے آرام دہ بستر پر لیٹ گئے۔ اس معرکے میں چیمبرلین کے علاوہ انگریزوں کے اکیس دوسرے فوجی افسر اور چار سو پچیس سپاہی بھی زخمی ہو گئے۔

امبیلہ کی لڑائی انگریزوں کے خیال کے مطابق تو پندرہ نومبر ۱۸۶۳ء تک ختم ہو جانی چاہیئے۔ لیکن قبائل کے شاندار اتحاد اور مجاہدانہ عزائم نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ انہوں نے سمجھا تھا۔

۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء کو جب گورنر پنجاب نے فوجی افسروں سے استفسار کیا

کہ مجاھدین کے صدر مقام "ملکا" کی طرف کیا پیش قدمی ہو سکتی ہے یا نہیں تو اسے جواب ملا کہ فوجی طریقوں سے تو ناممکن نظر آتا ہے البتہ مکاری اور عیاری سے کام لینا پڑے گا۔ چنانچہ انگریزوں نے فریب کاری سے ہی کام لیا۔ انہوں نے بونیر والوں کے ساتھ ساز باز شروع کی۔

اب میں اس حقیقت کا اعتراف کروں گا کہ ہم ٹھانوں میں ہر دور میں ایسے لوگ بھی کچھ مل جاتے ہیں کہ جن کی غیرت ہمیشہ چاندی کے سکوں کے آگے دب جاتی ہے۔

بونیر کے سرکردہ خان زیداللہ خان نے چند عمائدین کو ساتھ ملا کر انگریزوں سے روپیہ بطور رشوت لے لیا۔ انگریز کمانڈر نے خوش ہو کر زیداللہ خان کو اپنا ذاتی پستول بھی بطور انعام دے دیا۔ زیداللہ خان اور اس کے ساتھیوں نے انگریزوں کے ساتھ یہ معاہدہ کر لیا کہ۔

"مجاھدین کے صدر مقام "ملکا" کو نذرِ آتش کرنے میں بونیر کے لوگ انگریزوں کا ساتھ دیں گے لیکن "ملکا" کو جلانے کے بعد انگریزی فوج پھر فوراً واپس ہو گی۔"

ملکا کو نذرِ آتش کرنے کا مطلب یہی تھا کہ انگریز افسران اس مہم کی ناکامی پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے تاکہ دنیا یہ سمجھے کہ فوج کشی کا مطلب گویا "ملکا" کو ہی نذرِ آتش کر دینا تھا۔ لیکن زیداللہ خان کی غداری کے باوجود انگریزوں کو اپنے اس مطلب میں بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ محاذ پر "صاحب سوات" موجود تھے۔ لہٰذا ان کی موجودگی میں زیداللہ خان جیسوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

پیرانہ سال مگر جواں ہمت مجاہد صاحب سوات کا

استقلال

گریزد از صفت ماہر کہ مرد غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلہ ما نیست

زید اللہ خاں کی غداری کے بعد دیر اور باجوڑ کے قبائل میدان جنگ سے واپس چلے گئے۔ دوسرے لوگ بھی بونیر والوں کی بے ایمانی سے بددل ہو کر واپس کھسکنے لگے۔ لیکن "صاحب سوات" کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہ آیا۔ حتےٰ کہ وہ بچا پوہ مؤذن بھی شہید ہو گیا۔

دیر اور باجوڑ کے قبائل کا میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سوات کا خان صحبت خاں جو صاحب سوات کے ساتھ جہاد میں شامل تھا۔ دیر اور باجوڑ کے خوانین عزن خان اور فیض طلب خان اپنے قبائل سمیت شامل جہاد تھے۔ لیکن یہ لوگ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شامل ہوئے تھے۔ اس لئے صحبت خان کا خیال تھا کہ فتح حاصل کرنے کی نیک نامی تو صرف انہی کا حصہ ہے۔ کیونکہ عزن خان وغیرہ تو بعد میں شامل ہوئے ہیں۔ اس لئے سوات کا یہ خان صحبت خاں ہی درپردہ ایسے حالات پیدا کر رہا تھا کہ باجوڑ اور دیر کے قبائلی بددل ہو کر واپس چلے جائیں، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ چلے بھی گئے۔

۲۰ دسمبر ۱۸۶۳ء کے بعد حالات کچھ خراب ہو گئے۔ بظاہر انگریزوں کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا۔ انگریزوں نے کئی بار اخوند صاحب سوات کو ہتھیار ڈالنے یا واپس جانے کے لئے کہا۔ پیغامات بھیجے۔ لیکن آپ نے ہر بار انکار کیا۔ اور فرماتے رہے۔ کہ

"ہم تو خُدا کی راہ میں جہاد کرنے نکلے
ہیں۔ لہٰذا شہید ہو جائیں گے۔ ہمارے لئے
شہادت سے زیادہ کوئی سعادت ہی نہیں
ہے۔ ہم ملک گیری یا دنیاوی مفاد کے لئے
نہیں لڑتے۔ اپنے وطن کی حفاظت اور اپنے
فطری حق آزادی کے تحفظ کے لئے لڑنا تو
ہمارا فرض ہے۔ خُدا ہمارے ساتھ ہے۔"

اخوند صاحب ایک چٹان پر مورچہ بنائے ہوئے اس میں تشریف فرما تھے، ۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو امبیلہ کے محاذ پر ہندوستانی مجاہدین اور چند عقیدتمند صاحب سوات کے گرد حلقہ باندھے ہوئے بے سروسامانی کے عالم میں لڑ رہے تھے۔ دوسری طرف اہالیان بونیر کی سرکردگی میں انگریزی فوج کا ایک دستہ پہاڑوں سے گزرتا ہوا ملکا کی طرف بڑھنے کی پیش قدمی کر رہا تھا۔ تاکہ اسے نذرِ آتش کریں۔ صبر و ایثار کے پیکر مجاہدین دیکھ رہے تھے کہ ان کے گھروں کو نذرِ آتش کرنے کے لئے بونیر والے انگریزی فوج لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس حال پر بھی شاکر تھے۔ انگریزی فوج سہ طرفہ محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ دوسری جانب سے انگریزی فوج کا ایک دستہ ایک انگریز کمانڈر کی سرکردگی میں مجاہد اعظم اور انیسویں صدی کے رجلِ عظیم صاحب سوات کو گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس موقعے پر انگریزی فوج کے کمانڈر اعلیٰ نے دوربین لگا کر جب پہاڑوں کی طرف دیکھا تو اسے مجاہدین کی تعداد ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ نظر آئی۔ جو کہ جھاڑیوں میں چھپے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انگریز کمانڈر نے اسے غازیوں کی ایک جنگی چال سمجھتے ہوئے اپنی فوج کو فوراً واپسی کا

حکم دیا چنانچہ پیش قدمی کرنے والے دونوں دستے واپس ہوئے۔

انگریز جرنیل نے صاحب سوات کی خدمت میں فوراً صلح کے لئے درخواست کی۔ صاحب سوات نے صلح کی درخواست اس شرط پر منظور کی کہ انگریزی فوج کے صرف چند سپاہی جاکر ملکا میں گاؤں سے باہر صرف ایک کوٹھے کو آگ لگاکر واپس ہوجائیں، چنانچہ انہی شرائط کو منظور کرکے انگریزوں نے صلح کرلی۔

۲۷ دسمبر ۱۸۶۳ء کو انگریزی فوج کے چند سپاہی" ملکا گئے اور گاؤں سے باہر ہی ایک کوٹھے کو آگ لگاکر واپس چلے گئے۔

صاحب سوات کے مجاہدانہ استقلال اور سرفروشی کے مضبوط عزائم نے انگریزی فوج کو سوات اور بونیر کی سرحدوں سے نامراد اور شکست خوردہ حالت میں واپس چلے جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ انگریزوں کی اس فوج کشی کا واضح مطلب یہی تھا کہ سوات اور بونیر پر قبضہ کرلیں۔

۲۸ دسمبر ۱۸۶۳ء کو انگریزی فوج امبیلہ کے محاذ سے واپس چلی گئی۔ انگریز کمانڈروں نے جاتے ہوئے ایک بار پھر سوات اور بونیر کے ان پہاڑوں کی طرف دیکھا کہ جن کی چوٹیوں پر اور دامنوں میں انگریز اپنے لئے بنگلے تعمیر کروانے کی امیدیں ساتھ لائے تھے۔ لیکن سوات اور بونیر کے بلند و بالا پہاڑ سینہ تان کر یوں کھڑے تھے کہ جیسے چاق و چوبند سپاہی اپنی ڈیوٹی پر مستعد کھڑے ہوتے ہیں۔

تمام ہندوستان کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے انگریزی سیلاب کی موجیں ان پہاڑوں کے دامنوں سے ٹکرا کر شرمندہ سی واپس ہو رہی تھیں اور جب برطانوی فوج کا آخری سپاہی اپنا بوریا اور بستر اٹھا کر بونیر کی سرحد سے رخصت ہوگیا۔ تو

آج یہاں تک پڑھا

انیسویں صدی کے یہ شیر دل مجاہد صاحبِ سوات بھی امبیلہ کے محاذ سے واپس سیدو شریف چلے آئے۔ اس جہاد کا تاریخی نام "غزائے بنیر" قرار دیا گیا۔

امبیلہ کی اس لڑائی کے بعد انگریزوں کو پھر بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ سوات اور بونیر کی تسخیر کے لئے فوج کشی کریں۔ اس خوب صورت دیس کو انگریز کی غلامی سے آزاد رہنے کا فخر ہمیشہ کے لئے انگریزی حکومت کے تسلط سالہ دور میں حاصل رہا۔

آج سوات جن حقیقی نعمتوں سے بہرہ ور ہے یہاں کے لاکھوں عوام اگر حقیقی قیادت کی مسرتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں تو یہ سب کچھ نتائج ہیں۔ اس مجاہدانہ جدوجہد کے جو کہ ۱۸۶۳ء میں امبیلہ کے محاذ پر صاحب سوات نے کی تھی خدانخواستہ اگر ان علاقوں پر انگریز قابض ہو جاتے تو خدا جانے کیا حالت ہوتی۔ اس لئے یہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ صاحب سوات کی زندگی کا عظیم کارنامہ ہی یہی غزائے بنیر ہے اور ان کی برگزیدگی اور بزرگانہ عظمت کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ انگریز جیسی جابر اور طاقت ور قوت کو اس محاذ پر ایک ہی ضربِ غازیانہ سے ایسے مجروح کیا کہ عمر بھر کے لئے سوات اور بونیر اس کے ساتھ ملحقہ دوسرے قبائلی علاقے انگریزی تاراج سے محفوظ رہ گئے۔ اس قبائلی علاقے کی آزادی اور خود مختاری کا باعث ہی صاحبِ سوات کی جامع الصفات شخصیت تھی۔ اگرچہ فوج اگرچہ نامراد واپس ہوئی۔ لیکن بونیر والوں کی غداری کی وجہ سے صاحب سوات ان سے کچھ افسردہ خاطر ہو گئے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر بونیر والے غداری نہ کرتے تو انگریزوں کا انجام کچھ اور ہوتا۔

غدار کا انجام

بونیر کے عوام تو بیچارے بے قصور تھے۔ اس لئے بونیر کے پٹھانوں کو احساس تھا کہ زید اللہ خاں اور اس کے چند حمایتی خوانین نے ذاتی مفاد کی خاطر بونیر کے قومی اور علاقائی ناموں کو رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہذا زید اللہ خان کے برخلاف ان کے دلوں میں نفرت اور حقارت پیدا ہو گئی۔ ان حالات میں قوم کا مشتعل ہونا لازمی امر تھا۔ اور پھر قومی غدار کے لئے جو سزا مقرر ہے وہی سزا زید اللہ خاں کو بھی دی گئی۔ غزائے بونیر میں زید اللہ خاں کی غداری نہ صرف یہ کہ قوم اور وطن کے ساتھ غداری تھی بلکہ یہ غداری خدا اور رسول صلعم اور خدا کے ایک برگزیدہ انسان کے ساتھ بھی غداری تھی۔ اگر خدا نخواستہ زید اللہ خاں کے منصوبوں کے مطابق انگریزوں کو اس محاذ پر کامیابی حاصل ہوتی تو پھر صورت حال یقیناً مختلف ہوتی، لہذا زید اللہ خاں کے برخلاف بونیر کے عوام کا اشتعال بجا تھا۔ آخر کار ۱۲ر اگست ۱۹۶۸ء کو لوٹ مار کے ایک نئے جرم کے پاداش میں چند محبان قوم و ملت نے زید اللہ خاں کا کام اسی پستول سے تمام کر دیا جو کہ انگریزی کمانڈر کی طرف سے اسے بطور انعام ملا تھا۔

"ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے مصنف ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے لکھا ہے کہ امبیلہ کی لڑائی میں انگریزوں کی ناکامی کی تین وجوہات تھیں۔

(۱) صاحب سوات کی جہاد میں بذات خود شمولیت

(۲) قبائل کا شاندار اتحاد اور شجاعت

(۳) ذمہ دار انگریز حاکم کی غیر موجودگی۔

غزائے بونیر میں طرفین کے نقصانات کا اندازہ مندرجہ ذیل ہے:۔

(۱) برٹش فوج کے ایک ہزار سپاہی اور چودہ برطانوی افسر ہلاک ہوئے۔
(۲) تقریباً تین ہزار مجاہدین شہید ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے پاس توپیں تھیں۔ زیادہ مجاہدین توپوں کی گولہ باری سے شہید ہوئے، لیکن تین ہزار ان جانثار مجاہدین نے شربتِ شہادت نوش کر کے انگریزوں پر بقول ڈبلیو ہنٹر یہ حقیقت واضح کر دی — کہ سوات اور بونیر کے علاقوں پر چڑھائی کرنے کا مطلب دنیا کے پچاس ہزار بہادر اور جنگجو سپاہیوں کو دعوتِ پیکار دینے کے مترادف ہے۔

جہاد بونیر میں صاحبِ سوات کے استقلال کا ایک واقعہ

۲۰ دسمبر ۱۸۶۳ء کے بعد جب کہ دیر اور باجوڑ کے قبائل میدان جنگ سے جا چکے تھے۔ انگریزوں کا پلہ بظاہر بھاری نظر آ رہا تھا۔

صاحب سوات جہاد میں مصروف تھے۔ لڑنے والوں کی ایک جماعت ساتھ تھی۔ انگریزی فوج چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ حالات مخدوش تھے، خوانین سوات میں سے کسی نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اس وقت مقابلہ چھوڑ کر جانا چاہیئے اور اپنی قوت بڑھا کر اگلے سال حملہ کریں گے

آپ کا وجود بہرحال ہمارے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ جس کی حفاظت فرض ہے۔ خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ نقصان پہنچ جائے تو پھر سوات میں آپ کا نعم البدل پیدا ہونا مشکل ہے اور یہ نقصان ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔ پیرانہ سال مگر جواں ہمت اس مجاہد درویش نے مسکرا کر جواب دیا — کہ

کوئی بات نہیں اگر آج میری موت مقدر ہو چکی ہے
تو یہ چٹان میری قبر سہی۔ لیکن موت کے خوف
سے بھاگنا یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا جب کہ مسلمان
کے لئے شہادت سے بڑھ کر عظمت اور
سعادت کوئی نہیں ہے۔ لہذا جو کچھ بھی ہو ہم مقابلہ
کریں گے۔

یا سرخرو نظر آ اس رزم گاہِ غم میں
یا اپنے خونِ دل سے خود لالہ زار ہو جا

غزائے بونیر کے بعد بھی صاحب سوات صوبہ سرحد اور ملحقہ علاقوں کو انگریزی تسلط سے آزاد کرانے کی مہم سے غافل نہیں تھے۔ لیکن اس کے لئے مکمل تیاریوں کی ضرورت تھی۔ لہذا ان ہی تیاریوں میں آپ مصروف تھے کہ عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ ایک معین عرصہ تک مذکورہ علاقے انگریزی تصرف میں رہیں۔

۱۸۷۶ء میں صاحب سوات کے دربار میں سفیر کابل کی آمد

۱۸۷۶ء میں والئے کابل امیر شیر علی خاں نے جلال آباد کے حاکم احمد خاں اسحاق زئی کو سفیر بنا کر چالیس سواروں کے ہمراہ اسے صاحب سوات کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے سیدو شریف روانہ کیا۔ سفیر کابل باجوڑ کے راستے سیدو پہنچ گیا احمد خاں سفیر نے صاحب سوات کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ امیر شیر علی خاں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ اس کے حق میں دعا کریں۔ کہ خداوند کریم اُسے اپنے مقاصد میں کامیاب کر دے،

اخوند صاحب نے سفیر سے کہا کہ امیر علی خان انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا نہیں چاہتا۔ البتہ انگریزوں کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی فکر میں دن رات مگن رہتا ہے لیکن سفیر کا اصرار تھا کہ امیر کابل کے خیالات میں اب انقلاب آیا ہے۔ وہ انگریزوں کو ہند سے نکالنے کے عزائم میں صادق ہے اس لئے میں تو سیدو سے تب جاؤں گا کہ اس کے حق میں آپ دعا کریں۔ ورنہ سیدو میں ہی میری قبر بنی ہوگی۔

اس کے بعد صاحب سوات نے سفیر سے کہا کہ بہت اچھا آپ واپس جاکر شیر علیخاں سے کہہ دیں کہ۔

سوات کا اخوند صرف دعاگو فقیر ہی نہیں ہے بلکہ ایک سرفروش غازی بھی ہے۔ میدان جنگ میں لڑنا بھی جانتا ہے اگر امیر واقعی انگریزوں کے ساتھ لڑنا چاہتا ہے تو خیبر کے راستے پشاور پر حملہ کردے۔ میں یہاں سے مالاکنڈ کے راستے پہنچکر جہاد میں شامل ہو جاؤں گا۔" چنانچہ سفیر کابل یہ پیغام لے کر رخصت ہو گئے اور اخوند صاحب سوات میں جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اب کے بار آپ نے لوگوں سے کہا کہ "کھدر" کے خیمے بھی کافی تعداد میں بنوائیں۔ چنانچہ سوات میں ایک بار پھر انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اہالیان بونیر نے بھی حاضر ہو کر صاحب سوات کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور جہاد میں شامل ہونے کی استدعا کی۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ۔ تم میں اب بھی بعض لوگوں نے انگریزوں سے روپیہ لیا ہے تاہم میں آپ لوگوں کو ایک موقعہ دینا چاہتا ہوں اور وہ موقع یہ ہے کہ آپ لوگ بونیر کی سرحدوں پر نقل و

حرکت شروع کردیں تاکہ انگریزوں کو یقین ہو جائے کہ ان کا روپیہ بے کار گیا ہے۔

یہ لوگ جب سرحد پر پہنچے تو ضلع مردان کے ایک قصبے "رستم" کے بازار کو لوٹ لیا۔

انگریزی حکومت کا احتجاج

بونیر کے لوگوں نے جب رستم کے بازار کو لوٹا تو صاحب سوات کو اس حرکت سے کافی صدمہ پہنچا۔ فرمایا کہ ان کم بختوں نے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو لوٹ کر بہت برا کیا ہے۔

پشاور کے چیف کمشنر نے مولوی اللہ داد کو اخوند صاحب کی خدمت میں بھیجکر یہ شکایت کی کہ "امبیلہ کے مقام پر معاہدہ صلح کے باوجود بونیر والوں نے انگریزی علاقے میں مداخلت کیوں کی ہے۔ اخوند صاحب نے فرمایا کہ"

"میں نے انگریزوں کے ساتھ لڑائی نہ کرنے کا تو کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے۔ یہ تو اپنے اپنے بس کی بات ہے۔ ہمارا بس چلے تو ہم آج ہی انگریزوں کو پشاور سے نکال دیں۔ البتہ بونیر والوں نے رستم کے بازار کو جو لوٹا ہے۔ یہ برا کیا ہے اس کے متعلق ہمیں خود افسوس ہے کیونکہ لوٹ مار کے فعل کو ہم ہرگز پسندیدہ نہیں سمجھتے۔"

مولوی اللہ داد نے تحریری جواب لکھنے پر اصرار کیا۔ تو آپ نے اپنے کاتب کو بلاکر جواب لکھنے کی ہدایت کی۔ لیکن خط بغیر کسی القاب و آداب کے خود ہی ان جملوں سے شروع کیا۔ "بکافۂ انام و حکام آں ولایت۔" بقایا خط کاتب نے مکمل کرکے مولوی مذکور کے حوالے کیا۔

اس اثنا میں جب کہ آپ جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کا پیغام پہنچ گیا۔ چنانچہ ۱۲ر جنوری ۱۸۷۷ء مطابق سات محرم ۱۲۹۵ھ بروز شنبہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ زہد و شجاعت کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ؎

ہوگا کسی فلک پہ وہ خورشید جلوہ گر
کہتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

انیسویں صدی کے اس برگزیدہ اور عظیم انسان نے چوراسی سال کی عمر میں دنیا سے رحلت کی۔

شبیہ مبارک:۔

کھلا ہوا روشن چہرہ، سفید ڈاڑھی، رنگ عبادت اور دائمی ریاضت کی وجہ سے زرد، قد درمیانہ، بارعب چہرہ۔

لباس

صاحب سوانح کا لباس سادہ ہوا کرتا تھا۔ ہمیشہ آپ ملکی کھدر استعمال کرتے تھے۔ سفید کھدر کی قمیص اور شلوار، سفید عمامہ اور کوہاٹی چادر۔ بس یہی آپ کا لباس تھا۔

خوراک اور تقوٰے

لذیز اور مرغن غذائیں آپ نے کبھی استعمال نہیں کی ہیں۔ ہمیشہ کے لئے جو کی روٹی[1] اور قہوہ اور چائے بطور غذا استعمال کرتے تھے اور سبکی میں میں مسلسل بارہ سال تک شوخے استعمال کرتے تھے۔ مسلسل بارہ سال شوخے[1]

---

[1] ایک بوٹی

جیسی بے ذائقہ بوٹی کا استعمال بجائے خود وہ عظیم کارنامہ ہے کہ ریاضت کی دنیا میں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اور شاید اس قدر مضبوط قوت ارادی کا مظاہرہ کسی نے کیا ہو۔ آپ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے وعظ اور تبلیغ کے لئے مخصوص اوقات میں عام مجلس میں بیٹھ کر گفتگو کرتے تھے۔ تصوف کے تین بنیادی اصول۔ کم خوردن، کم گفتن، کم خفتن پر آپ زندگی بھر عمل پیرا رہے۔

صاحب سوات کی زندگی کے مقاصد

صاحب سوات کی زندگی کے مقاصد ذیل تھے۔

۱۔ تجدید دین اسلام اور پٹھانوں کی اخلاقی اصلاح۔
۲۔ جہل بدعات اور باطل رسومات کا انسداد
۳۔ سوات اور بونیر کے لئے حکومت الٰہیہ کا قیام
۴۔ سوات اور بونیر کو انگریزی سیلاب سے بچانا۔
۵۔ صوبہ سرحد کو انگریزی تسلط سے آزاد کرانا۔

اس میں شک نہیں کہ آپ زندگی کے مذکورہ اول چار مقاصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ موخر الذکر کی تکمیل کے لئے تیاریوں میں مصروف ہی تھے کہ دنیا سے کوچ کرنے کا وقت آگیا اور اگر زندگی وفا کرتی تو آپ امیر شیر علی خاں سے مل کر انگریزوں کے ساتھ جہاد کرنے والے تھے۔

تجہیز و تکفین

صدیوں کے بعد کہیں جا کر سوات کے خوبصورت دیس میں ایک ایسا عظیم اور

برگزیدہ انسان پیدا ہوا تھا۔ جسے اپنے کردار اور تقدس سے وادیٔ سوات کو تمام سرحدی علاقوں کے لئے ایک محترم علاقہ بنادیا۔ سوات کی نیک نامی میں اضافہ کیا اور پھر ان لوگوں کو جو کہ راہ شریعت سے دور جا چکے تھے۔ پھر اہل شریعت بنایا۔ ان کی اخلاقی اصلاح کر کے انہیں صالحانہ زندگی کے فوائد اور نتائج سے روشناس کرایا۔ وہ مقدس انسان جو صرف ایک خاندان کا ہی نہیں سارے دیس اور سب قوم کا عزیز تھا اب ہمیشہ کے لئے جدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی جدائی ان لوگوں اور اس ماحول پر کس قدر شاق گزری ہوگی۔ صاحب سوات کی وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی اتنی خلقت سیدو شریف میں جمع ہوئی کہ معتقدین کے لئے خلوت سے جنازہ نکالنا مشکل ہوگیا۔ مسجد اور ارد گرد کے علاقے میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ ایک مرید نے باآواز بلند لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ نماز جنازہ سیدو شریف سے باہر پڑھی جائے گی۔ آپ لوگ وہاں پہنچیں۔ جب اس طریقے سے نصف کے قریب لوگ مسجد سے نکلے۔ تب کہیں جا کر مریدوں کو جنازہ نکالنے کا موقعہ ملا۔ خلوت کے صحن میں آپ کی وصیت کے مطابق قبر تیار ہو چکی تھی۔ مولانا ابوبکر صاحب نے نماز پڑھائی۔ اس کے بعد آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ سوات کی رنگین فضاؤں پر اداسی کے بادل چھا گئے۔ اس طرح یہ دیس اور اس میں بسنے والی قوم کے لوگ ایک عظیم برگزیدہ انسان کی رہنمائی سے کچھ عرصہ کے لئے بظاہر محروم ہو گئے۔

صاحب سوات کی شخصیت ایک آفتاب جیسی تھی جس کی شعاعوں سے نہ صرف سوات بلکہ صوبہ سرحد اور قبائلی ماحول کے تمام علاقے یکساں منور ہو رہے تھے اور شاید ہی پٹھان قوم پر کسی برگزیدہ شخصیت کا اتنا اثر رہا ہو۔ جتنا کہ صاحب سوات کا نمایاں اثر اب بھی قائم ہے۔

سیدو میں آپ کی آخری آرام گاہ آج بھی پٹھان قوم کے ہر قبیلے کا مرکز عقیدت ہے اور ہر سال موسم بہار میں ہزاروں افراد زیارت کے لئے آتے ہیں۔

اخوند صاحب سوات کا ادبی ذوق

صاحب سوات کو پشتو کے مشہور صوفی شاعر عبدالرحمان بابا کا کلام بہت پسند تھا۔ اس کے بعد سوات کے علاقہ غور بند کے حافظ اپسوری کا کلام پسند فرماتے تھے۔ ان دونوں شعراء کو آسمان ادب کے شمس و قمر کہا کرتے تھے ایک روایت کے مطابق آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر قرآن کریم کے سوا کسی دوسرے کلام میں بھی نماز پڑھنا جائز ہوتا تو یقیناً ہم رحمان بابا صاحب کے کلام میں ہی نماز پڑھتے۔ کہتے ہیں کہ آپ کو رحمان بابا صاحب کا کلام یاد بھی تھا۔

صاحب سوات کے مرید

روحانی اصلاح اور تنظیم کے لئے آپ نے مختلف علاقوں میں "ماذون" (امیر) مقرر کئے تھے جو کہ اخوند صاحب سوات کے خصوصی مرید تھے اور جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:۔

(۱)	عبدالرحیم صاحب سہارن پور	(یو۔ پی ہندوستان)
(۲)	قاضی صاحب گجرات	صوبہ پنجاب سابق
(۳)	حضرو میاں صاحب۔ حضرو۔	ضلع کیمبل پور سابق پنجاب
(۴)	چپری ملا صاحب	علاقہ تیراہ قبائلی علاقہ
(۵)	ملا صاحب کربوغہ	ضلع کوہاٹ
(۶)	ملا نجم الدین المعروف حدے ملا صاحب	افغانستان

(۷) ملا عبدالوہاب مانکی ملا صاحب۔ ضلع پشاور (مانکی)
(۸) محمود ملا صاحب۔ جنوبی وزیرستان
(۹) شاہ بابا صاحب۔ علاقہ دیر
(۱۰) پالام بابا صاحب۔ علاقہ دیر
(۱۱) سٹوما ملا صاحب۔ تحصیل صوابی

مذکورہ حضرات آپ کے پروگرام کے مطابق ان مذکورہ علاقوں میں سرگرم عمل تھے۔

صاحبِ سوات کی شخصیت

ہر دور میں زمانے کے اللہ کے بندے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کی عقیدت اور محبت کا مرکز ہوتا ہے۔ صاحب سوات کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان کی شخصیت اخلاق حسنہ اور اسلامی تعلیمات کی آئینہ دار تھی۔ حتےٰ کہ مخالف انگریزوں نے بھی مختلف تصانیف میں آپ کی عظیم شخصیت کا اعتراف کیا ہے۔ "ڈاکٹر بلیو" ایک انگریز محقق نے لکھا ہے کہ

"اخوند صاحب سوات کی شخصیت صرف پٹھانوں کے لئے ہی محترم نہیں تھی بلکہ افغانستان اور عرب علاقوں میں بھی آپ کے معتقدین ہزاروں تھے۔ چنانچہ مضافات موصل میں صرف اخوند صاحب کے معتقدین ایک ہزار سے زیادہ تھے

علامہ جمال الدین افغانی نے اپنی تصنیف "البیان فی تاریخ افغانستان" میں لکھا ہے کہ

"اخوند صاحب سوات کا شمار عالم اسلام کی برگزیدہ ہستیوں میں

ہے۔ آپ کے فتوے مستند ہوا کرتے تھے اور آپ کا
شمار ان عظیم انسانوں میں ہوتا ہے کہ جن کے متعلق کہا گیا ہے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آپ صرف گوشہ نشین زاہد ہی نہیں تھے بلکہ انیسویں صدی کے عظیم حریت پسند مجاہد، صاحب بصیرت، سیاستدان۔ عالم اسلام کے نامور عالم۔ اور مجدد دین۔ اور میدان جہاد میں غازیوں کے ایک سرفروش رہنما بھی تھے۔ قطع نظر اس بات کے کہ آپ صاحب کرامات ولی اور غوث زماں تھے۔ صاحب سوات انیسویں صدی کے عظیم دانشور بھی تھے۔ آپ کی سب پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہو چکی ہیں۔ صاحب سوات کی عظیم شخصیت کے متعلق ایک واقعہ بطور تائید بیان کیا جاتا ہے۔

سردار محمد اعظم کی آمد سیدو شریف میں

نہ تاج و تخت میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

(اقبالؒ)

سردار محمد اعظم خان تخت کابل کے ایک دعویدار تھے اور امیر عبدالرحمان کے چچا تھے۔ امیر شیر علی خان کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ تو دعا کے لئے سیدو شریف میں اخوند صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ دن تو سیدو میں رہے پھر دعا کے لئے استدعا کی اور رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ آپ نے اسے کھدر کی ایک چادر دیتے ہوئے فرمایا۔ کہ

جاؤ مگر اپنی زندگی شریعت کے سانچے میں ڈھالو۔ بندگانِ
خدا کی خدمت راستی سے کرو۔ انسان کو حقیر مت سمجھو
انشاء اللہ فتح تمہاری ہوگی،

سردار محمد اعظم خاں جب بیدو شریف سے روانہ ہوئے تو کسی نے ان سے اخوند صاحب سوات کی شخصیت کے متعلق سوال کیا تو سردار صاحب نے کہا۔ کہ

اخوند صاحب خدا کے برگزیدہ ولی اور محترم انسان تو ہیں،
لیکن اس کے ساتھ ہی بہت بڑے سیاستدان اور مدبر بھی
ہیں۔ ایک عظیم دانشور کی حیثیت سے اخوند صاحب اس کے
لائق ہیں کہ کسی بڑی حکومت کے وزیر اعظم بنیں لیکن اخوند صاحب
کو دنیاوی اقتدار کی کوئی خواہش نہیں۔"

وزیر اعظم سے مراد یہی کہ اخوند صاحب کی سیاسی بصیرت اور خداداد ذہانت گویا قابل تعریف ہے اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ سردار محمد اعظم خان نے آپ کے ساتھ افغانستان کی وزارت عظمے کے متعلق گفتگو کی ہو اور آپ نے انکار کیا ہو۔ اس لئے کہ سردار محمد اعظم خاں کے خیالات ابتدا میں تو بہت اچھے تھے۔ علامہ جمال الدین افغانی جیسا مدبر وزیر اعظم اسی امیر کے ہاتھ آیا تھا۔ لیکن حکومت کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ محمد اعظم خاں بھی امیر بننے کے بعد بہک گیا۔

سردار محمد اعظم خاں کے متعلق پیشین گوئی

محمد اعظم خاں جب سوات سے رخصت ہو کر حدود کابل میں داخل ہوئے تو افغانستان کے حالات بدل چکے تھے۔ امیر عبدالرحمان نے شیر علی خاں کو شکست دے کر تخت کابل پر قبضہ کیا تھا۔ اور جب اسے اپنے چچا اعظم خان کی آمد کی اطلاع ملی

تو اس نے شاہانہ استقبال کی تیاری کی۔ شہر کابل کو آراستہ کیا اور خود امیر عبدالرحمان اکابرین سلطنت کے ہمراہ اپنے چچا کے استقبال کے لئے کابل سے باہر آیا۔ چچا اور بھتیجہ دونوں بغل گیر ہوئے۔ امیر عبدالرحمان نے کہا کہ تخت کابل آپ کا منتظر ہے۔ آپ میرے بزرگ ہیں اور میں نے جو کچھ کیا ہے، آپ کے لئے کیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد محمد اعظم خان اپنی زندگی شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے عہد کو نبھا نہ سکا۔ بہت جلد اس نے "طاؤس و رباب اول" والا مشغلہ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ استحکام حکومت سے غافل ہو گیا۔ شیر علی خان کو تاک میں بیٹھا تھا اس نے دوبارہ کابل پر حملہ کر کے اعظم خاں کو ایران کی طرف بھگا دیا اعظم خاں ایران میں ہی پھر کس مپرسی کے عالم میں مر گیا

لنگر اور مالی حیثیت

ریاضتوں اور چلہ کشیوں کے باوجود آپ رہبانیت کے خلاف تھے، زندگی کے صحیح معاشی اصولوں کو آپ نے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہی وجہ تھی کہ گوشہ نشین فقیر ہونے کے باوجود سوات میں آپ کی کافی جائداد تھی۔ سینکڑوں گائیں اور بھینسیں رکھی ہوئی تھیں۔ آپ کے معتقدین چونکہ لاکھوں تھے۔ اس لئے سیدو شریف نے ایک مرکز روحانیت کی شکل اختیار کی تھی۔ روزانہ سینکڑوں افراد آتے جاتے تھے۔ سوات سے باہر ضلع مردان میں لوند خوڑ وغیرہ مقامات میں بھی آپ کی جائداد تھی۔ سیدو شریف میں آپ نے مہمانوں کے قیام و طعام کے لئے لنگر جاری کیا تھا۔ اس لنگر میں روزانہ پانچسو آدمیوں کے طعام کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ غربا اور مساکین کو بھی اس لنگر سے کھانا ملتا تھا اس لنگر کے اخراجات زیادہ تر "صاحب سوات" کی ذاتی جائداد کی آمدن سے پورے

کئے جاتے تھے۔ چنانچہ صاحب سوات کی ذاتی جائداد اور اس کی آمدن ابتدا سے انسانیت کی اصلاح اور بھلائی کی راہ میں ہونے والے اخراجات کا ایک وسیلہ رہی۔ چنانچہ یہی جائداد تھی جس کی آمدن پٹھان قوم کی اصلاح میں صرف ہوتی رہی۔ اسی جائداد کی آمدن انگریزوں کے برخلاف جہاد اور تحفظ سوات میں صرف ہوئی اور پھر یہی جائداد تو تھی جس کی آمدن کے ذریعے صاحبِ سوات کے پوتے بانیٔ ریاست سوات بادشاہ صاحب کے ہاتھ مضبوط تھے۔ جس کی وجہ سے ریاست سوات معرضِ وجود میں آئی۔ پھر ابتدائی دنوں میں خزانہ کہاں تھا۔ اسی جائداد کی آمدن استحکام ریاست میں بھی صرف ہوتی رہی۔ یہی جائداد تھی جو ریاستی کاروبار سے متعلق لین دین کی ضامن تھی۔ اور پھر تعمیرِ پاکستان کے سلسلے میں اس جائداد نے کچھ حصہ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس مبارک جائداد کی آمدن مملکت خداداد پاکستان کی صنعتی ترقی میں بھی حصہ دار بنی اور پھر اسی جائداد کی آمدن عہد جہانزیبی کی مثالی سوات کی تعمیرِ نو میں بھی حصہ دار ہو گئی۔ اور یہی جائداد ہے کہ جس کی آمدن اب بانیٔ ریاست سوات و حکمران اوّل بادشاہ صاحب کی موجودہ حالت میں بھی شاہانہ معارف کی متحمل ہے اور ریاستی خزانے سے بادشاہ صاحب کوئی مشاہرہ یا پنشن وغیرہ نہیں لیتے۔

شہر مینگورہ کی خوب صورتی اور نفاست میں اس جائداد کی آمدن زیادہ حصہ دار رہی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

صاحب سوات کی ذاتی جائداد اور اس کی آمدن سے متعلقہ دولت کا امتیازی پہلو یہی ہے کہ دوسرے نوابوں اور خانوں کی دولت جو کہ اکثر مجرمانہ طریقوں سے جمع ہوتی ہے۔ عموماً شراب، کباب، رنڈی اور قمار بازی اور یا دوسرے عیش و عشرت کے ہنگاموں میں ضائع ہو جاتی ہے۔

میں نے ایسے سرمایہ داروں کو دیکھا ہے کہ بظاہر انسانیت کے بڑے غم خوار سرپرست بنے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو آزاد قسم کے اشتمالیوں میں شمار کرتے ہیں اور جب انگریزی شراب کا کال پڑ جاتا ہے تو ہر شام سو آنی روپیہ پر ایک ایک بوتل شراب خریدتے ہیں۔ اور پھر شراب کے نشے میں مخمور اسی بدمست سے کوئی غریب شامت زدہ ایک آنہ مانگتا ہے تو قیامت برپا ہو جاتی ہے — یہ صاحب اپنی بدقسمتی کو روتے ہیں کہ میں کیوں ایسی قوم میں پیدا ہوا جس کے غریب لوگ ایک ایک آنہ مانگتے ہیں اور اس طرح ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال دیتے ہیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ انسان ہمارے ماحول میں خود غرضی اور خود پروری کی انتہائی بلندی پر پہنچ چکا ہے۔ اس قدر بلندی پر کہ وہ انسانیت سے بالکل بیگانہ ہو چکا ہے اس حالت میں مبارک ہیں وہ لوگ جو دوسروں کی فلاح اور بہبودی کے متعلق سوچتے ہیں۔ مجروح اور ناتواں انسانیت کا سہارا بنتے ہیں۔ یقیناً اس قسم کے با اصول اور بلند کردار افراد پرستش کے لائق ہوتے ہیں۔

مطلب یہی ہے کہ صاحب سوات کی جائداد اور دولت اول تا آخر نیک اور تعمیری مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ رہی ہے۔ حالانکہ مقابلتاً سوات کے ماحول میں، بڑے بڑے دولت مند خوانین تھے لیکن ان کی دولت اور جائداد سے کسی کا ذرہ خیر میں ایک پیسہ بھی صرف نہ ہوا۔ بلکہ تخریبی منصوبوں کی پشت پناہی کا ایک وسیلہ رہی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ ان کی وہ شان و شوکت ختم ہو گئی۔

صاحب سوات کی مالداری نیک مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود مالدار ہونے کے آپ کی زندگی مالدارانہ اثرات سے پاک اور درویشانہ تھی جائداد اور گائے بھینسوں کے ہوتے ہوئے بھی آپ جو کی روٹی استعمال کرتے رہے۔ دولت کو آپ نے سوائے اس کے اور کوئی اہمیت نہیں دی کہ دولت

اگر کچھ تھی تو وہ دوسروں کے مفاد اور اصلاح میں صرف ہوتی رہی اور بس۔

وسعت قلب اور اخلاق

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمناں ہم نکردند تنگ

صاحب سوات کی ہستی اخلاقی قدروں کا ایک نمونہ تھی۔ ایک وسیع القلب انسان کی حیثیت سے دوست تو دوست تھے۔ آپ اپنے مخالفین اور دشمنوں سے بھی نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کسی کے بدخواہ یا دشمن نہیں تھے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہر دور میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اجرتی دشمن کہتے ہیں۔ اب میں مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کروں گا۔

موضع طورو، ضلع مردان کے ایک کوتوال جس کا نام "سدو" تھا اس کوتوال کو انگریزوں نے آپ کے قتل پر مامور کیا۔ "سدو" بندوق لیکر سیدو شریف چلا آیا۔ سیدو میں اس کی مجرمانہ نقل و حرکت نے اس کا راز فاش کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پکڑا گیا اور صاحب سوات کے حضور میں پیش کیا گیا۔ سدو نے اعتراف کیا کہ وہ مجرمانہ نیت سے سوات آیا ہے۔ صاحب سوات نے نہایت خندہ پیشانی سے اسے معاف کر دیا۔

چنانچہ اس خدمت کے سلسلے میں سدو کو انگریزی سرکار سے تادم حیات مبلغ پانچسو روپیہ ماہوار پنشن ملتی رہی۔ انگریزوں نے جس طرح حقیر معاوضے دے دے کر ہمارے ملک میں بعضوں کے ضمیروں اور ایمانوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس کے متعلق اگر لکھا جائے تو یہ ایک دلگداز کہانی ہے۔ لیکن یہ غیر متعلق موضوع ہے۔

صاحب سوات اپنے متعلقین کو ہمیشہ سحر خیزی کی تلقین فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ۔

"انسان کی پیدائش مٹی سے ہے اس لئے انسان کو ہمیشہ فروتنی اور عاجزی اختیار کرنا چاہیئے ۔ اس لئے کہ غصہ اور تکبر تو ابلیسی خاصیتیں ہیں ۔

ز خاک افریدت خداوند پاک
پس اے بندۂ افتادگی کن چو خاک

میں نے (راقم الحروف) اسی سوات کے ماحول میں دین کے ایسے اجارہ داروں کو دیکھا ہے کہ جو خود کو پیغمبر اسلامؐ کے مصلے کے وارث بھی کہتے ہیں اور جن کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ نہ ان کا کوئی کمالی کارنامہ ہوتا ہے اور نہ ہی زہد و طاعت کے لحاظ سے قابل تعریف ہوتے ہیں اور نہ ہی دولت رکھتے ہیں لیکن بایں ہمہ ان کے حسد اور تکبر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ غریب مسلمان اگر دو یا چار بھی بیٹھے ہوں اور یہ صاحب آتے ہیں تو سلام بھی نہیں کرتے ۔ اس کے برعکس اگر کسی خان یا مالدار سیٹھ کو دیکھتے ہیں تو یہ اجارہ دار اسلام سراپا عجز و نیاز کے نمونے بن جاتے ہیں ، زندگی کے ان حقائق سے اگر پردہ اٹھایا جائے تو یہ ایک دردناک اور دلخراش منظر سامنے آجاتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ماحول میں اگر کسی انگریزی کالج کا سند یافتہ پتلون پوش ایم ۔ اے صاحب ہو اور یا کسی دارالعلوم کا سند یافتہ مولوی ہو ۔ ان دونوں کی اخلاقی حالت اور کردار کا اگر بغور مشاہدہ کیا جائے ۔ تو انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ تعلیم سے اخلاقیات کا شاید کوئی واسطہ ہی نہیں ۔ ایک غریب اور جاہل کسان کے مقابلے میں ان تعلیم یافتہ حضرات میں خلوص

اور خوش اخلاقی بہت کم ملتی ہے۔ یہ تو خدائی عطیہ ہے کہ جسے مل جائے — تو ملتا ہے۔

ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

صاحب سوات کے بلند کردار اور خوش اخلاقی کی یہ حالت تھی کہ وہ متعصب پادری جنہیں مسلمان بزرگوں سے خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے وہ بھی مجبور ہو گئے کہ صاحب سوات کی عظمت کا اعتراف کریں۔ پشاور اور صوبہ سرحد کے لئے چرچ کے ایک مبلغ اور مسیحی عالم پادری "ہیوگس" نے صاحب سوات کی عظمت اور تقدس کا شہرہ سن کر بچشم خود دیکھنے سوات آئے۔ سوات میں بچشم خود سب کچھ دیکھنے کے بعد اسی پادری نے "دی۔ اخوند آف سوات" ایک پمفلٹ لکھا چنانچہ اسی پمفلٹ میں "ہیوگس" نے صاحب سوات کے متعلق لکھا ہے۔ کہ

> جن اوصاف نے آپ کو نہ صرف مسلمانوں کا مسلمہ روحانی پیشوا بلکہ موجودہ دنیا کی ایک عظیم شخصیت کا مالک بنا دیا ہے وہ آپ کا بے مثال تدبر، بلند کردار کریمانہ اخلاق اور بے ریا زہد و طاعت، پرخلوص اور بے لوث اصلاحی جذبہ ہے۔"

جے۔ آئی۔ پلوڈن کے۔ سی۔ آئی۔ ایک اور انگریز مصنف اپنی ایک یادداشت میں لکھتے ہیں۔ کہ:۔

> "موجودہ سوات کی عظیم ترین شخصیت اور ہر دلعزیز رہنما جناب عبدالغفور خاں اخوند آف سوات ہیں۔ جن کے روحانی اقتدار کا پرچم نہ صرف کوہستانِ سوات و بونیر پر لہرا رہا ہے بلکہ ہندوستان، افغانستان اور دوسرے

اسلامی ممالک میں بھی آپ کا کافی اثر و نفوذ ہے آپ
کے دیدار کے لئے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم
بھی آتے ہیں۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ صاحب سوات کا شمار ان عظیم دانشوروں اور مفکروں میں ہوتا ہے کہ جن کی ہستی پر صرف ملت اسلامیہ ہی نہیں بلکہ پورے مشرق کو فخر و ناز کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ عظیم انسان جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ مے نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

صاحبِ سوات کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ

ایک ہندو کو پیٹ کے مرض کی شکایت تھی۔ بیماری دائمی قسم کی تھی۔ چنانچہ یہ لالہ جی بھی صاحب سوات کی خدمت میں ایک دن حاضر ہوا۔ اور کہا کہ جناب اس مرض نے جینا دوبھر کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا علاج مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ لالہ جی نے حیران ہو کر پوچھا کہ صاحب وہ کیسے؟

آپ نے فرمایا کہ گائے کا تھوڑا سا گوشت کھانے سے کامل صحت ہو سکتی ہے۔ لیکن تمہارے مذہب میں منع ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ گائے کا گوشت کھالو۔

ہندو نے کہا کہ رام رام میں گائے کا گوشت کیسے کھا سکتا ہوں۔

آپ نے فرمایا کہ میں کب کہتا ہوں کہ کھاؤ۔ البتہ میں نے یہ کہا ہے۔ کہ تھوڑا سا کھانے سے اس مرض کا علاج ہو سکتا ہے۔

لالہ جی روانہ ہوئے تو راستے میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک جگہ گائے ذبح ہو چکی ہے

اور لوگ گوشت بھون کر کھا رہے ہیں۔ اب اسے خیال آیا کہ بطور دوا اگر تھوڑا گوشت کھا لوں تو کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ وہیں بیٹھ کر تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت کھا لیا۔ ایک گھنٹہ بعد جب لالہ جی کو رفع حاجت ہوئی تو اس میں ایک لمبا کیڑا سانپ کی طرح نکل آیا۔ چنانچہ مریض کی پیٹ کی وہ تکلیف ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر وہ ہندو مسلمان ہو گیا۔ اس طرح جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ روحانی علاج بھی ہو گیا۔ اور بقول صاحب سوات اُسے شفائے کاملہ نصیب ہو گئی۔ صاحب سوات نے اگرچہ باقاعدہ طب نہیں پڑھی تھی۔ تاہم آپ کے نسخے تیر بہدف ثابت ہوئے تھے۔

تو یہ تھی صاحب سوات کی عظیم شخصیت۔ چوراسی سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔ آپ چوبیس سال مسلسل تحصیل علم اور ریاضت و طریقت کے سلسلے میں سوات سے باہر رہے اور جب سوات آئے تو پھر سوات کے لئے وہ مخلصانہ جدوجہد کی کہ سوات کا نام روشن ہو گیا۔ اور اسی جدوجہد اور آپ کی عظمت نتیجہ ہے کہ آپ کے خاندان میں ہی ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے آگے چل سوات کی کایا پلٹ دی۔ اور یہ آپ ہی کے تقدس اور بزرگی کا اثر ہے کہ سوات کا حکمران خاندان مخلصانہ تیادت۔ بلند کردار، اور خوش اخلاقی کے سلسلے میں دوست اور دشمن سے یکساں خراج تحسین حاصل کر رہا ہے۔ وادیٔ سوات کے حالات اور یہاں سے واقف ہونے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کوہستانی ماحول میں صاحب سوات کا خاندان ایک نورانی چراغ ہے کہ جس سے یہ تمام ماحول منور ہو رہا ہے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اقبالؒ

صاحبِ سوات کے بعد

اخوند صاحب کی وفات کے بعد ان کے دو فرزند رہ گئے۔ بڑے کا نام میاں گل عبدالحنان اور چھوٹے کا نام میاں گل عبدالخالق تھا صاحب سوات کے حقیقی جانشین بھی صاحبزادہ عبدالخالق ہی ثابت ہوئے۔ میاں گل عبدالحنان کی طبیعت ابتدا ہی سے دنیاوی اقتدار کی طرف مائل تھی ۱۸۵۶ء میں جب سوات کے امیر شریعت سید اکبر شاہ فوت ہو گئے تو بھی میاں گل عبدالحنان نے اخوند صاحب کی خدمت میں یہ درخواست کی تھی کہ اسے سوات کا امیر بنایا جائے۔ لیکن اخوند صاحب نے اسے صاف کہہ دیا کہ "میں تم میں منصب امارت کے بارِ گراں کو سنبھالنے کی اہلیت یا قوت نہیں دیکھتا۔ لہذا تمہیں اس قسم کی کوئی جد و جہد نہیں کرنی چاہیئے۔ اخوند صاحب کی وفات کے بعد عبدالحنان اگرچہ سوات کے امیر نہ بن سکے۔ لیکن ایک قسم کا دنیاوی اقتدار بطرزِ امارت انہوں نے قائم کیا ہوا تھا۔ سواری کے لئے اعلےٰ گھوڑے موجود تھے۔ رات کے لوگوں میں سے باقاعدہ لشکر بنایا ہوا تھا۔ نواب دیر اور خانانِ باجوڑ کی اکثر لڑائیوں میں کسی ایک کے طرفدار بن کر حصہ لیا کرتے تھے۔ غرضیکہ شاہانہ ٹھاٹ سے رہا کرتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس میاں گل عبدالخالق کی طبیعت ایک خاموش اور پرسکون سمندر جیسی تھی۔ پاکباز انسان تھے اور طبیعت ابتدا ہی سے زاہدانہ تھی۔ بڑے بھائی کا احترام کرتے تھے اور باوجود دلی رغبت نہ ہونے کے بھائی کے پاس خاطر سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ اکثر لڑائیوں میں بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں بھی جب کہ اخوند صاحب سوات میں بیمار تھے میاں گل عبدالحنان اپنے چھوٹے بھائی عبدالخالق سمیت نواب دیر کے ساتھ لڑائی کے سلسلے میں "تلاش" میں مقیم تھے

سیدو شریف کی عالیشان جامع مسجد جسمیں صاحب سوات کا روضہ ہے

صاحب سوات کی نوتیدگی کی اطلاع "تلاش" میں صرف عبدالحنان کو ملی۔ عبدالحنان نے اپنے بھائی عبدالخالق سے یہ خبر چھپائی، اور اسے کہا کہ میں ایک ضروری کام کے لئے سوات جانا چاہتا ہوں اور جلد از جلد واپس آجاؤں گا۔ تم لشکر کے ساتھ یہیں مقیم رہو۔ اور میری واپسی کا انتظار کرو۔ پدر بزرگوار نے صرف مجھے طلب کیا ہے۔ بیچارے عبدالخالق "تلاش" میں رہ گئے۔ عبدالحنان وہاں سے روانہ ہو کر بہ سرعت تمام سیدو پہنچ گئے۔ سیدو شریف میں صاحب سوات کی تمام املاک مال و دولت اور جائداد پر قبضہ کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو محروم کر دیا۔ لوگوں نے بھی اسے صاحب سوات کا جانشین تسلیم کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیاوی اقتدار کے عشق و جنوں میں جو مبتلا ہو جاتا ہے پھر اس سے کسی انصاف یا بھلائی کی توقع کرنا فضول ہوتا ہے۔ اس فاحشہ کے دام تزویر میں پھنس کر انسان اپنے تمام رشتوں اور اخلاقی قدروں سے ناطہ توڑ لیتا ہے، کچھ دنوں کے بعد "تلاش" میں میاں گل عبدالخالق کو ان واقعات کی اصل اطلاع مل گئی۔ لیکن آفریں ہو اس بلند کردار صابر اور وسیع القلب انسان پر کہ ان سب بے انصافیوں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیا۔ چپ چاپ سیدو شریف پہنچ گیا۔ بڑے بھائی سے کچھ نہ کہا اور نہ ہی کوئی شکوہ یا شکایت کی بلکہ خود بخود جا کر خلوت نشین ہو گئے۔

صاحب سوات کے ایک مرید حاجی صاحب بیگ مانے" سے بیعت کر لی۔ کنج خلوت میں ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ طبیعت ابتدا سے فقیرانہ ذہنیت زاہدانہ تھی۔ لہذا دنیاوی مال و دولت کے نہ ملنے کا کوئی رنج انہیں نہیں ہوا۔ خاموشی کے ساتھ زہد و عبادت میں مصروف ہو گئے۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ یہی صاحب اپنے عظیم الشان والد کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ اگرچہ

میاں گل عبدالحنان بھی خلوت نشین ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی رنگین مزاجی خلوت نشینی کی متحمل کہاں ہو سکتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ہی خلوت سے نکل آئے۔ اور دنیاوی ہنگاموں میں مصروف ہو گئے۔ خلوت سے نکل کر انہوں نے دوبارہ ایک قسم کی حکومت بنانے کی کوشش شروع کی۔ دوسری طرف میاں گل عبدالخالق کی عابدانہ اور بزرگانہ شہرت خود بخود بڑھتی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد تو یہ حالت ہو گئی کہ سوات، بونیر اور کانا غور بند کے ان تمام علاقوں پر میاں گل عبدالخالق کا روحانی پرچم اقتدار لہرانے لگا۔ تمام لوگ آپ کے تقدس اور متشرعانہ زندگی کے قائل ہو گئے۔ انہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ خود کو صاحب سوات کا حقیقی جانشین ثابت کیا۔

میاں گل عبدالحنان کا دنیاوی اقتدار کچھ عرصہ گزرنے کے بعد خود بخود زائل اور روبہ زوال ہونا شروع ہو گیا۔ ابتدا میں عبدالحنان نے باوجود اس کے کہ تمام مال و دولت پر غاصبانہ طریقے سے قابض ہو چکا تھا اور اپنے بھائی عبدالخالق پر طرح طرح کے مظالم کئے گئے اور اُسے قسم قسم کی اذیتیں پہنچائی تھیں اور ہر ممکن طریقے سے اس غریب کو تنگ کرتا رہا۔

میاں گل عبدالخالق نے اپنے بڑے بھائی کے یہ سنگدلانہ مظالم صبر کے ساتھ برداشت کئے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ عبدالحنان کا امیرانہ اثر و رسوخ بالکل زائل ہو گیا۔ سوات کے لوگوں کے دل عبدالخالق نے پاکیزگی اور محبت کے ساتھ جیت لئے۔ اب تو یہ حالت ہو گئی کہ عبدالحنان صاحب ہر ایک معاملے میں اب عبدالخالق کے تعاون و امداد کے محتاج ہو گئے۔

عبدالخالق کی اخلاقی عظمت دیکھئے کہ اس کے دل میں اپنے مظالم اور غاصب بھائی کے لئے کبھی انتقامی جذبات پیدا نہ ہو سکے۔

سوات میں اگرچہ بظاہر کوئی حکومت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود عبدالخالق کی روحانی حکومت ہر دل پر قائم تھی۔ سوات کے لوگ دنیاوی معاملات میں بھی اب ان کی رہنمائی کے طالب ہو گئے اور عبدالخالق صاحب ایک قسم کے امیر شریعت بن گئے۔ شریعت محمدی کے قوانین اور اصولوں کے مطابق ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ دس سال کے بعد پینتیس سال کی عمر میں میاں گل عبدالحنان فوت ہو گئے۔ اب عبدالخالق تنہا رہ گئے اور شریعت کا سلسلہ چلاتے رہے۔

میاں گل عبدالحنان کے بعد

عبدالحنان کی وفات کے بعد میاں گل عبدالخالق نے اس کے مال اور دولت کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا۔ حالانکہ عبدالحنان نے عبدالخالق کی دولت اور حصہ پدری پر غاصبانہ قبضہ بھی کیا تھا اور اس پر ہزاروں مظالم بھی کئے تھے۔ لیکن وہ عبدالحنان تھے۔ عبدالخالق اور اس کے کردار میں فرق تھا۔ عبدالحنان دنیا پرست جابرانہ ذہنیت رکھنے والا انسان تھا اور یہ خدا ترس فقیرانہ مذاق کے مالک تھے۔ لہٰذا یہ اسے معاف کر چکے تھے۔

سیدو شریف کے مولٰنا غلام حیا کا والد عبدالحنان کی جائداد اور املاک کا ناظم تھا۔ چنانچہ اراضیات کی آمدن سے وہ عبدالحنان کے فرزندوں کے لئے زمینیں خریدتا رہا۔ عبدالحنان کے پسماندگان کا خرچ عبدالخالق صاحب برداشت کرتے رہے۔ عبدالخالق صاحب جب تک زندہ رہے عبدالحنان کے یتیم بچوں کی پرورش اور سرپرستی مشفقانہ طریقے سے کرتے رہے۔ انہیں کبھی یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ وہ یتیم ہیں۔ جس قسم کا لباس اپنے بچوں کے لئے بنواتے رہے وہی لباس بھتیجوں کا ہوتا تھا۔

غرضیکہ عبدالخالق نے ایک شفیق بزرگ کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت صحیح طریقے سے ادا کئے۔ عبدالحنان کے دو فرزند رہ گئے تھے۔ بڑے کا نام عبدالرزاق سید بادشاہ اور چھوٹے کا نام عبدالواحد امیر بادشاہ تھا۔

میاں گل عبدالخالق کی شخصیت اور کردار

اخوند صاحب سوات کے بعد عبدالخالق کی شخصیت زہد و تقدس کے لحاظ سے بہت مشہور ہوئی۔ ان کے عہد میں سیدو نے ایک مرتبہ پھر ایک عظیم روحانی اور مذہبی شہرت اختیار کی۔ ایک مرکزِ عقیدت کی حیثیت سے اب پھر دور دراز کے علاقوں سے ہزاروں لوگ جوق در جوق سیدو آنا شروع ہوئے اور عبدالخالق صاحب کی روحانی عظمت اور عالمانہ صلاحیتوں سے مستفیض ہوتے رہے۔

عبدالخالق صاحب عوام الناس میں "میاں گل" کے نام سے مشہور تھے ہر علاقے کے علماء اور متشرع افراد میاں گل صاحب کی خدمت میں موجود ہوتے تھے۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے حکومت بنانے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی تھی اور نہ ہی اس قسم کی کوئی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کی عالمانہ عظمت، مضبوط شخصیت بے پناہ قابلیت کی بدولت خود بخود ایک، شرعی قسم کی حکومت قائم ہو گئی — اور عبدالخالق صاحب کی شخصیت نے خود بخود امیر شریعت کی حیثیت اختیار کر لی۔ باوجود اس امر کے کہ ان کے پاس کوئی فوج یا پولیس نہیں تھی۔

انہوں نے سوات سے تمام انسانیت سوز جرائم کا خاتمہ کر دیا۔ سوات کے لوگوں کو شریعت کی طرف راغب کر کے ان کی اخلاقی اصلاح کی۔ سوات اور متعلقہ علاقوں میں مکمل امن و امان قائم کر دیا۔

میاں عبدالخالق صاحب کے مریدوں کو لوگ شیخ کہا کرتے تھے۔ چنانچہ

یہی شیوخ ہی ان کے عمال تھے۔ شریعت کے فیصلوں کی تکمیل ان ہی شیوخ کے ذریعے کرائی جاتی تھی۔ یہ ایک قسم کے پولیس افسر تھے

سوات کے لوگوں نے متفق ہو کر میاں گل عبدالخالق کو کلی اختیارات سونپ دیئے کہ مجرموں کو شریعت محمدیؐ کے مطابق سزائیں دیا کریں۔ چنانچہ جب کوئی جرم ہو جاتا تو حسب ضابطۂ شریعت چھان بین اور مکمل تحقیقات کی جاتی۔ اس کے بعد مجرم کو سزا دی جاتی۔ چور کے ہاتھ کاٹے جاتے تھے۔ "زانی" (زنا کرنے والے) کے لئے دُروں کی سزا مقرر تھی۔ خون کا بدلہ خون تھا۔ لیکن اس ضمن میں مجرم کو ان تمام رعایات سے بھی محروم نہیں کیا جاتا تھا جو کہ شریعت کی رو سے اسے حاصل تھے۔ مثلاً فریقین کی رضامندی کے بموجب "خون بہا" وغیرہ۔

شریعت محمدیہ کے مطابق فیصلوں کا اثر یہ تھا کہ میاں گل عبدالخالق کے عہد میں ظالم اور جابر خوانین کے مظالم اور بے انصافیوں سے عوام کو نجات حاصل تھی

علاقہ سوات میں جب کبھی کسی جرم مثلاً قتل، ڈاکہ، رہزنی، زنا بالجبر وغیرہ کا ارتکاب ہو جاتا تو رپورٹ ہونے پر فوراً سید و شریف سے شیوخ جا کر تحقیقات بر موقع کر لیتے اور ساتھ ہی ملزم کو بھی گرفتار کر کے لے آتے۔ اس ضمن میں میاں گل صاحب کو بحیثیت امیر شریعت اکثر خود بھی باہر جانا پڑتا تھا۔ قابل صفت امر یہ تھا کہ قوانین شریعت کے نفاذ و تکمیل میں ریاست کے عوام میاں گل صاحب کے شیوخ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون رضا کارانہ طور سے کرتے تھے۔

عبدالخالق کے عہد میں ایک مرتبہ پھر سوات نے دارالامان کی صورت اختیار کر لی۔ عوام کو پرسکون اور شریعت محمدی کے تابع زندگی بسر کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

اب سوچئے کہ میاں گل صاحب ایک فقیر زاہد خلوت نشین جس کے پاس نہ تو فوج ہے

اور نہ پولیس اور نہ ہی کوئی اور دنیاوی طاقت ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے — کہ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر عوام نے اسے اختیارات دیئے ہیں اور قلندرانہ جاہ و جلال کا یہ اثر ہے کہ اس فقیر گوشہ نشین کے مرید جاتے ہیں اور ایک جابر ستم کے طاقتور قاتل کو گرفتار کرتے ہیں۔ لیکن کسی فرد کی یہ مجال نہیں کہ اُن کی مزاحمت کرے۔ درویشانہ جلال اور مومنانہ جبروت اسی کو کہتے ہیں اور اسی قوت کے متعلق اقبالؒ نے مسلمان کو مخاطب کیا ہے۔۔ ؎

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا دیا ہے تو نے جذب قلندرانہ

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ درحقیقت کسی ملک یا وطن کے لئے وہی نظام مفید ثابت ہو سکتا ہے جسے عوام کی تائید اور حمایت حاصل ہو۔ کسی ملک یا ریاست کے مسائل طویل اور پیچیدار تقریروں اور یا یوروپ مارکہ کسی سیاسی جماعتوں کے ظاہری نمود و نمائش سے حل نہیں ہوتے۔

کسی بھی ریاست یا مملکت کی خوشحالی کا دارومدار اور امن و سلامتی و سربلندی کا انحصار ہمیشہ سے مضبوط اور مختلف شخصیتوں کی جدوجہد کا مرحون منت چلا آرہا ہے مختلف ممالک کے تاریخی حالات اور وہاں کے سیاسی واقعات کے بغور مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ ہمیشہ سے کسی ملک کے مقدر کو تبدیل کرنے کا باعث کوئی مضبوط شخصیت ہی ہوتی ہے۔ امریکہ کا لنکن یا واشنگٹن فرانس کا نپولین بوناپارٹ، روس کا لینن، ٹرکی کا اتاترک، ایران کا رضا شاہ، پاکستان کا قائداعظمؒ وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام عظیم انسانوں کی مضبوط شخصیتیں اور ٹھوس کردار، مخلصانہ قیادت ہی ان مذکورہ ممالک کی ترقی اور نجات کا باعث رہی ہیں۔ چنانچہ میاں گل عبدالخالق بھی اپنے عہد کے بہت بلند کردار انسان تھے۔ چونکہ

وہ زاہدانہ مذاق کے فقیر منش انسان تھے۔ اس لئے انہوں نے دنیاوی اقتدار اور باقاعدہ ایک حکومت قائم کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کی یہ شرعی جدوجہد ہی تھی کہ جس کے ذریعے سوات کے لوگوں میں ایک باقاعدہ حکومت بننے اور منظم زندگی گذارنے کا شعور بیدار کیا۔ اس کے بعد یہ سعادت عبدالخالق صاحب کے فرزند بائی ریاست بادشاہ صاحب کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

زہد و تقدس

میاں گل عبدالخالق "صاحب سوات" کے حقیقی جانشین تھے۔ ایک پاکباز اور زاہد انسان تھے۔ ان کی زندگی سراپا شریعت محمدیؐ کی مظہر تھی۔ رات کو عبادت کرتے تھے اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ موصوف کی یہ عادت تھی کہ ہمیشہ اپنی ہی ملکیت اراضی کا غلہ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے کھیتوں میں کاشت کیلئے تخمیں (بیج) کافرستان کے علاقے سے منگواتے تھے اور پھر انہی تخموں سے اگا ہوا غلہ استعمال کرتے تھے۔ کسی دوسرے شخص کے کھیت کا غلہ انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ دودھ اور گھی کے لئے گائیں بھی کافرستان سے خرید کر لائی گئی تھیں۔ اپنے گھر میں مزدور عورت کو نہیں چھوڑتے تھے۔ بادشاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد محترم کبھی کسی وقت بھی نوکرانی سے کوئی خدمت نہیں لیتے تھے حتےٰ کہ کسی نوکرانی کو وضو کرتے وقت پانی کا کوزہ لانے کو بھی نہیں کہتے تھے۔ ہمیشہ کے لئے والدہ محترمہ سے کوزہ لانے کو کہتے تھے۔

ان کی شخصیت ایسی بارعب تھی کہ ان کے سامنے ہماری زبان ہلانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ہم ہمیشہ ان کی موجودگی میں خاموش اور مؤدب رہا کرتے تھے اور یہی حالت والدۂ محترمہ کی بھی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ

میاں گل صاحب گویا سخت مزاج تھے۔

پابندیٔ زکوٰۃ

صوم وصلوٰۃ کے یہ دلدادہ بزرگ انسان زکوٰۃ نکالنے کی پابندی بھی سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ گھر والوں کے زیورات کا حساب لگاکر زکوٰۃ نکالتے تھے۔ اسی طرح جس قدر غلہ بھی ہوتا تھا اس کی بھی زکوٰۃ شریعت کے مطابق نکالتے تھے۔ غلے کی صورت میں زکوٰۃ نکالتے وقت غلہ اتنا کم رہ جاتا کہ مقررہ پیمانے سے کم ہوتا تھا تو مٹھیاں بھر بھر کر زکوٰۃ کا حصہ الگ کر دیتے تھے۔

انگریزوں کے ساتھ جہاد

میاں گل صاحب کے عہد میں اگرچہ غزائے بُنیر کی طرح کوئی خاص لڑائی تو نہیں ہوئی ہے۔ لیکن صاحب سوات کی وفات کے بعد بھی انگریزوں کے ساتھ سوات کے لوگوں نے بطور جہاد چھوٹی چھوٹی جھڑپیں کی ہیں۔ مثلاً ۱۸۷۸ء میں جب کہ انگریزی سرحد پر حملہ ہوا تھا تو اس قسم کے جہادوں میں میاں گل صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ انگریزوں کے برخلاف جہاد کے فرض سے بھی آپ غافل نہیں تھے۔ لیکن صاحب سوات کی وفات کے بعد صوبہ سرحد وغیرہ علاقوں میں انگریزی حکومت کے استحکام سے حالات بدل چکے تھے۔

بحیثیت امیر شریعت

میاں گل عبدالخالق کی احتیاط اور انصاف پروری کا یہ عالم تھا کہ بحیثیت امیر شریعت جب کبھی کسی شرعی فیصلے کے لئے سیدو شریف سے باہر جاتے تھے تو کبھی بھی

فریقین کا مہمان نہیں بنتے اور نہ ہی کسی کی دعوت قبول کرتے۔ طریقہ یہ تھا کہ اگر مقررہ مقام سید وسے نزدیکی فاصلے پر ہوتا تھا تو گھر سے ہی پکا ہوا کھانا وہیں پہنچ جاتا تھا۔ بصورت دیگر اپنا راشن ساتھ لے جاتے تھے اور مرید لوگ پکاتے تھے۔ چنانچہ اس طریقے پر آپ ہمیشہ سختی کے ساتھ کاربند رہے۔

لنگر کا سلسلہ

اخوند صاحب سوات نے سیدو شریف میں جو لنگر جاری کیا تھا عبدالخالق کے عہد میں بھی یہ لنگر اسی قدیمی شان سے چلتا رہا۔ روزانہ پانچسو افراد کے لئے لنگر میں کھانے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ تعداد دو ہزار تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ ابتدا میں جب کہ صاحب زادہ عبدالحنان نے صاحب سوات کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا اور پھر خلوت نشین بھی ہو گئے لیکن لنگر کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ لنگر کا بوجھ تو ابتدا ہی سے عبدالخالق نے اٹھا لیا اور اپنے عظیم الشان والد کے اس افادی سلسلے کو حسب دستور جاری رکھا۔ اس لنگر میں طعام کے ساتھ قیام کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ مرتے دم تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ غربا اور مساکین سیدو شریف کے اس لنگر سے مستفیض ہوتے رہے۔ صاحب سوات کے مریدوں میں سے ملا صاحب مانکی شریف نے بھی اپنے مرشد کی اجازت سے لنگر جاری کیا تھا جو کہ غالباً اب بھی جاری ہے۔

وفات

۱۸۹۲ء میں پینتیس برس کی عمر میں میاں گل عبدالخالق نے عین جوانی کے عالم میں وفات پائی۔ اس لحاظ سے آپ کا سن پیدائش ۱۸۵۷ء بنتا ہے۔ عمر نے وفا

نہ کی۔ ورنہ اگر کچھ عرصہ آپ زندہ رہتے تو سوات اور متعلقہ علاقوں کی حالت کچھ اور ہوتی۔ آپ کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگ سکتا ہے کہ سوات کے لوگوں نے خود بخود رضا کارانہ طور سے آپ کو اپنا پیشوا تسلیم کیا اور ہر قسم کے اختیارات دے دیئے۔ شرعی فیصلوں کے متعلق ہر قسم کے احکام کی تعمیل میں شیوخ کے ساتھ یہ لوگ تعاون کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے حالات اور خطۂ سوات کے مخصوص حالات کے مطابق شرعی فیصلے اور منازعات کافی حد تک موثر اور مفید ثابت ہوئی تھیں۔

اس طرح سوات اور متعلقہ علاقوں میں یعنی کہ عالم اسلام کے اس مخصوص خطے میں اجرائے شریعت اور قوانین شریعت کا نفاذ میاں گل عبدالخالق کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ آپ کی عالمانہ اور زاہدانہ عظمت عالمان دین اور مسلمانوں کے لئے ایک سرمایۂ افتخار تھا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے دو فرزند زندہ گئے۔ جن میں سے بڑے کا نام عبدالودود گل شہزادہ تھا جو کہ ریاست کے بانی اور اولین حکمران تھے۔ اور چھوٹے کا نام عبدالمنان المشہور شہزادہ شیرین جان تھا۔

میاں گل صاحب کی وفات کے بعد سوات

میاں گل صاحب کی وفات کے بعد ۱۸۵۲ء سے ۱۹۱۵ء تک کا دور پھر سوات کا دورِ ظلمت تھا۔ اس عرصہ میں سوات ہر قسم کی سفاکیت، ظلم، فسق و فجور اور جابر خوانین کے سنگدلانہ مظالم کا ایک گہوارہ بن گیا تھا۔ وادی سوات بدامنی کے لئے مشہور ہو گئی۔ غرضیکہ اس دور کو بھی سوات کا دور جاہلیت کہا جا سکتا ہے۔ اس کے وجوہات یہ تھے کہ سوات کے جابر اور طاقتور قسم کے افراد اور خوانین جو کہ سوات میں کسی قسم کی پابندی اور ضابطے کو برداشت کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ صاحب سوات اور پھر

میاں گل عبدالخالق کے عہد میں یہ لوگ اگرچہ وقتی طور سے دب گئے تھے اور بظاہر اصلاحی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن باطن کے لحاظ سے وہی تھے جو پہلے تھے۔ اس قسم کے خود پرست، جاہ پسند اور دوسروں کو لوٹنے والے افراد کی ذہنی اصلاح تو ناممکن ہوتی ہے۔ صرف اتنا تھا کہ میاں گل صاحب کی مضبوط شخصیت اور بزرگانہ عظمت کا یہ اثر تھا کہ وقتی دور سے ان کی موجودگی میں عوام کو ان کے مظالم سے نجات مل گئی۔ حالات کا رخ دیکھ کر اس قسم کے عناصر نے خاموشی اختیار کی تھی اور موقعے کے منتظر تھے۔ اخلاقی اصلاح صرف ان لوگوں کی ہو چکی تھی جنہیں عوام کہتے ہیں۔

صاحب سوات اور میاں گل صاحب کے عہد میں یہ عوام قوانین شریعت کے نفاذ پر متحد بھی ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان حالات میں خوانین اور استبدادی قوتوں سے انہیں چھٹکارا بھی مل گیا۔ لیکن باقاعدہ حکومت یا کوئی مستقل قسم کی حاکمانہ قوت تو موجود نہیں تھی۔ لہٰذا میاں گل صاحب کی وفات کے بعد وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب جابر قوتوں کو پھر آزادی مل گئی۔ لہٰذا جو کچھ اصلاح میاں گل صاحب کے عہد میں ہو چکی تھی وہ ختم ہو گئی۔

چونکہ عام لوگ تعلیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ لہٰذا ذہنی اصلاح کی وہ حالت بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔

صاحب سوات اور میاں گل صاحب کی شخصیتیں چراغ کی مثال تھیں کہ جیسے چراغ بجھ جائے تو پھر وہی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سوات میں افراتفری کا زمانہ شروع ہو گیا اس دوران میں اس ماحول کے لوگ ہر مذہبی اور اخلاقی پابندی سے دور ہوتے گئے۔ امن و امان ختم ہو گیا۔ اب پھر کشت و خون کے معرکے اور ڈکیتیوں کے ہنگامے شروع ہو گئے، ہر بڑی مچھلی چھوٹی کو کھانے لگی۔ کمزوروں کی عزت سے کھیلنا شروع ہوا۔ میراث اور جائداد کے

لئے. خاندان کے خاندان مٹائے جانے لگے۔ سوات میں مسافروں کو لوٹنے کو ایک فخریہ کام سمجھنے لگے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جو صدق دل سے اصلاح دائمی اور بہتری کے خواہاں تھے لیکن بظاہر کچھ کرنے سے تو یہ بھی معذور تھے۔ بس یہ صورتِ حال تو ۱۹۱۵ء میں بادشاہ صاحب کی حکومت بنانے اور پھر اس کے بعد چند سال استحکام حکومت تک رہی۔ اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔

بادشاہ صاحب جیسے عظیم فولادی انسان نے ایک مرتبہ پھر سوات کو دارالامان بنادیا۔ سوات کے اس محسن اعظم نے یہ ریاست کیسے بنائی۔ اس ریاست کی حکومت کیسے مضبوط کی۔ اور کن صبر آزما تکالیف اور مصیبتوں سے انہیں دوچار ہونا پڑا۔ اب یہ دلچسپ روئداد خود بانیٔ ریاست سوات سے سنئے ؛

حصّہ دوم

بانیٔ ریاستِ سوات بادشاہ صاحب کی زبانی
ریاست سوات کی تاریخی کہانی

از ما بجز حکایتِ درسِ دفا مپرس
ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

ے

یا توڑ دوں گا سارے ہی یدِ ساغر و رباب
یا زہرۂ حیات کو رقصاں کروں گا میں
یا اور چھا ہی جائے گی تاریکیٔ حیات
یا بزمِ زندگی کو چراغاں کروں گا میں

(سلام مچھلی شہری)

مرد اهن - معمار ریاست سوات

میاں گل عبدالودود گل شہزادہ بانئے ریاست سوات

سن پیدائش ۱۸۸۱ء

رنگینیٔ نگارِ سخن ہم سے پوچھئے
ہم نے دیا ہے خونِ جگر ہم سے پوچھئے

سیف

والدِ بزرگوار کے فوت ہونے کے بعد ہم دو بھائی رہ گئے۔ عبدالمنان شہزادہ شیریں جان میرے چھوٹے بھائی تو بالکل ہی کمسن تھے۔ جبکہ میری عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی۔ میرے چچا زاد بھائی بھی دو تھے۔ بڑے کا نام عبدالرزاق سید بادشاہ اور چھوٹے کا نام عبدالواحد امیر بادشاہ تھا۔ یہ دونوں میرے چچا میاں گل عبدالحنان کے فرزند تھے۔ سوات کے لوگوں نے متفقہ طور سے مجھے اور سید بادشاہ یعنی ہم دونوں کو صاحبِ سوات کی گدی پر بٹھایا۔ جو کہ میرے والد کی وفات کی وجہ سے خالی ہو چکی تھی۔ اب ہم دونو گویا سجادہ نشین ہو گئے۔ ابتدائی ایام میں تو یہ حالت تھی کہ ہم دونو مل کر کام کرتے تھے۔ صورت حال کچھ عرصہ خوشگوار رہی۔ جب کسی شرعی فیصلے کے لیے سیدو شریف سے باہر جانا پڑ جاتا تو پھر ہم دونو ہی جایا کرتے تھے۔ لیکن اتحاد کی یہ صورت زیادہ عرصہ نہ رہی۔ میرے چچا زاد بھائی بدنیتی پر اُتر آئے۔ انہوں نے میرے والد کے احسانات اور ہمدردانہ برتاؤ وغیرہ سب کچھ فراموش کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اب ہر معاملے میں میرے ساتھ برخلافی شروع کی۔ میرے چچا زاد بھائی

سید بادشاہ نے اس امر کا قطعاً خیال نہ کیا کہ وہ عمر میں ہم سے بڑے ہیں۔ لہٰذا انہیں مشفقانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ہمارے درمیان اختلافات کی یہ خلیج رفتہ رفتہ وسیع ہوتی گئی، اور ہم اک دوسرے سے دُور ہوتے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم نے باقاعدہ اپنے لیے ملازمین بھرتی کر لیے۔ ہمارے یہ ملازمین گویا سپاہی ہوتے تھے۔ جنکو ہم نے مسلح کیا ہوا تھا۔ اور تنخواہ دیا کرتے تھے۔ اپنے آقاؤں کے لیے لڑنا اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا ان ملازمین کے فرائض میں داخل تھا۔ کچھ عرصہ اور گزرنے کے بعد اختلافات نے باقاعدہ دشمنی کی شکل اختیار کی۔ اب ہم چچازاد بھائی نہ رہے بلکہ اعلانیہ اک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ یہ سب کچھ میرے چچازاد بھائیوں کی بدنیتی کا نتیجہ تھا۔ میری طرف سے اتحاد اور خلوص کے ہر کوشش کے باوجود وہ دشمنی پر اتر آئے تھے۔ اس دشمنی اور اختلاف کی وجہ سے ہماری تعلیم اور سجادہ نشینی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اس دشمنی کے دوران میں ایک عجیب واقعہ نے کچھ عرصہ کے لیے عارضی طور سے پھر ہمیں متحد کر دیا۔ واقعہ یوں تھا کہ موضع "سپل ہانڈی" کے میانگاں نے "مرغزار" کی جائیداد ہم سے چھیننے کی کوشش کی۔ میانگاں صاحبان ہمارے خاندانی اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اور "مرغزار" کا علاقہ ہم سے ہتھیا لینا چاہتے تھے۔ لیکن ہم نے انہیں کامیاب ہونے نہیں دیا۔ "مرغزار" کی جائداد پر ان لوگوں نے ہمارے ساتھ تنازعہ شروع کیا۔ لیکن ہم نے انہیں آخر کار مغلوب کر لیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ہم اُن کے خلاف متحد ہو گئے۔ اور ہم طاقتور بھی تھے۔ لہٰذا لڑائیوں میں ہمارا پلہ بھاری ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں کسی جائداد پر تنازعے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ فریقین ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتے۔ جو فریق دوسرے کو ختم کرنے یا قوت سے دبانے میں کامیاب ہو جاتا۔ تو وہی جائداد پر قبضہ بھی کر لیتا۔ عدالتیں یا حکومت تو نہیں تھی "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" والا معاملہ تھا۔ حق ملکیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر بانڈوں میں طاقت ہوتی تو کوئی مالک اپنی ملکیت کو بچا لیتا۔ ورنہ زبردست لوگ زبردستی چھین لیتے۔ بات صرف اتنی تھی کہ جب بھی کوئی شخص جذباتی جذبات سے مغلوب ہو کر کسی دوسرے

فرد کی جائداد ہتھیانے کا ارادہ کر لیتا تھا تو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر لڑائی چھیڑ لیتا۔ اگر فریق ثانی کمزور ہوتا تو یہ اپنے غاصبانہ ارادوں کی تکمیل میں بس کامیاب ہو جاتا۔ اس زمانے میں کمزور ہونا گویا موت کے مترادف[1] تھا۔ سپل ہانڈی کے میانگاں بھی خاندانی اختلافات کی بنا پر ہمیں کمزور سمجھ چکے تھے۔ لیکن ہم نے متحد ہو کر انہیں ناکام کر دیا۔ ہم مقابلتاً کافی طاقتور تھے۔ اور ہم انہیں ختم بھی کر سکتے تھے۔ لیکن ایسے موقعوں پر سوات کے پٹھان بیچ میں آجاتے اور میانگاں کو ہم سے بچا لیتے تھے۔ تاہم مسلسل لڑائیوں میں انہیں شکستیں دے کر ہم نے مغلوب کر دیا۔ پھر دوبارہ انہیں ہمارے مقابلے پر آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مرغزار کی جائداد پر ہمارا قبضہ بدستور قائم رہ گیا۔ مرغزار اور میانگاں کے تنازعات جب ختم ہو گئے تو ہم آپس میں کچھ عرصہ تو متحد اور پُرسکون رہے۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ آخر کار ہمارے خانگی جھگڑے اور تنازعات پھر ابھر آئے۔ اتحاد اور آشتی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے چچا زاد بھائی سید بادشاہ کو بگاڑنے کا بہت شوق تھا۔ دشمنی میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ سید بادشاہ کے ارادے بہت خطرناک تھے۔ وہ حریص قسم کا جابر انسان تھا۔ اس کی طبیعت دنیاوی اقتدار اور خان ازم کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اس لیے ہمارے ساتھ اس کی نہیں بنتی تھی۔ میں پہلے ہی یہ کہہ چکا ہوں کہ اس کے اختلافات کی وجہ سے ایک تو ہم تعلیم سے محروم رہ گئے اور اس کے ساتھ سجادہ نشینی بھی ختم ہوئی۔ جس کا مجھے زیادہ افسوس تھا۔

بارعب شخصیت، مکتبِ عمل کی تعلیم اور شعور کی پختگی:۔

پیشتر اس کے کہ اپنے خاندانی تنازعات اور چچا زاد بھائیوں کے ساتھ عداوتی ہنگاموں کا ذکر کروں، یہاں پر یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ آپس میں اختلافات اور مختلف تنازعات کی وجہ سے ہمیں ایک قسم کی عملی تعلیم حاصل ہوتی گئی۔ عین لڑکپن اور کھیل کود کے زمانے

---

[1] اگرچہ کمزور ہونا ہر زمانے میں موت کے مترادف ہوتا ہے۔

میں زندگی کے ذمہ داریوں کا بوجھ ہمیں اٹھانا پڑ گیا۔ جس کی وجہ سے ہم نے ایک ایسی تعلیم حاصل کی کہ شاید ہی مکتبی اور کتابی تعلیم سے ہم میں اس قدر قابلیت اور صلاحیتیں پیدا ہو جاتیں جو کہ اس تجرباتی اور واقعاتی تعلیم سے ہم میں پیدا ہوئیں۔ کمسنی کے زمانے میں ان خانگی جھگڑوں اور باہمی تنازعات اور پارٹی بازیوں کے متعلق جد و جہد نے ہم میں سیاسی شعور اور تنظیم کی وہ قوت پیدا کی۔ جو آگے چل کر کارزار حیات اور اس ریاست کی تعمیر میں پھر ہر مرحلے پر ہمارے لیے مفید ثابت ہوتی تھی۔ عالم طفولیت میں ہی ہم مکتب عمل کے سرکردہ طالب علم بن گئے۔ ہمارے تعلیم عمل کے ذرائع ذیل تھے:۔

۱۔ اپنے لیے سپاہیوں کو بھرتی کرنا۔ اور انہیں مسلح کرانا، وفادار اور جیالے افراد کو منتخب کرنا۔ اور اس انتخاب میں اپنی فطری ذہانت اور قیافہ شناسی کی صلاحیتوں سے کام لینا۔

۲۔ اپنے ملازمین اور سپاہیوں کو پھر اپنے ڈھب پر لانے کی تعلیم دینا۔ ان کے دلوں میں اپنے لیے ہمدردی اور وفاداری کے جذبات کا پیدا کرنا۔ اور پھر ان جذبات کو ہر وقت بیدار رکھنا۔

۳۔ ان ملازمین کی نگہداشت کرنا، ان کی کمان کرنا اور انہیں قابو میں رکھنا۔ اور ان میں درجہ بندی کرنا۔

۴۔ ملازمین سے حسب منشا اپنی حفاظت اور لڑائیوں کا کام لینا۔ ان کے دلوں کو جیتنا اور پھر فطرتِ انسانی کے مطابق اپنے مستقبل کے ساتھ ان کے خوشگوار مستقبل کے امکانات ان پر واضح کرنا۔ اور انہیں پُر امید رکھنا۔

۵۔ سیدو شریف سے باہر سوات کے مختلف علاقوں میں پٹھانوں میں اپنے ہمدرد ہم خیال، موافقین خفیہ اور اعلانیہ اپنے حمایتی پیدا کرنا، ان کی پارٹی بنانا، اور پھر ہر ایک کا اپنی پارٹی کو مضبوط اور طاقتور بنانا۔

۶ ۔ مختلف تنازعات اور فیصلوں کی صورت میں مخالف پارٹی کو زک دینا۔ اور ہرانے کے لیے منصوبے اور تجاویز سوچنا۔ اور اس سلسلے میں سیاسی داؤ پیچ سے کام لینا۔

۷ ۔ فریقِ مخالف اور اس کے پارٹی کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ اور اس سے اندازہ لگانا، قیاس آرائیوں سے بھی کبھی کام لینا، فریقِ مخالف کے ارادوں اور منصوبوں سے خبردار رہنا اور اپنے عزائم اور منصوبوں سے انہیں بے خبر رکھنا، اور اس ضمن میں ممکن العمل تدابیر سوچنا ان پر عمل کرنا۔

۸ ۔ مخالف پارٹی میں سے طاقتور اور چالاک افراد کو اپنے ساتھ ملانے کی سعی کرنا، اور پھر مخالف پارٹی کو کمزور کرنا۔

۹ ۔ اپنے پارٹی کے افراد اور نیز مخالفین پر اپنی اہمیت اور قابلیت اور مضبوط کرداری ثابت کرنا۔

۱۰ ۔ اپنی پارٹی کے افراد کے ساتھ شادی اور غمی کے تقریبات میں شامل ہونا۔ ایسے موقعوں پر ہر قسم کی اخلاقی اور مالی امداد کرنا۔ یا امداد کی پیش کش کرنا وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ یہ سب مذکورہ امورات تھے۔ جن سے ہمارا واسطہ لڑکپن میں ہی پڑ گیا۔ اور قدرتی طور پر یہ تمام امورات ایسے تھے کہ ان کی وجہ سے ہمیں عملی تعلیم حاصل ہوتی گئی۔ اور ہم بتدریج تاک ہوتے گئے اور دن بدن ہم جہانبانی اور سرداری کے رموز سے آشنا ہوتے گئے۔ لڑکپن میں ہی ہمارے کندھوں پر ایک قسم کی سرداری اور قیادت کا بوجھ آن پڑا جس کی وجہ سے ہم میں قائدانہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں۔ ہمارا سیاسی شعور بیدار اور پختہ ہو گیا۔ پارٹیوں کی سرداری اور ہم دونوں چچا زاد بھائیوں کی آپس میں چپقلش اور پھر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی جد و جہد نے ہم میں اک قسم کی حکومت بنانے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا۔ لیکن حکومت بنانے کے لیے تو یہ لازمی تھا۔ کہ اب ایک پارٹی اتنی طاقتور اور مضبوط ہو جائے کہ دوسری مخالف پارٹی کو یا ختم کر دے اور یا مغلوب کر کے اتنی کمزور اور بے بس بنا دے کہ وہ کسی

قسم کے مزاحمت کے قابل نہ رہے۔ پارٹی کے اس استحکام کا دارومدار رہبرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ دولت اور اسلحہ پر بھی تھا۔ اسلحہ کا انحصار بھی دولت اور رسوخ پر تھا۔ اس کے علاوہ ہر ماحول میں بالخصوص قبائلی آزاد ماحول میں آج سے تقریباً چالیس یا پچاس برس پہلے کے زمانے میں حکومت قائم کرنے کے لیے یہ امر بھی از حد ضروری تھا کہ حکومت بنانے والے کی شخصیت بارعب ہو۔ اور علاقے کے لوگ اس سے متاثر بھی ہوں۔ ظاہر ہے کہ آزاد قبائلی قسم کے سرکش اور جنگجو ماحول میں بغیر رعب قائم کرنے کے حکومت کی جدوجہد عبث اور بیکار ہوتی اور پھر رعب قائم کرنے کے لیے تو خون ریزی اور قتل مقاتلوں کی صورت لازمی ہوتی ہے لیکن خدا کا فضل شامل حال تھا۔ کہ اس سنگدلانہ طریقے سے رعب قائم کرنے کی ضرورت مجھے پیش نہ آئی۔ اگر اظہار حقیقت کو خودستائی پر محمول نہ کیا جائے تو پھر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بچپن ہی سے میری شخصیت بارعب تھی۔ میری طبیعت کچھ اور قسم کی تھی۔ قدرت نے خود ہی ایسے اسباب مہیا کیے کہ میری شخصیت بارعب ہو گئی۔

دیوانہ میانگل:۔

لڑکپن کے ایام میں دیوانے کتوں کو ہلاک کرنا، بلیوں کو مارنا، موذی جانوروں اور فصلوں کو تباہ کرنے والے درندوں کو ہلاک کرنا، گیدڑوں کو بھگانا اور مارنا یہ میرے خاص اشغال تھے۔ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ لڑنا، کشتی بازی کرنا، اپنے ہم عمروں کو ہرانا، دوڑنے کودنے اور تیراکی میں ہمیشہ اپنے ہی ہم عمروں کے ساتھ مقابلے کرنا اور نمبر لے جانا، دوسروں سے ہر معاملے میں سبقت لے جانے کا جذبہ طبیعت پر غالب تھا۔ چنانچہ اس قسم کے مذکورہ اشغال میں ایک خاص لطف محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں عوام الناس میں میں دیوانہ میانگل کے نام سے مشہور تھا۔ "دیوانہ میاں گل" کا یہ خطاب بھی مجھے عجیب طریقے سے ملا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ اس زمانے میں یعنی ہمارے بچپن کے دنوں میں سوات میں یہ رواج تھا کہ جب کبھی کسی

علاقے یا گاؤں میں کوئی شخص مرضِ دیوانگی میں مبتلا ہو جاتا تو اس کے متعلقین اس دیوانے مریض کو علاج اور دعا کے لیے صاحبِ سوات کی مسجد میں سیدو لے آتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بیک وقت تین یا چار یا زیادہ دیوانے مسجد میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ یہ دیوانے جب، یکجا ہوتے تھے تو اپنے مجنونانہ حرکات اور شرارتوں سے بیچارے فرزانوں کو تنگ کرتے تھے۔ کسی کو پتھر مارتے تو کسی کو گالیاں سناتے تھے۔ اگر نماز کا وقت ہوتا تو یہ دیوانے ادائیگی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے تھے۔ اس قسم کے دیوانوں کے ساتھ جو سرپرست ہوتے تھے تو وہ اکثر ان کو قابو کرنے میں ناکام ہو جاتے تھے۔ بس وہ بیچارے تو اپنے فاتر العقل عزیزوں کو حیران نگاہوں سے تکتے رہ جاتے۔ چنانچہ اس قسم کے شرارت پسند دیوانوں کے مزاج کو درست کرنے کی ڈیوٹی اکثر میری ہوتی تھی۔ اکثر ایسے دیوانے کے لیے ایک ہی زناٹے دار تھپڑ کافی ہوتا تھا۔ جب کبھی سیدو میں صاحبِ سوات کی مسجد میں اس قسم کے دیوانے متحد ہو کر لوگوں کو تنگ کرنا شروع کر دیتے تھے تو مجھے بلایا جاتا۔ اور جب میں مسجد کے دروازے میں داخل ہو کر نمودار ہو جاتا اور یہ دیوانے دور سے مجھے دیکھ لیتے تو فوراً سنجیدہ اور معقول صورت بنا کر بیٹھ جاتے۔ اور پھر یہ دیوانے آپس میں ایک دوسرے سے کہتے کہ وہ دیکھو "دیوانہ میاں گل" آگیا، خاموش ہو جاؤ۔ چنانچہ اس کے بعد یہ بالکل سعادت مند بچوں کی طرح خاموش ہو جاتے۔ انہی وجوہات کی وجہ سے لوگ مجھے دیوانہ میاں گل کہتے تھے۔

اس قسم کے واقعات بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ گویا میں خودستائی کر رہا ہوں اور یا اپنی بڑائی آپ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ قدرتی طور سے ابتدا ہی سے میری شخصیت بارعب تھی۔ لہٰذا قبائلی ماحول کے روایات کے مطابق محض رعب جمانے کی خاطر کسی قسم کی خونریزی کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی۔ یہ خدائے پاک کا فضل تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب قدرت

کسی انسان کو دوسرے انسانوں کی رہبری کرنے اور ان کی بھلائی کا کام کروانے کے لیے منتخب کرتی ہے تو قدرت کی طرف سے ایسی تمام صلاحیتیں اور اوصاف بھی اسے ودیعت ہو جاتے ہیں کہ جن کی ضرورت اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے۔ ابتدا ہی سے ایک بارعب انسان ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ بچپن ہی سے میں جفاکش اور جسمانی لحاظ سے ایک چست اور پھرتیلا سپاہی تھا۔ پیدل سفر، دوڑنے، اونچا کودنے، شہسواری نشانہ بازی اور پہاڑ پر چڑھ دوڑنے وغیرہ اوصاف میں اپنے ہمعصروں سے ہمیشہ نہ صرف آگے رہا بلکہ ریکارڈ قائم کرنے کا موجب بھی تھا۔ اس زمانے میں تو موٹر لاریوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ سوات کے افراد قبائلی ماحول میں اس قسم کے مذکورہ اوصاف اور ذاتی شجاعت کی خاصکر ضرورت ہوتی تھی۔ لہٰذا قدرتی طور سے اس ماحول کے لوگ ہماری شخصیت سے مرعوب تھے۔

ذاتی اقتدار اور حکومت کیلئے سید بادشاہ کی جدوجہد:-

باوجود اس کے قدرت نے مجھے قائدانہ اوصاف عطا کیے تھے۔ لیکن اس وقت تک میرے دل میں اس قسم کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا کہ میں حکومت یا ذاتی اقتدار کے لیے جدوجہد کروں۔ عقل سلیم اس کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ اس راہ میں ہمارے خاندانی اختلافات ہی سب سے زیادہ حائل تھے۔ لیکن میرے چچا زاد بھائی سید بادشاہ کے دل میں سب سے اول حکمرانی کا شوق پیدا ہوا۔ میری تمام جدوجہد اس وقت صرف سید بادشاہ کے شر اور خطرناک ارادوں سے اپنے آپ کو اور اپنے چھوٹے بھائی کو محفوظ رکھنے تک محدود تھی۔ سید بادشاہ نے سوات میں اپنی حکومت بنانے کے لیے جدوجہد اور جرگہ بازی شروع کی۔ لیکن سید بادشاہ کی بدقسمتی یہ تھی کہ یا تو اس کی عقل میں کمی تھی اور یا اُسے اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا کہ دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ سید بادشاہ کی شخصیت نامکمل تھی۔ اسکی شخصیت ان اوصاف سے ہی عاری تھی کہ جن کا ہونا حکمرانی کے شوقینوں کے لیے

ضروری ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ نقصان دہ اس کے لیے یہ امر تھا کہ سید بادشاہ کے جرگے عموماً کھلے ہوا کرتے تھے۔ یہ جرگے جو کہ اہم اور خفیہ امورات سے متعلق ہوتے تھے ایک قسم کے کھلے اجلاس ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے اس کے تمام راز فوراً افشا ہو جاتے تھے۔ اور ہم سید بادشاہ کے منصوبوں اور خطرناک عزائم سے گھر بیٹھے خبردار ہو جاتے ہیں نے ایک خاص معتبر آدمی کو اپنا ایلچی بنا کر سید بادشاہ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ حکومت بنانے کے خیالات دل سے نکال دے۔ حکومت بنانے کے لیے تو سب سے اوّل خاندانی اتحاد کی ضرورت ہے۔ چونکہ ہم آپس میں متحد نہیں ہیں لہٰذا حکومت نہیں بن سکتی۔ حکومت کے لیے ہمارا متحد ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اور یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ سید بادشاہ ہمارے ساتھ متحد ہو جائے گا۔ اس لیے کہ دنیاوی حرص و ہوس کے خطرناک عزائم اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ لہٰذا سید بادشاہ کو سمجھا دو کہ ناممکنات کی آرزو نہ کرے۔ اور فضول خون خرابہ کرنے کا باعث نہ بنے۔ ہاں ایک طریقہ البتہ ہے کہ سید بادشاہ سے کہہ دو کہ دو بھائی آپ ہیں اور دو ہم ہیں۔ لہٰذا سادات کے طرز پر ہم چاروں کی حکومت اگر بن جائے تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اس قسم کی حکومت بھی پھر صحیح معنوں میں غیر مستحکم ہوگی کیونکہ سید بادشاہ کے لیے یہ مشکل ہے کہ اپنے حصے پر قانع رہے۔ چنانچہ اس کے بعد میرے ایلچی نے جا کر اُسے یہ تمام پیغام گوش گزار کر دیا۔ اور معاملے کی تمام اونچ نیچ سے اسے بخوبی آگاہ کر دیا۔ سید بادشاہ کو جب میرا پیغام ملا تو اسے بھی احساس ہو گیا کہ واقعی ان حالات میں تو حکومت کی جدوجہد ایک عبث جدوجہد ہے۔ لیکن سید بادشاہ ہو کہ تخریبی ذہن رکھنے والا انسان تھا۔ بجائے نیک سوچنے اور اتحاد کی کوشش کرنے کے اس نے تخریبی طریقوں سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ خاندانی اتحاد کی اہمیت سے باخبر ہو کر سید بادشاہ مصالحت اور اتحاد کے لیے کوشش شروع کر دے گا۔ لیکن اس کے برعکس

اس نے "نہ دم رہے نہ مرض" کے مصداق سوچنا شروع کیا۔ اب وہ ہر وقت اس خیال میں مبتلا رہنے لگا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے کہ وہ بالکل اکیلا رہ جائے۔ ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ اپنے حقیقی بھائی امیر بادشاہ کو بھی ختم کرنے کے درپے ہو گیا۔ تاکہ وہ تنہا ہم تینوں کے جائداد اور املاک کا وارث بن جائے۔ اور پھر اکیلا ہی سوات کا حکمران بن جائے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے سید بادشاہ نے یہ منصوبہ بنایا کہ سب سے پہلے اپنے سگے بھائی امیر بادشاہ کو ایسے خفیہ طریقے سے قتل کر دے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ اس کے بعد ہم دونوں بھائیوں یعنی مجھے اور شہزادہ شیریں جان کو امیر بادشاہ کا قاتل ٹھہرائے۔ اور اس کے قتل کا الزام ہمارے سر تھوپ کر ہمیں قصاص میں قتل کر دے۔ چنانچہ اس طریقے سے وہ اپنے لیے میدان صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے سید بادشاہ نے امیر بادشاہ کے ایک نوکر کو دنیاوی لالچ دے کر تیار کر دیا امیر بادشاہ کے اس نوکر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس نے ایک طرف تو سید بادشاہ سے روپیہ لے لیا اور وعدہ کیا کہ امیر بادشاہ کا کام تمام کر دوں گا، روپیہ لینے کے بعد اپنے مالک امیر بادشاہ کے پاس آکر اسے ان تمام واقعات سے بھی خبردار کر دیا۔ امیر بادشاہ کو جب سید بادشاہ کے خطرناک عزائم کا پتہ چل گیا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور اسی عالم گھبراہٹ میں میرے پاس آگیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ کہ "اب میں آئندہ کے لیے آپ کے ساتھ رہوں گا۔ میری پارٹی آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کے صلاح اور مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کروں گا۔ اور نیز اپنے بھائی سید بادشاہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھوں گا۔" امیر بادشاہ نے مجھے یہ نہیں بتلایا کہ سید بادشاہ اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔ بعد میں دوسرے ذرائع سے مجھے حالات معلوم ہوئے تو میں نے امیر بادشاہ سے دریافت کیا۔ اس نے تب کہیں جاکر مجھے ان تمام واقعات کی کہانی سنائی۔ اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ سید بادشاہ کے عزائم دن بدن خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے اقتدار اور دنیاوی عیش و عشرت کی خاطر وہ ہم تینوں کی زندگی ختم کرنا چاہتا ہے اور "اک پنتھ دو کاج" کے مصداق دو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنے

ہی سگے بھائی کو قتل کر کے اس کی جائیداد کا مالک بھی بن جائے گا، دوسرے یہ کہ اپنے بھائی کے قصاص میں پھر مجھے قتل کرے گا۔ اس کے بعد میرا چھوٹا بھائی رہ جائے گا تو اسے بھی کسی نہ کسی طریقے سے ختم کر دے گا۔ پھر ہم سب کی جائیداد کا مالک بن کر بلا شرکتِ غیر حکمرانِ سوات بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اب ہم یہ سوچنے لگے کہ سید بادشاہ کے اس شر سے خود کو کیسے بچائیں۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ پیشتر اس سے کہ وہ ہم تینوں کو ختم کر دے ہم ہی ہمت کر کے کیوں نہ اس کو ختم کر دیں۔ کہ اس بلا سے جان ہی چھوٹ جائے۔ مصالحت اور اتحاد کی تو ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ سید بادشاہ کو ملکِ عدم کی طرف روانہ کرنے کے سوا اور کوئی علاج ہی نہیں تھا۔ مجبور ہو کر ہم نے سید بادشاہ کو ٹھکانے لگانے کا ایک منصوبہ بنایا۔ لیکن بدقسمتی سے راز ہمارا بھی فاش ہو گیا۔ لیکن اس موقعے پر بھی میری فطری ذہانت ہی کام آئی۔

راز افشا کرنے والا میرا اپنا ہی نوکر تھا۔ جس وقت ہم جرگہ (کانفرنس) کر رہے تھے۔ اور سید بادشاہ کو ختم کرنے کی تجویز پر بحث کر رہے تھے تو میرا وہی نوکر جرگے سے اُٹھ کر باہر جانے لگا۔ اس کے تیور دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اس شخص کے خیالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ہماری محفل سے اٹھ کر اب یہ سید بادشاہ کے پاس جائے گا۔ چنانچہ جس وقت وہ اُٹھ کر باہر جانے لگا اُس کے پیچھے پیچھے میں بھی روانہ ہوا۔ رات کا وقت تھا اور رات اندھیری تھی۔ دوسرے راستے سے نکل کر میں اس کی راہ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے ماموں کے پاس اس کے گھر جا کر کہہ دیا کہ تم فوراً جا کر سید بادشاہ کو کہدو کہ تمہارے قتل کے لیے تیاری ہو چکی ہے۔ اور خود یہ شخص کانیلی چلا گیا۔ جس وقت اس کا ماموں سید بادشاہ کے پاس جا رہا تھا تو میں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اور تحکمانہ لہجے میں ڈانٹ کر اسے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ تم جس مقصد کے لیے جا رہے ہو وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کو اپنے ساتھ ہی اپنے ڈیرے پر لے آیا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ سید بادشاہ کو ہمارے منصوبوں کا پتہ نہ

گے۔ کچھ دن تو اسی ادھیڑبُن میں گزر گئے۔ مجھے کئی بار یہ موقع ملا کہ مسجد میں سید بادشاہ کو ختم کردوں۔ لیکن خانۂ خدا میں خونریزی کرنا میرے نزدیک انتہائی نامناسب اور بُزدلانہ فعل ہے۔ اس لیے اجتناب کرتا رہا۔ اس دوران میں سید بادشاہ ہمیں ختم کرنے کے ہر ممکن طریقے استعمال کرتا رہا۔ لیکن ہم غافل نہیں تھے۔ اب اس نے ایک اور چال چلی۔ اپنی پارٹی کے دو آدمیوں کو جو میانگان تھے اس کام پر مامور کیا۔ کہ وہ آئیں اور ہمیں بظاہر مصالحت کی بات چیت کے لیے بطور جرگہ بٹھائیں۔ اور پھر ہمیں باتوں میں لگا کر غافل رکھیں۔ اتنے میں سید بادشاہ کے آدمی آکر ہمیں قتل کردیں گے۔ ہمارے لیے اب کوئی چارہ نہیں تھا بجز اس کے کہ اپنے پروگرام پر عمل کریں اور یا خود کو سید بادشاہ کے خطرناک عزائم کے حوالے کردیں۔ کیونکہ اب کی بار دو دن کے اندر ہی اس نے ہم تینوں کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ ذرا سی غفلت یا لاپرواہی بس موت کے مترادف تھی۔ چنانچہ دوسرے روز جب اتفاقاً میرا اور سید بادشاہ کا آمنا سامنا ہوگیا تو اس ملاقات کا نتیجہ یہی نکلا کہ میرے ہی پستول سے ایک گولی سنسناتی ہوئی نکل کر سید بادشاہ کے سینے میں داخل ہوکر پار نکل گئی۔ سید بادشاہ جس کی عمر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا، وہ جو ہمیشہ ہر وقت دوسروں کو ختم کرنے کے منصوبے باندھتا تھا خود ختم ہوگیا۔ ایک ہی گولی کھا کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس موقع پر اگر میں درگزر کرلیتا تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا کہ سید بادشاہ مجھے ختم کردیتا۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ کہ وہ مجھ سے پہلے ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس کی موت اسی وقت اسی روز مقدّر ہوچکی تھی۔ نوشتۂ تقدیر پورا ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد گھوڑے پر سوار ہوکر تنہا سیدو سے مینگورہ روانہ ہوگیا۔ تاکہ مینگورہ میں اپنے دوست رحمت اللہ خان کو حالات سے آگاہ کرکے اس سے مشورہ لوں۔ راستے میں سید بادشاہ کی پارٹی کے چند افراد کا سامنا ہوا لیکن ان کو صرف زبانی رعب سے ہی مرعوب کرکے راستے سے ہٹا لیا۔ یہ ۱۹۰۴ء کا زمانہ تھا۔ آج سے ترپن سال پہلے کا زمانہ سیدو اور مینگورہ کے درمیان سڑک وغیرہ نہیں تھی۔ بلکہ سیدو سے مینگورے تک یہ تمام علاقہ تو

ایک عجیب اور سنسان جنگل تھا۔ چنانچہ میرے بعد سیدو شریف میں اس موقع پر امیر بادشاہ میرے نوکروں کو ساتھ لے کر سلام پور چلا گیا۔ مینگورہ سے پھر روانہ ہو کر میں ہوڈی گرام چلا گیا۔ اس تگ و دو کا مطلب یہ تھا کہ سید بادشاہ کی پارٹی کے پٹھانوں کے شر سے اب خود کو بچائیں۔ چنانچہ آٹھ دس دن کے اندر اندر میں نے ارد گرد کے مواضعات میں پھر کر اپنی پارٹی مضبوط کی۔ اس کے بعد دوبارہ اپنے گھر سیدو آ گیا۔ امیر بادشاہ اور ہمارے ملازمین بھی سلام پور سے واپس سیدو آ گئے۔ سید بادشاہ ۱۹۰۴ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کی جائداد اور املاک پر اس کے بھائی کا قبضہ ہو گیا۔

سید بادشاہ کے بعد:۔

سید بادشاہ درمیان سے ہٹ گیا۔ اب اس کا بھائی امیر بادشاہ اور ہم دو بھائی رہ گئے سیدو شریف میں دو سال کا عرصہ تو ہم نے اتحاد اور عافیت سے گزار لیا۔ لیکن سید بادشاہ کی جائیداد اور دولت پر قابض ہونے کے بعد اب امیر بادشاہ طاقتور ہو گیا۔ طاقت کے ساتھ اس کے خیالات بھی اب خراب ہونے شروع ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ ہم نے اسے سید بادشاہ سے بچایا اور ہر طرح سے اس کی سرپرستی کی۔ اس نے اس کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا۔

ستم ظریف نجومی:۔

پیشتر اس کے کہ اب امیر بادشاہ کے ساتھ اپنے اختلافات وغیرہ کا ذکر کروں، یہاں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ بعض واقعات اور باتیں زندگی میں حیرت انگیز طریقے سے درست ثابت ہوتی ہیں۔ اور اگر اسے اتفاقاتِ زمانہ کہا جائے تو پھر یہ اتفاقات بھی کچھ عجیب ہوتے ہیں۔

۱۹۰۳ء میں غالباً ایک بار میں اور امیر بادشاہ دونوں اکٹھے پشاور گئے تھے۔ سید بادشاہ

زندہ تھا۔ ابتدا ہی سے میری طبیعت کچھ ایسی ہے کہ میں نجومیوں کے نجوم وغیرہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہوں۔ پشاور میں اتفاقاً ایک نجومی کے ساتھ ہماری ملاقات ہو گئی۔ چونکہ نجومیوں کی باتوں پر میں عقیدہ نہیں رکھتا تھا، اس لیے میں نے امیر بادشاہ سے کہا کہ چلو آگے چلیں۔ لیکن اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ نجومی اب ملا ہے تو کیا ہرج ہے۔ اب اس کو اپنے ہاتھ (ہتھیلیاں) دکھلائیں۔ دیکھیں تو سہی کہ یہ کیا کہتا ہے۔ چنانچہ امیر بادشاہ نے اس نجومی کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ نجومی بھی بلا کا ذہین تھا، امیر بادشاہ کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا تو اُسے کہا کہ عنقریب تمہیں ایک شخص کی میراث ملنے والی ہے۔ یہ سن کر امیر بادشاہ کی تو وفورِ مسرت سے باچھیں کھل گئیں۔ میری طرف کن انکھیوں سے دیکھا کہ گویا نجومی تو اپنے علم کا ماہر ہے۔ اور اس کا کہا درست ثابت ہوگا۔ اب امیر بادشاہ مُصر ہوا کہ تم بھی اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ میں نے ہر چند انکار کیا کہ میں ان لغویات کا قائل نہیں ہوں۔ یہ نجومی لوگ تو ہر ایک سے میراث ملنے کو کہتے ہیں۔ لیکن امیر بادشاہ کی ضد سے مجبور ہو کر میں نے اپنا ہاتھ اسے دکھلا دیا۔ نجومی نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تمہیں دو آدمیوں کی میراثیں ملنے والی ہیں۔ میں نے فوراً اس کی بات باتوں میں ٹال دی۔ اور ایسی باتیں شروع کیں کہ امیر بادشاہ کی توجہ دوسری طرف مائل کر دی۔ میرا مطلب یہی تھا کہ یہ نجومی لوگ تو پیسے بٹورنے کی خاطر ایسی باتیں کرتے ہیں امیر بادشاہ کے دل میں کہیں سچ مچ توہمات پیدا نہ ہو جائیں۔ بہرصورت اس وقت تو میں امیر بادشاہ کے خیالات بدلنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن کسے معلوم تھا کہ ستم ظریف نجومی کی پیشین گوئی پوری ہو جائے گی۔ امیر بادشاہ کے متعلق تو یوں ہوا کہ ۱۹۰۱ء میں ہی اسے سید بادشاہ کی میراث مل گئی لیکن میرے متعلق اس کی پیشین گوئی کیسے پوری ہوئی، اس کے متعلق اب واقعات بیان کرتا ہوں۔

امیر بادشاہ کے ساتھ اختلافات :-

سید بادشاہ کی وفات کے دو سال بعد امیر بادشاہ نے میری مخالفت شروع کی۔

جس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ سوات کے بعض شرارت پیشہ لوگ جو کہ ابتدا ہی سے ہمارے خاندانی اختلافات کے باعث چلے آرہے تھے، نے امیر بادشاہ کو اب میرے برخلاف اُکسانا شروع کیا۔ کہ اس نے تمہارے بھائی سید بادشاہ کو قتل کیا ہے، اب تم اس سے اپنے بھائی کا انتقام لے لو۔ حالانکہ امیر بادشاہ کو یہ حقیقت بخوبی معلوم تھی کہ مجھ سے زیادہ وہ خود اپنے بھائی کے قتل کا مدعی تھا۔ اور اسے قتل کرنے میں مجھ سے پیش پیش تھا۔ اور امیر بادشاہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہم نے انتہائی مجبور ہوکر سید بادشاہ کو قتل کیا۔ ورنہ وہ ہم تینوں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے تو صرف حفاظتِ خود اختیاری کا حق استعمال کیا تھا۔ لیکن اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود امیر بادشاہ ہمارے ساتھ دشمنی پر اُتر آیا۔ محض اس لیے کہ اب وہ طاقتور ہو چکا تھا۔ سید بادشاہ کی دولت، اس کے گھوڑے، اس کا اسلحہ وغیرہ سب کچھ جب امیر بادشاہ کو مل گیا تو سید بادشاہ کی طرح حکومت اور ذاتی اقتدار کے خواب اب یہ بھی دیکھنے لگا۔ یہاں پر اب پھر میں اس حقیقت کا اظہار کروں گا کہ ہمارے اختلافات کو دشمنی کا رنگ دینے والے سوات کے چند خوانین ہی تھے۔ جو کہ جابر اور ظلم پسند جیسے تھے۔ یہ لوگ ہمارے خاندانی اتحاد سے خواہ مخواہ خوفزدہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہم متحد ہو جائیں تو یقیناً ان کے مظالم اور ظالمانہ لوٹ کھسوٹ کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ لہٰذا ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہمارے درمیان ہمیشہ ناچاقی پیدا کرتے تھے۔ اس دوران میں پھر ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ جس کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے پھر ہمیں متحد ہونا پڑ گیا۔ اگرچہ یہ واقعہ بیرونی تھا لیکن کچھ دنوں کے لیے ہمارے اتحاد کا باعث بنا۔

نواب دیر کے برخلاف جنگ اور امیر بادشاہ کی موت :-

مالاکنڈ ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ نے خان بہادر عطا محمد خان پولیٹیکل تحصیلدار کو ہمارے پاس بھیجا، اور اس کے ذریعے ہمیں کہلوا بھیجا کہ نواب دیر کے برخلاف متحد ہو جاؤ، اور

سوات کے علاقہ نیک پی خیل سے نواب دیر کو نکال دو۔ اس زمانے میں شمالی سوات کے نیک پی خیل اور شموزئی کے علاقے نواب دیر کے تسلط میں تھے۔ مذکورہ علاقے نواب دیر کے تسلط میں کیسے آئے اس کے متعلق آگے چل کر ذکر آئے گا۔

پولیٹیکل ایجنٹ کے کہنے پر ہم نواب دیر کے برخلاف متحد ہو گئے۔ ذاتی طور پر میں خود اس وقت نواب دیر کے ساتھ دشمنی کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن مجبور ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دریائے سوات کے پار مقبوضہ علاقوں کے عوام بھی نواب صاحب کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے۔ چنانچہ ایک لشکر ساتھ لے کر ہم نے علاقہ نیک پی خیل میں نواب صاحب کے ایک قلعہ پر حملہ کر دیا۔ نواب صاحب کے ملازمین کو شکست دے کر ہم نے قلعے کو فتح کر لیا۔ اس زمانے میں سوات کے لوگ بار بار ہمیں حکومت بنانے کی دعوت دیتے رہے۔ لیکن ہم انکار کرتے رہے۔ وجہ وہی تھی کہ ہم متحد نہیں تھے اور مجھے یقین تھا کہ حکومت کامیاب نہیں ہو گی۔

نواب صاحب کے لشکر کو شکست دینے کے بعد سوات کے لوگوں نے پھر ہمیں حکومت بنانے کے لیے کہا۔ اس موقع پر ہم نے کہہ دیا کہ آپ لوگ ہمیں عشر دیا کریں۔ تاکہ ہم باقاعدہ لشکر منظم کریں۔ چنانچہ اس غرض کے لیے ایک قومی جرگہ (جنرل قومی اجلاس) طلب کیا گیا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ جرگہ کامیاب نہ ہوا۔ لہٰذا ہم واپس سیدو شریف چلے آئے کچھ دنوں کے بعد ہمارے عارضی اتحاد کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اب پھر ہم تھے اور وہی عداوت اور اختلافات کا سلسلہ تھا۔ میرے چچا زاد بھائی امیر بادشاہ نے مجھے ختم کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ لیکن غافل میں بھی نہیں تھا۔ صلح صفائی کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ امیر بادشاہ صرف موقعہ کی تاک میں ہے۔ ان حالات میں ایک بار پھر میں اپنے بچاؤ کے لیے مجبور تھا۔ چنانچہ اتفاقاً پہاڑ میں سبب کہ ہم دونوں شکار کھیلنے گئے تھے میرا اور امیر بادشاہ کا سامنا ہو گیا۔ دونوں طرف سے ہاتھوں کو حرکت دی گئی۔ ٹرائیگر دبائے

گئے اغاز ہوئے۔ نتیجۃً امیر بادشاہ کی ہلاکت ظہور میں آگئی۔ امیر بادشاہ کے نوکروں نے کچھ ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں فوراً حالات سے روانہ ہو کر سیدو شریف چلا آیا۔ میرا بھائی شہزادہ شیریں جان مجھے سیدو سے باہر ملا جو کہ میری طرف آنے کو روانہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسے اپنے ساتھ واپس کر کے ہم اپنے گھر پہنچ گئے۔ امیر بادشاہ کے ملازمین وغیرہ نے خود بخود آکر ہماری اطاعت قبول کی۔ اس وقت جبکہ میں نے اور امیر بادشاہ نے سیدو بادشاہ کو ختم کیا تھا تو سوات کے علاقہ بابوزئی کے پٹھانوں نے لشکر کر کے ہمارے گاؤں سیدو شریف کو لوٹ لیا تھا۔ اُس وقت بھی میری یہی خواہش تھی کہ سیدو کو پٹھانوں کے تاخت و تاراج سے بچایا جائے۔ لیکن امیر بادشاہ نوکروں کو ساتھ لے کر سلام پور کی طرف نکل گیا۔ اس لیے مجھ اکیلے کے بس میں نہیں تھا کہ سیدو شریف کی حفاظت کروں۔ اب جو امیر بادشاہ قتل ہو گیا اور علاقہ بابوزئی کے پٹھانوں کو دوبارہ سیدو کو لوٹنے کا بہانہ مل گیا، تو ہم نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اب کے بار سیدو کو بچائیں گے۔ چنانچہ پٹھانوں کا ایک لشکر جو سیدو کی طرف آرہا تھا اپنے ملازمین کو ساتھ لے کر سیدو سے باہر ہم نے مذکورہ پٹھان لشکر کا مقابلہ کیا۔ آخر کار خدا کے فضل و کرم سے ہم نے پٹھان لشکر کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک مشکل کام تھا جس میں خدائی امداد کی بدولت ہمیں کامیابی نصیب ہوئی۔

علاقہ بابوزئی کی تشریح

وادیٔ سوات کا علاقہ اندرونی طور سے مختلف خطّوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً بابوزئی، متوریزی ازی خیل، شامیزئی، نیک پی خیل، شھوزئی وغیرہ۔ ان سب میں بابوزئی کا علاقہ ابتداہی سے ایک مرکزی اہم خطہ چلا آرہا ہے۔ خطہ بابوزئی کے پٹھان نسبتاً زیادہ چالاک اور باتونی ہیں ان کی مثال گویا شہریوں کی ہے۔ ان کے عادات وخصائل بھی شہریوں جیسے ہیں۔ ایک چالاک شہری اور مخلص دیہاتی کے اوصاف وخصائل میں جو فرق ہوتا ہے خطۂ بابوزئی کے پٹھانوں اور سوات کے دوسرے علاقوں کے پٹھانوں میں بعینہٖ اسی قسم کا فرق ابتداہی سے چلا آرہا ہے۔ بابوزئی کا علاقہ چونکہ سوات میں زیادہ اہمیت کا حلاقہ ہے، اس کتاب میں بھی بابوزئی کا ذکر بار بار آئے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ بابوزئی کی تشریح کی جائے۔

علاقہ بابوزئی سے مراد سوات کا وہ علاقہ ہے جس میں منگلور سے لے کر مٹیار تک کے مواضعات شامل ہیں۔ درہ جمبیل، کوکاری اور درۂ سیدو کے مواضعات بھی اور مینگورہ کا مرکزی شہر بھی اس علاقے میں شامل ہے۔

اس گنجان آباد علاقے کے متحدہ لشکر کا مقابلہ کرنا اور پھر اُسے پسپا کرنا ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔ لیکن ہم نے ہمت کر کے اس موقع پر سیدو شریف کو ان لوگوں کی لوٹ مار سے بچا لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ لشکر کے سرکردہ افراد میں کچھ میرے طرفدار اور بہی خواہ بھی تھے۔ امیر بادشاہ ۱۹۰۷ء میں اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

امیر بادشاہ کے بعد:۔

میرے دونوں چچا زاد بھائی سید بادشاہ اور امیر بادشاہ درمیان سے ہٹ گئے اگرچہ ان دونوں کی نیت تو ہم دونوں بھائیوں کو ہٹانے کی تھی، لیکن وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اب ہم دونوں سگے بھائی رہ گئے، یعنی میں اور شہزادہ شیریں جان۔ میں نے سوچا کہ سوات کے شرپسند عناصر ضرور ہم دونوں بھائیوں کے درمیان بھی نفاق اور دشمنی پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اور یقیناً اس سلسلے میں تقسیم جائیداد کا حیلہ ہی موضوع شرارت بنائیں گے اور پھر جائیداد کی تقسیم میں بھی اچھے بُرے کا سوال درمیان میں لائیں گے۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ اس معاملے میں بھی میں خود ہی پہل کردوں۔ چنانچہ میں نے جائیداد اور املاک کی تقسیم دو حصّوں میں کردی۔ پھر دونوں حصوں میں جو اچھا اور زرخیز تھا وہی اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ شیریں جان کو دے دیا۔ اور نسبتاً خراب حصّہ خود لے لیا۔ یہ سب کچھ محض اس لیے کیا کہ میرے بھائی کے دل میں پُرخاش پیدا نہ ہو۔ اپنی طرف سے تو میں نے یہ پیش بندی اس لیے کی کہ ہم دونوں میں دشمنی اور نفاق پیدا ہونے کا کوئی خدشہ نہ رہے لیکن افسوس کہ اس ایثار اور کشادہ دلی کے باوجود میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ سوات کے وہ شرارت پسند عناصر جنکی ابتدا دی زندگی کا انحصار ہی ہمارے خاندانی اختلاف پر تھا، خاموش بیٹھنے والے کہاں تھے اُنکی کوششیں بارآور ہوگئیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میرے بھائی شہزادہ شیریں جان کے خیالات بدل گئے۔ اس نے میرے برخلاف علٰحدہ پارٹی بنالی اور اس پارٹی میں بھی مخالف افراد کو شامل کردیا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے ایسا کرنا شہزادہ موصوف کی انتہائی زیادتی تھی۔ اس نے قطعاً میری قربانیوں کا خیال نہ کیا اور نہ ہی برادرانہ محبت کا کچھ پاس کیا۔ اس موقعہ پر زیادہ تعجب مجھے اسوقت ہوا جبکہ میں نے یہ دیکھا کہ شہزادہ شیریں جان کے اکسانے والوں میں اب کے بار وہ لوگ بھی شامل تھے جو میرے معتمد دوست تھے۔ اور مجھے بارہا اپنی دوستی کا یقین دلا چکے تھے۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی حفیظ

مجھے تعجب ہوا کہ جو لوگ ہماری خیر خواہی کا دم بھرتے تھے اب وہی حضرات میرے بھائی کو میری دشمنی پر ابھارتے تھے۔ وہ بے ایمان تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ میں ہر معاملے میں اُن کا محتاج رہوں۔ چنانچہ اس موقع پر میں نے انتہائی فراست اور تدبر سے کام لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے عزیز بھائی کے ساتھ دشمنی کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ لہذا میں نے حکمتِ عملی سے کام لیا۔ وہ لوگ جو میرے بھائی کی پارٹی میں شامل تھے درپردہ میرے پاس بھی آتے تھے اور مجھے کہتے تھے کہ ہم تو آپ کی پارٹی میں شامل ہونے کو تیار ہیں۔ چنانچہ میں نے کوشش کی اور اپنے بھائی شہزادہ شیریں جان پر اُن لوگوں کا دوغلا پن اور منافقت ثابت کی۔ چنانچہ شہزادہ موصوف ان لوگوں سے بدظن ہو کر ان کے خلاف ہو گئے۔ ہم دونوں بھائیوں نے مصالحت کر لی۔ اور پھر چھ مہینے کے اندر اندر ہم نے اس قسم کے منافق مزاج شرارتیوں سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں اب آگے کے حالات بیان کروں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ پارٹی جسے پشتو میں "ڈلہ" کہتے ہیں کی تشریح کروں۔ اس لیے کہ ریاست سوات کی تاریخ میں پارٹی کا بہت بڑا دخل اور عمل رہا ہے۔ ابتدا ہی سے ہمارے اس ماحول میں پٹھانوں کے مابین پارٹی بازی کا طریقہ چلا آ رہا ہے۔

پارٹی جسے پشتو میں "ڈلہ" کہتے ہیں:۔

یوسف زئی پٹھانوں میں پارٹی کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ سلسلہ تنظیم ابتدا ہی سے چلا آ رہا ہے اور اب تک بدستور قائم ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ اندرون سوات مختلف خطوں میں مثلاً خطہ بابوزئی، شامیزئی وغیرہ ہر ایک خطے میں دو معزز خوانین کی سرکردگی میں اس خطے کے پٹھانوں کی دو پارٹیاں ہوتی ہیں۔ پارٹی کا لیڈر "خان" اپنی پارٹی کے افراد کی دُنیاوی

اور سیاسی مفادات کا نگران ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آتا ہے تو پارٹی کا اجلاس منعقد ہوتا ہے اور پھر اسی اجلاس میں کوئی متفقہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پارٹی کے افراد پارٹی لیڈر اور پارٹی کی وفاداری اور دوستی کے پابند ہوتے ہیں۔ لیکن علاقے کی دونوں پارٹیوں میں عموماً اختلافات اور دشمنی ہوا کرتی ہے۔ شادی اور غمی کے تقریبات میں تنازعات اور مقدمات میں پارٹی کا خان امداد اور تعاون بھی کرتا ہے۔ مختلف معاملات پر بحث اور مشورہ کرنے کے لیے خان کے مکان یعنی ڈیرے پر جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے افغانی روایات کے مطابق مہمانداری بھی خان کے فرائض میں شامل ہے۔ اب جبکہ حکومت بننے کے بعد باقاعدہ تفصیلیں اور عدالتیں قائم ہیں تو پارٹیوں کے درمیان خون خرابے تک نوبت نہیں پہنچتی۔ تمام متنازعہ فیہ معاملات پُرامن طریقے سے عدالتوں میں فیصلہ کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا جب کبھی کسی فرد کا مقدمہ ہوتا ہے تو پارٹی کا خان اس کی وکالت کے لیے عدالت میں بھی اس کے ساتھ جاتا ہے۔ اس طرح فریق مخالف کے ساتھ بھی اپنا خان موجود ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ پارٹی بازی کا یہ طریقہ افغان قوم میں ابتدا سے چلا آرہا ہے، یہ ایک قسم کا تنظیمی سلسلہ بھی ہے تمام دنیاوی اور قومی معاملات مل جل کر فیصلہ کیے جاتے ہیں۔ پارٹی میں صرف پٹھان ہی شامل ہوتے ہیں۔ تجارت پیشہ طبقے کے افراد یا ملاؤں اور دست کاروں کو شامل نہیں کیا جاتا ہے تاہم ابتدا میں ان لوگوں میں سے بھی ہر فرد پارٹی کے کسی پٹھان فرد کے ساتھ وابستہ ہوتا تھا اس لیے بالواسطہ یہ بھی شامل ہوتے تھے۔ تجارت پیشہ یا دوسرے مذکورہ قسم کے افراد کی پارٹی میں عدم شمولیت کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ انہیں حقیر یا کمتر مخلوق تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ذریعۂ معاش اور دنیاوی مفادات، تجارتی اغراض کی وجہ سے پارٹی بازی سے متعلق معاملوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ نیز اس قسم کے افراد میں بیرونی لوگ بھی ہوتے ہیں، اس لیے انہیں مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ ابتدا ہی سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ ہر ایک خطے میں دو پارٹیاں چلی آرہی ہیں۔ اس قسم کی پارٹیوں کی بنیاد خاندانی برادریوں

کے سلسلے پر قائم چلی آرہی ہے۔ پارٹی کے وقار اور مفاد کو ہر حالت میں مقدم سمجھا جاتا ہے۔ پٹھان قوم کے ہر قبیلے میں مختلف صورتوں میں یہ سلسلہ تنظیم چلا آرہا ہے۔ سوات کے اندر مختلف خطوں میں یوسف زئی قبیلے کی ذیلی شاخیں آباد ہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ریاست سوات کے قیام کی جدوجہد اور اس سے پیشتر کے قبائلی دور میں میں نے پارٹی بازی کے سلسلہ میں لڑائیوں کے ساتھ کامیاب سیاست بھی استعمال کی ہے۔ بہرصورت یہ امر واضح ہے، کہ ایک مضبوط پارٹی بنانے کے بعد مجھے اس جدوجہد میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

۱۹۰۰ء میں فریضۂ حج کی ادائیگی اور اسلامی ممالک کی سیاحت

شہزادہ شیرین جان کے ساتھ صلح صفائی ہو گئی تو میں نے سوچا کہ پھر خدا جانے زندگی کی مصروفیتوں سے نجات ملے یا نہیں، اب کچھ نہ کچھ موقع ہے لہٰذا ضروری ہے کہ حج کا فریضہ ادا کروں۔ ابتدا ہی سے میری دلی خواہش ایک یہ بھی تھی کہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کر کے بزرگان اسلام کی یادگاروں اور مزاروں کی زیارت کروں۔ خانگی حالات اور خاندانی تنازعات اور جھگڑوں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی، ملکی حالات اجازت نہیں دیتے تھے، اب جو اپنے بھائی کے ساتھ صحیح ہو گیا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں حج کے لیے روانہ ہو گیا۔ حج کا یہ سفر میں نے بحری جہاز سے کیا۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد میں نے شام، فلسطین، مصر اور حجاز جیسے اسلامی ممالک کا دورہ کیا۔ اس سفر میں ساڑھے پانچ مہینے کا عرصہ میں نے گزار لیا۔ اس کے بعد واپس اپنے وطن اور گھر آ گیا۔ آج پچاس سال کے بعد بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اس زمانے میں حج کا فریضہ ادا کر کے میں خداوند کریم کا مشکور ہوں کہ مجھے موقع نصیب ہوا۔ ورنہ اس کے بعد تو زندگی کی بے پناہ مصروفیتوں سے فرصت ملنی مشکل تھی۔

ساڑھے پانچ مہینے کا عرصہ وطن سے باہر گزار کر جب میں واپس اپنے وطن آیا تو میں حیران رہ گیا، کیونکہ حالات بدل گئے تھے۔ اس دوران میں یار لوگوں نے میری عدم موجودگی کو غنیمت جان کر میرے بھائی شہزادہ شیرین جان کو میری دشمنی کے لیے تیار کیا ہوا تھا۔ اور اس تمام عرصے میں جبکہ میں سوات سے باہر رہا میرا بھائی ایک مضبوط اور طاقتور پارٹی بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ سوات کے حالات کافی حد تک میرے حق میں ناموافق اور مایوس کن تھے

شہزادہ شیریں جان کی پوزیشن مضبوط ہو چکی تھی۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی میں ان افراد میں سے ہوں جو مایوس ہو جاتے ہیں۔ سخت نامساعد اور ناموافق حالات میں بھی کبھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ اور نہ ہی کبھی موت سے گھبرایا ہوں۔

مجھے افسوس ضرور تھا کہ میرا بھائی دوسروں کا آلۂ کار بن کر خواہ مخواہ دشمنی پر آمادہ ہوا ہے حالانکہ دشمنی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں نے جائیداد میں اسے اچھا حصہ دیا تھا۔ اور کمی بھی کچھ نہیں کی تھی۔ کسی قسم کی زیادتی بھی میری طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ برادرانہ شفقت و ایثار کے عوض دشمنی کرنا اس کی سراسر زیادتی تھی۔ جب میں حج کے لیے روانہ ہوا تو میرے بھائی نے وعدہ کیا تھا کہ نصف آدمی میرے پارٹی میں ہوں گے اور نصف آدمی اس کے پارٹی میں شامل ہوں گے۔ اور جن لوگوں کو زک دے کر ہم پارٹیوں سے نکال چکے تھے ان کے متعلق یہ اقرار تھا کہ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے ہماری پارٹیوں سے باہر رہیں گے۔ لیکن میری عدم موجودگی میں شہزادہ موصوف نے اپنے قول و اقرار کی بھی کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ دشمن بن چکا تھا۔ نادان اتنا بھی نہیں سمجھتا تھا کہ جو لوگ میرے دشمن ہو سکتے ہیں وہ اس کے دوست کیسے ہو سکتے ہیں۔ بہرصورت میں نے حالات سے نبٹنے کا تہیہ کر لیا۔ شہزادہ موصوف سے تو میں نے صرف اتنا کہا کہ تم نے اس وقت جبکہ میں حج کے لیے جا رہا تھا میرے ساتھ کچھ وعدے کیے تھے، تمہیں اپنے ان وعدوں کی پابندی کرنا تو لازمی تھا۔ لیکن شہزادہ موصوف بجائے کوئی معقول جواب دینے کے جو بے زبانی سے مجھے مزید غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ مل کر اب پارٹی بناؤں جنہیں ہم نے مل کر زک دی تھی۔ لہٰذا مجبور ہو کر میں نے انہی کے ساتھ پارٹی بنائی۔ لیکن میری پارٹی کمزور تھی۔ شہزادہ شیریں جان اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھا۔ لہٰذا اب اعلانیہ ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے ہم دونوں بھائیوں کے درمیان لڑائیاں شروع ہوئیں۔ ان لڑائیوں کی ابتدا بھی میرے بھائی شہزادہ شیریں جان کی طرف سے ہوئی۔ نمبر کے خان سعداللہ خان

میرے دوست اور خیر خواہ تھے۔ ان ابتدائی لڑائیوں میں شہزادہ شیریں جان کا پلہ بھاری رہا۔ اس لیے کہ ان کی پارٹی طاقتور تھی۔ ایک دفعہ تو تھوڈیگرام میں ہم محصور ہو گئے۔ میرے ساتھ بہت کم آدمی تھے۔ سعد اللہ خان نے مجھ سے کہا کہ تم مینگورہ جاؤ اور اپنی پارٹی مضبوط کرنیکی کوشش کرو۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرح ان کے محاصرے سے نکل کر میں چلا آیا۔ میرے آنے کے بعد شہزادہ شیریں جان نے میری پارٹی کے آدمیوں کو شکست دے دی۔ ہمیں شکست دینے کے بعد تو اس کی طاقت اور بھی بڑھ گئی۔ اب اس نے ارادہ کیا کہ سیدو شریف پر چڑھائی کرکے اعلانیہ مجھے ختم کر دے۔ اور ساتھ ہی میرے حصے کے نصف سیدو پر بھی قبضہ کر لے واضح رہے کہ سیدو گاؤں کی تقسیم ہم دونوں بھائیوں میں اس طرح ہوئی تھی کہ بیچوں بیچ گزرنے والے پہاڑی نالے کے مشرقی سیدو میرا تھا اور مغربی شہزادہ موصوف کا تھا۔

سیدو شریف پر شہزادہ شیریں جان کا پہلا حملہ:۔

ایک مقررہ منصوبے کے مطابق شہزادہ صاحب اپنے لشکر کو آراستہ کرکے سیدو کی طرف بڑھا۔ لیکن اس موقعہ پر وہ مجھے مغالطے میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس نے یہ چال چلی کہ لشکر سمیت سیدو کے بالمقابل شمال مغربی پہاڑ کے دامن پر سے ہوتا ہوا اسلام پور کی طرف بڑھنے لگا۔ واضح رہے کہ اسلام پور سیدو پہاڑ کے پیچھے ایک گاؤں ہے۔ یہ گاؤں تقسیم جائیداد کے سلسلے میں میرے حصے میں آیا تھا۔ اور میری ملکیت ہے۔ شہزادہ کا خیال یہ تھا کہ لشکر کو اسلام پور کی طرف لے جائے اور پھر رات کو بے خبری کے عالم میں سیدو پر یلغار کرے۔ میں اس کی چال سمجھ گیا۔

اگرچہ ہم اس وقت بالکل تیار نہیں تھے، تاہم میں نے اس وقت یہی سوچا کہ اب فوراً شیریں جان کے اس لشکر پر فائرنگ شروع کرنی چاہیئے۔ تاکہ یکلخت لڑائی چھڑ جائے اور دشمن کو بغیر کسی سکیم اور تدبیر کے جنگ لڑنے پر مجبور کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ہم فائدے

میں رہیں۔ چنانچہ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے آدمیوں سمیت ان پر فائرنگ شروع کردی۔ ان کے لشکر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اس طرح بغیر کسی سوچی سمجھی سکیم کے لڑنے پر مجبور ہو گئے۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی ہم نے ان کے کئی آدمی ہلاک کر دیے۔ اب انہوں نے سیدو کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ہم نے دفاعی جنگ شروع کی۔ اور انہیں ہٹاتے رہے۔ حتیٰ کہ رات سر پر آ گئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ اب لڑائی کی حالت یہ تھی کہ سیدو کے مشرقی طرف ہمارے رہائشی محلات عقبیٰ کی سڑک کے متصل پہاڑی کہ جہاں اب شاہی مقبرہ ہے اس پہاڑی پر شہزادہ شیریں جان کے آدمی قابض ہو گئے۔ اب ہماری حالت نازک تھی۔ رات کا عالم تھا۔ ہر قیمت پر یہ ضروری تھا کہ مذکورہ پہاڑی سے دشمن کو قبضہ اٹھانے پر مجبور کیا جائے۔ اس اثنا میں سلام پور سے ہماری امداد کے لیے کچھ آدمی پہنچ گئے۔ اور پہنچتے ہی انہوں نے بغیر کسی حکم اور ہدایات کے دشمن پر حملہ کر دیا۔ لیکن جلد ہی پسپا ہو کر ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ اب اس تاریکی کے عالم میں جو پھر لڑائی شروع ہو گئی تو ایک دفعہ تو عین قضا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں اپنی زندگی بچا لایا۔ موت کے منہ میں جاتے جاتے خدا کے فضل سے واپس ہو گیا۔ ہوا یوں کہ اندھیرے میں اپنے آدمیوں سے کٹ کر دشمن کے لشکریوں میں گھس گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید یہ میرے ہی آدمی ہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان کھڑے ہو کر اُن کو بآوازِ بلند ہدایات دینے لگا۔ شاباش۔ مارو، یہ کرو، وہ کرو وغیرہ۔ کہ اتنے میں اُن میں سے ایک شخص نے آواز سے مجھے پہچان لیا۔ اور شور مچانا شروع کیا کہ یہ تو گل شہزادہ ہے۔ "مارو"۔ میں نے فوراً فائر کر کے شور مچانے والے کو ٹھنڈا کر دیا۔ اس کے بعد دشمن کے چار پانچ آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر کے واپس کھسک آیا، اور اپنے آدمیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو میری رائفل خراب ہو چکی ہے مجبور ہو کر ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں میرے کچھ اور آدمی بھی آ کر میرے ساتھ مل گئے۔ اب میں نے اپنے آدمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور پھر مخالف فریق پر حملہ

کردیا۔ لیکن مذکورہ پہاڑی پر وہ بھی کچھ مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔ اس دوران میں ہم نے زبانی ہلا گلا اور شور مچا کر دشمن کے آدمیوں کو خوفزدہ کیا۔ صبح صادق کے قریب ہم نے آخر کار دشمن کو مذکورہ پہاڑی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

دوسرے روز:۔

دوسرے روز جبکہ نصف سیدو سے ہم دشمن کو پسپا کر چکے تھے سیدو کے درمیان ایک چٹان پر سلام پور والے لشکر کو متعین کرنے کا خیال میرے دل میں تھا۔ یہ پہاڑی مقام بہت اہم تھا۔ لیکن سلام پور والے گذشتہ شب کے حملے میں شکست کھا کر واپس ہو چکے تھے لہٰذا میں اس سوچ میں تھا کہ اتنے میں اسی مذکورہ چٹان پر دشمن کے آدمیوں نے وہ کوٹھہ نما مورچہ بنانا شروع کیا جسے پشتو زبان میں گڑھ کہتے ہیں۔ قبائلی لڑائیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جب کسی مقام پر قبضہ کر لیتے تھے تو وہیں ایک "کوٹھہ" بنا لیتے تھے۔ اسی کو گڑھی کہتے ہیں۔ اس کوٹھہ نما مورچے میں پھر لشکری متعین کر دیتے ہیں۔ جب دشمن کے آدمیوں نے اس اہم پہاڑی پر قبضہ کر لیا تو مجبور ہو کر ہم نے جواباً سیدو کے مشرقی جنوبی پہاڑی پر اسی قسم کا مورچہ بنا لیا لیکن اس کے ساتھ ہی حکمتِ عملی سے کام لینا بھی شروع کیا۔ وہ کام یہ تھا کہ میں نے یہ مشہور کرایا کہ جس پہاڑی پر شہزادہ شیریں جان کے آدمیوں نے مورچہ بنایا ہے۔ یہ تو جنگی قابلیت کا ایک احمقانہ مظاہرہ ہے۔ ورنہ ایسے غیر اہم اور ناموزوں پہاڑی پر قبضہ جمانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ چونکہ یہ باتیں ہم آپس میں باآوازِ بلند کرتے رہے۔ لہٰذا مذکورہ پہاڑی پر متعین لشکری بھی سنتے رہے۔ چنانچہ ہماری ان باتوں سے متاثر ہو کر یاروں نے مذکورہ پہاڑی مقام سے خود بخود قبضہ اٹھا لیا۔ اس طرح محض زبانی جمع خرچ کے ذریعے ہم نے دشمن سے اک اہم مورچہ خالی کرا دیا

اب جو ہم نے دیکھا تو دشمن کا لشکر سیدو کے سامنے پہاڑ کے دامن پر سے ہوتا ہوا پھر بطرف کاٹیلی واپس جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ان کا ارادہ "سوات ہوٹل" کے ساتھ

والی پہاڑی پر قبضہ کرنے کو ہے۔ اور اس طرح ہمیں بالکل بے دست و پا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنے لشکریوں کو کھانا کھلا دیا اور شام ہوتے ہی مذکورہ مقام پر ان کے پہنچنے سے پہلے قبضہ کر لیا۔ اور فی الفور وہی کوٹھہ نما مورچہ بنانا شروع کر دیا۔ جسے پشتو میں "گڑھ" کہتے ہیں۔ جب ہم اس مورچے کی چار دیواری مکمل کر چکے، تو دشمن نے حملہ کر دیا۔ لڑائی پھر اندھیرے میں شروع ہوئی۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہمیں کچھ معمولی شکست سے قریب تر کر دیا تو دو دفعہ ہم نے انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ یہ رات کا وقت تھا کہ سرداری کے میدان کا لشکر نعرے لگاتا ہوا ہماری امداد کو سیدو کی طرف سے پہاڑ سے اُتر کر آتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ اِس موقع پر مجھے انتہائی خوشی حاصل ہوئی کیونکہ ہماری حالت نازک تھی اور ہم شکست سے قریب تر تھے۔ اس خوشی کے عالم میں پھر مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ کہیں دشمن کے امدادی نہ ہوں۔ بہرصورت میں ان کی پیشوائی اور استقبال کے لیے میں اپنی جگہ سے افسر آباد کے مقام تک چلا آیا۔ وہ ہمارے ہی معاون نکلے۔ میں نے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور پھر مختلف مقامات پر اُن کو متعین کر دیا۔ اب میں نے "سلام پور" کے لشکر کو واپس سیدو میں اس چٹان پر قبضہ جمانے کے لیے روانہ کر دیا جس کو مخالف لشکر کے آدمی بقول ہمارے غیر اہم سمجھ کر خالی کر چکے تھے۔ چنانچہ میرے آدمیوں نے جا کر مذکورہ چٹان پر مورچہ بنا لیا۔ پھر اس کے بعد سیدو کے مغربی حصے پر حملہ کر دیا۔ جو کہ شہزادہ شیریں جان کا حصہ تھا۔ شہزادہ موصوف خود سیدو میں اپنے قلعے میں موجود تھا اور خود ہی میرے آدمیوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن جب شہزادہ کے پاس کارتوس ختم ہو گئے تو مجبور ہو کر میرے پاس صلح کرنے کے لیے پیغام بھیج دیا۔ میں نے بظاہر اوّل تو انکار کیا، پھر صلح منظور کی۔ اس دوران میں مالاکنڈ سے ایک پولیٹیکل تحصیلدار بھی ہمارے مابین صلح کرانے کے لیے پہنچ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس لڑائی سے کچھ عرصہ پیشتر پولیٹیکل ایجنٹ مالاکنڈ نے ہم دونوں بھائیوں سے پُرامن رہنے اور خون خرابہ نہ کرنے کی ضمانتیں لی تھیں۔ چنانچہ ہم دونوں بھائیوں کے درمیان صلح

ہوگئی۔ لیکن یہ صلح عارضی تھی۔

سیدو کی یہ پہلی لڑائی ختم ہوگئی۔ اس لڑائی میں ہم کامیاب رہے۔ اس سے پیشتر بھی میرے اور شہزادہ شیریں جان کے درمیان چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئی تھیں۔ لیکن ان سب لڑائیوں کے حالات بیان کرنے کی خاص ضرورت نہیں۔ سیدو شریف پر شہزادہ کی چڑھائی اور پھر وہ بھی اس طریقے سے کہ ہمیں مغالطے میں ڈال کر شب خون مارنے کا پروگرام۔ یہ سب امورات شہزادہ شیریں جان کی طرف سے میرے حق میں بیرحمانہ تھے۔ پھر اگر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجاتا، تو خدا جانے ہمارا حشر کیا ہوتا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

مخالفت کی ابتدائی وجوہات اور صرف علاقہ بابوزئی کی حکومت

سیدو شریف کی اس جنگ کے بعد جو کچھ ہوا اس کے متعلق بیان کرنے سے پہلے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ امیر بادشاہ میرے چچازاد بھائی کی زندگی میں ایک دفعہ غالباً ۱۹۰۵ء میں صرف علاقہ بابوزئی پہ ہماری محدود حکومت بن چکی تھی۔ لیکن وہ ایک سیاسی چال تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ میرے چچازاد بھائی امیر بادشاہ کی پارٹی ہم سے علیحدہ تھی اسے حکمرانی کا بھی شوق تھا۔ لہٰذا میری پارٹی کے آدمیوں نے میرے صلاح و مشورے سے امیر بادشاہ سے کہا کہ ہم حکومت بنانے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد علاقہ بابوزئی کی حکومت بنی۔ اس طریقے سے کہ کاٹیلی، بلوگرام، تختہ بند اور درۂ سیدو کے مواضعات کے لوگوں نے عشر دینا تسلیم کیا۔ چنانچہ حکومت بننے کے بعد جب امیر بادشاہ کی پارٹی ختم ہوگئی تو میں نے اپنی پارٹی کے آدمیوں سے کہہ دیا کہ میں حکومت کا شوقین نہیں ہوں۔ لہٰذا آپ لوگوں سے کوئی عشر وغیرہ نہیں لوں گا۔ اس لیے کہ میں خوب جانتا ہوں کہ کسی بھی علاقے میں بیک وقت دو حکمرانوں کی حکومت نہیں چل سکتی۔ اس طریقے سے صرف اپنے مخالف امیر بادشاہ کو ختم کرنا ہی میرا مقصود خاطر تھا۔ امیر بادشاہ کی وفات ہونے کے بعد بابوزئی پٹھانوں نے ہمارے برخلاف اتحاد کرلیا۔ علاقہ بابوزئی کے جو لوگ ہمارے دوست اور بہی خواہ تھے ان کو بھی ہمارے ساتھ شامل تصور کرکے ان کے برخلاف بھی متحد ہوگئے لیکن بہت جلد میں نے جدوجہد کرکے بابوزئی پٹھانوں میں ایک مضبوط پارٹی بنالی۔ اب علاقہ بابوزئی کے پٹھان دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک حصہ تو میری پارٹی کے ساتھ

وابستہ ہوئے۔ اور دوسرے حصے نے گویا مخالف پارٹی کی حیثیت اختیار کی۔ لیکن بہت جلد ہم نے اس مخالف پارٹی کو مغلوب کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ اب گویا منگلور کے پل سے لے کر مانیار تک اس علاقے کے لوگوں نے ہماری حکومت تسلیم کی۔ اس کے بعد میرے بدطینت دوستوں نے میرے بھائی شہزادہ شیریں جان کو اکسانا شروع کر دیا۔ ہر وقت اسے میری دشمنی اور مخالفت پر اکساتے رہے۔ حتیٰ کہ اسے مخالفت پر آمادہ کر لیا۔ اب میں نے سوچا کہ یہ شرارت پیشہ دوست اس وقت تک باز نہیں آئیں گے جب تک کہ ان سب کو ٹھکانے نہ لگایا جائے۔ لیکن مشکل یہ تھا کہ وہ لوگ جو کہ میرے دوست مشہور ہو چکے تھے ان کو ٹھکانے لگانا بھی کسی صورت میں مجھے منظور نہیں تھا چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ حکومت ہی چھوڑ دوں۔ میں نے حکومت چھوڑ دی لیکن اس کے بعد بھی حالت یہ تھی کہ بقول کسی شاعر کے ؎

مطلب پست دوست نہ آئے قریب میں
بیٹھا رہا لیے ہوئے "دامِ وفا" کو میں

اب مناسب تو یہی تھا کہ جن دوستوں کی دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے حکومت چھوڑ دی تھی وہ اب راہِ راست پر آتے۔ لیکن یہ شریر دوست تو مجھ سے اب بھی خوفزدہ تھے کہ گویا میں انہیں کہیں ہلاک نہ کر دوں۔ چنانچہ اپنے ایک خاص معتمد دوست رحمت اللہ خان کے ذریعے میں نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ میرے دل میں انہیں ہلاک کرنے کے خیالات یا ارادے قطعاً نہیں ہیں۔ لہٰذا یا ردل کو بے جا توہمات دلوں میں سمانے نہیں چاہئیں اس قسم کی تسلی دلانے کے بعد اب وہ لوگ بے خوف ہو گئے۔ بجائے نادم یا شرمندہ ہونے کے اب جانی نقصان سے بے خوف ہو کر کھلے بندوں میرے بھائی شہزادہ شیریں جان کو میری دشمنی کے لیے تیار کرنے لگے۔ بس یہیں سے ہم دونوں بھائیوں کے درمیان مخالفت شروع ہو گئی۔

جنگِ سیدو کی عارضی صُلح کے بعد:-

صلح ہونے کے بعد شہزادہ شیریں جان کے پارٹی میں اختلاف رونما ہوا۔ چنانچہ اس کی پارٹی دو فریقوں میں بٹ گئی۔ مخالف ایک فریق نے میرے ساتھ بات چیت شروع کی۔ اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم آپ کے ساتھ پارٹی میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی رضامندی ظاہر کی۔ وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ "تمبر" گاؤں لے گئے تاکہ وہاں تمبر میں پارٹی میں شمولیت کے متعلق شرائط پر مفصل بات چیت کی جائے۔ اس دوران میں شہزادہ شیریں جان کو بھی ان واقعات کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے انتہائی دانشمندی اور تدبر سے کام لے کر اس موقع پر اس روٹھے ہوئے فریق کو منا لیا۔ اب یہاں پر میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میرا بھائی شہزادہ شیریں جان ایک قابل سیاستدان اور شجاع انسان تھا۔ بہرصورت اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس روٹھے ہوئے فریق نے مجھے تو تمبر میں بٹھا لیا اور خود یہاں آ کر شہزادہ شیریں جان کے ساتھ دوبارہ راضی ہو گئے۔ میرے ساتھ انہوں نے بدعہدی کی۔ چنانچہ میں بھی تمبر سے واپس چلا آیا۔ اور ان لوگوں سے میں نے کہہ دیا کہ آپ لوگوں نے از خود میرے ساتھ پارٹی میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی۔ اور پھر بغیر کسی وجہ کے اپنے قول و اقرار سے بھی آپ لوگ منحرف ہو گئے اور میرے ساتھ بدعہدی کی۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنے ساتھ بُرا کیا ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہوا اب دیکھیں گے کہ اونٹ کونسی کروٹ بدلتا ہے۔ ان واقعات کے بعد میں نے بھی حکمتِ عملی سے کام لینا شروع کیا۔ جس فریق نے میرے ساتھ بدعہدی کی تھی میں نے اُن کے مخالف دوسرے فریق سے بات چیت شروع کی۔ اس دوران میں چونکہ ہمارے درمیان عارضی صلح تو ہو چکی تھی لہٰذا اپنے بھائی شہزادہ شیریں جان کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ہم نے اسی بدعہد گروپ پر مشترکہ لشکر کشی کر دی۔ اور انہیں مغلوب کر کے ان سے گڑھیاں وغیرہ چھین لیں۔ واضح رہے کہ گڑھی سے مراد ایک چھوٹا قلعہ

یعنی کوٹلہ ہوتا ہے۔

سلام پور میرا گاؤں تھا۔ لڑائی کے دوران میں یہ گاؤں شہزادہ شیریں جان کے قبضہ میں آیا تھا۔ اور سلام پور کے لوگ سیدو میں میرے پاس جلاوطنی کے دن بسر کر رہے تھے۔ اب اس موقعہ پر میں نے شہزادہ شیریں جان سے کہا کہ آپ سلام پور سے قبضہ اٹھالیں۔ تاکہ یہ جلاوطن لوگ پھر اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں۔ سلام پور کے عوض ان مفتوحہ گڑھیوں میں جو کہ ہم نے اس بدعہد گروپ سے قبضہ کی ہیں زیادہ حصہ لے لیں۔ لیکن شہزادے نے میرے مطالبے کو تسلیم نہ کیا۔ بلکہ چالاکی پر اتر آیا۔ اور محض زبانی جمع خرچ سے مجھے ٹالنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ باوجود صلح ہونے کے بھی شہزادہ کی نیت صاف نہیں ہے اب میں نے بھی اس موقع پر چالاکی سے کام لینا مناسب سمجھا۔ میں نے یہ کیا کہ مینگورہ شہر میں میری جائیداد تھی۔ جمعروز ملک جو کہ علاقہ بابوزئی کے جابر خوانین میں سے ایک مضبوط اور طاقتور خان تھا، مینگورہ میں اس کے کارندے اور آدمی ہمارے آدمیوں کو تنگ کرتے تھے۔ میں نے شہزادہ شیریں جان سے کہا کہ میں تو مینگورہ میں ایک دوسری گڑھی بھی بنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مینگورہ میں پہلے سے ایک گڑھی بنانا تو ہماری مقرر تھی لیکن اس کے ساتھ ہی جو گڑھی ہم نے پٹھانوں سے لڑائی میں فتح کر کے قبضہ میں کی تھی اب اس پر میرے بھائی کے آدمی قابض تھے۔ اور میرے بار بار کہنے کے باوجود بھی واپس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز علی الصباح میں سیدو سے مینگورہ جانے کے لیے اس نیت سے روانہ ہوا۔ کہ وہاں جا کر ایک گڑھی کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دوں۔ جب میں جا رہا تھا تو راستے میں اس مقام پر کہ جہاں اب جہان زیب کالج کی گراؤنڈز ہیں مجھے مینگورے کا نوشیرواں خان ملا۔ جو کہ اب بھی زندہ ہے اور اس زمانے میں میری پارٹی کا ایک سرکردہ خان تھا۔ نوشیرواں خان کے ساتھ ہی شہزادہ شیریں جان کا ایک خاص معتمد آدمی بھی تھا۔ میرے بھائی نے اس موقع پر نوشیرواں خان کو یہ پٹی پڑھائی تھی کہ آپ سیدو جائیں اور گل شہزادہ (یعنی مجھ سے) گڑھی

کی واپسی کا مطالبہ کرو۔ اگر اس نے آپ کا کہا نہ مانا تو پھر واپس چلے آؤ اور میرے ساتھ پارٹی میں شامل ہو جاؤ۔ پھر میں تمہیں گڑھی واپس کر دوں گا۔ میرے بھائی کی پالیسی یہ تھی کہ بابوزئی کے ایک سرکردہ خان کو میری پارٹی سے علیحدہ کر کے ہماری پارٹی کمزور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں اس چال کو سمجھ چکا تھا۔ لہٰذا نوشیرواں خان نے جب یہ تمام ماجرا بیان کیا تو میں نے اسے شہزادہ کے اس ہمراہی معتمد سے علیحدہ کر کے سمجھا دیا کہ مینگورہ میں دوسری گڑھی درحقیقت میں بنانا نہیں چاہتا۔ یہ تو شہزادہ شیریں جان سے گڑھی واپس کرانے کے لیے میں نے سب ڈھونگ رچایا ہے۔ اب تم واپس جاؤ اور شہزادہ شیریں جان کے ساتھ بظاہر قول و اقرار کرو اسے کہو کہ مجھے گڑھی واپس کر دو۔ تو پھر میں آپ کی پارٹی میں شامل ہو جاؤں گا۔ لیکن میں نے نوشیرواں خان کو یہ بھی سمجھایا تھا کہ جب وہ گڑھی واپس کر دے گا تو پھر میں بھی گڑھی واپس کر دوں گا۔ چنانچہ نوشیرواں خان نے بھی جیسا کہ میں نے اسے سمجھایا تھا شہزادہ شیریں جان کو واپس جا کر ویسے ہی کہہ دیا۔ اب شہزادہ موصوف نے میرے پاس آدمی بھیجے اور یہ پیغام بھیجا کہ نوشیرواں خان گڑھی واپس مانگتا ہے۔ میں نے جواباً کہلا بھیجا کہ مجبوری ہے۔ جب تم واپس کر دو گے تو پھر مجھے بھی قبضہ اٹھانا پڑے گا۔ چنانچہ جونہی کہ شہزادہ موصوف نے گڑھی سے قبضہ اٹھا کر ان کے حوالے کر دی تو پھر میں نے بھی گڑھی واپس کر دی۔ نوشیرواں خان بدستور میری پارٹی سے وابستہ رہ گئے۔ شہزادہ کی پالیسی اس معاملے میں ناکام ہو گئی۔

کاٹیلی کی لڑائی :-

شہزادہ شیریں جان کی ذہنیت ہم پر کھل گئی۔ اور ان اختلافات نے ہم پر یہ واضح کر دیا کہ وہ بدستور دشمنی میں مصروف ہے اور موقع ملنے پر ہمیں تباہ کرنے میں کوئی دریغ کرنے والا بھی نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے سیدو سے جا کر اپر سوات کے علاقہ میں اور پھر تحصیل چارباغ کے علاقہ میں سے ایک لشکر تیار کیا۔ اور پھر لشکر سمیت سیدو شریف چلا آیا۔ اس موقع پر میں

نے بھی یہ چال چلی کہ اپنے آدمیوں کے ذریعے یہ افواہ اڑائی کہ ہم سلام پور پر قبضہ کرنے کے لیے لشکر لے آئے ہیں۔ لیکن درحقیقت میرا ارادہ تو کاٹیلی پر قبضہ کرنے کا تھا۔ کیونکہ یہ گاؤں شہزادہ شیریں جان کے تصرف میں تھا۔ چنانچہ دوسرے روز علی الصباح جب سیدو سے لشکر روانہ ہونے لگا تو میں نے بآوازِ بلند لشکریوں کو یہ حکم سنایا کہ سلام پور کی طرف بڑھو۔ اس طرح احکام سنانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ سیدو میں شہزادہ صاحب کے مخبروں کو مغالطے میں رکھوں۔ تاکہ وہ غلط اطلاعات پہنچائیں۔ اور کسی کو بھی ہمارے صحیح ارادوں کا پتہ نہ چلے۔ میں نے عقبے کے قریب پہاڑ کے دامن میں پہلے سے اپنے آدمی متعین کیے تھے کہ جونہی ہمارا لشکر پہاڑی کے قریب پہنچے تو اسے سلام پور جانے سے روکیں اور کاٹیلی کی طرف واپس کردیں۔ چنانچہ اس طریقے سے ہم اپنے لشکر کو سیدو کے مشرقی پہاڑ کے دامن پر سے گزرتے ہوئے سیدھا بطرف کاٹیلی لے آئے۔ شہزادہ شیریں جان کا لشکر ہمارے تعاقب میں دوسرے راستے سے سلام پور روانہ ہوگیا۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ ہم سے پہلے سلام پور پہنچ جائیں اور دفاع کو مضبوط کردیں۔ لیکن جب سلام پور کو لشکر پہنچا اور وہاں میدان خالی پایا پھر تو یاروں کو خوب غصہ آیا۔ کچھ اپنی حماقت اور نادانی پر اور کچھ ہماری کامیاب چالبازی پر ادھر میں نے اپنے لشکر کو کاٹیلی میانگاں میں متعین کرکے نصف لشکر کو کاٹیلی پہاڑ میں مختلف مورچوں پر متعین کردیا۔ شہزادہ شیریں جان کا لشکر سلام پور کے محاذ سے نہایت تیزی کے ساتھ واپس ہوا۔ چونکہ وہ طاقتور تھے اور اپنی طاقت پر نازاں بھی تھے لہٰذا پہنچتے ہی فوراً انہوں نے ہم پر حملہ کردیا۔ لڑائی شروع ہوگئی۔ کاٹیلی گاؤں اور پہاڑی مورچوں سے بیک وقت ان پر فائرنگ شروع کرکے ہم نے ان کے بہت سارے آدمی ہلاک کردیے۔ بہت جلد ہم نے ان کو کاٹیلی کے بڑے گاؤں کی طرف دھکیل دیا۔ دوپہر کو میں نے اپنے لشکر کو وقت مقررہ سے ذرا پہلے کھانا کھلایا اور لڑائی شروع کی۔ اس لڑائی میں بھی ہم نے انہیں شکست دے دی۔ شام کا کھانا پھر اپنے لشکریوں کو وقت سے کچھ پہلے کھلا دیا اور پھر تیسری بار لڑائی

چھیڑ کر ہم نے پھر بھی انہیں زک دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ اب رات ہو چکی تھی۔ لہٰذا دونوں طرف سے خاموشی اختیار ہوئی۔ کیونکہ رات کی سیاہی میں لڑائی لڑنا مشکل تھا۔

دوسرے روز:۔

پھر صبح، دوپہر، شام کو تین مرتبہ حسب سابق پھر ایک دوسرے پر حملے کر کے ہم نے لڑائی لڑی۔ اس طریقے سے کاٹیلی کی یہ لڑائی متواتر تین دن تک جاری رہی۔ تیسرے دن میں نے اپنے لشکر کو کاٹیلی گاؤں کے عین اوپر چٹان پر لا کر کھڑا کیا۔ ادھر قمبر سے امدادی لشکر بھی پہنچ گیا۔ مورچوں کو مضبوط کر کے پھر ہم ان کے پیچھے نیچے اترے۔ شیریں جان کے اوسان خطا ہو گئے۔ چنانچہ جو لوگ اس کی پارٹی سے کٹ کر میرے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ ان کے ساتھ دوبارہ ساز باز اور جرگے شروع کیے۔ اس موقع پر ان کو شہزادہ موصوف نے بہت زیادہ لالچ بھی دیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ شہزادہ شیریں جان ہم کو اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ہمیں چند گڑھیاں بھی دیتا ہے میں نے ان کو صلاح دی کہ بظاہر تم لوگ اس کے ساتھ مل جاؤ اور گڑھیوں پر قبضہ بھی کر لو پھر اس کے بعد دوبارہ میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ جب ان مذکورہ گڑھیوں پر بھی ہمارا قبضہ ہو گیا تو پھر شہزادہ شیریں جان کو مکمل شکست دے کر ہم نے اسے کاٹیلی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کاٹیلی گاؤں پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ اب شہزادہ موصوف کے قبضے میں صرف ایک گاؤں تختہ بند رہ گیا۔ لیکن باہمی تنازعات اور لڑائیوں کا یہ سلسلہ بھی جاری رہا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شہزادہ موصوف اور اس کی پارٹی پھر مضبوط ہو گئے۔ اب انہوں نے دوبارہ لڑائی لڑ کر کاٹیلی اور قمبر پر قبضہ کر لیا۔ لیکن کاٹیلی میں ایک گڑھی صرف ہمارے پاس رہ گئی۔ اب پھر ہم ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی داؤ پیچ کھیلنے لگے۔ شہزادہ شیریں جان کی پارٹی کے کچھ آدمی ہمارے ایک سرکردہ رکن پارٹی کو بار بار اپنی پارٹی میں شمولیت کے لیے

کہتے تھے۔ میں نے اپنے اُس آدمی سے کہہ دیا کہ اگر وہ لوگ تمہیں کاٹیلی کی ایک گڑھی دیتے ہیں تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔ کچھ دنوں کے لیے ان کے ساتھ مل جاؤ۔ گڑھی پر قبضہ کر لو اور پھر ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ اس طرح کم از کم ایک گڑھی تو بغیر کسی کشت وخون کے ہمارے ہاتھ آجائے گی۔ چنانچہ اس شخص نے میرے کہنے کے مطابق ہی عمل کیا۔ گڑھی پر قبضہ کر کے پھر ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس طریقے سے ہم نے ان سے اک گڑھی تو ہتیالی۔ کچھ عرصہ کے بعد لڑائی لڑ کر ہم نے ان سے ایک دوسری گڑھی بھی چھین لی۔ اس طریقے سے شہزادہ شیریں جان کو ہم نے دوبارہ کاٹیلی سے بیدخل کر دیا۔ اب صرف قمبر رہ گیا۔

قمبر کی لڑائی:۔

قمبر جو اُس زمانے میں بھی ایک بڑا گاؤں تھا۔ دشمن فریق کی چار گڑھیاں تھیں ہم نے قمبر پر لڑائی شروع کی۔ یہ لڑائی متواتر چھ مہینے جاری رہی۔ ہماری خاندانی لڑائیوں میں یہ سب سے زیادہ طویل لڑائی تھی۔ قمبر کے ساتھ ہی ہم نے شہزادہ شیریں جان کے رہائشی گاؤں تختہ بند کو بھی محاصرے میں لے لیا۔ واضح رہے کہ تختہ بند میں محصور ہو کر شہزادہ صاحب نے صلح کے لیے درخواست کی۔ چنانچہ صلح ہو گئی۔ قمبر پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ تختہ بند پر شہزادہ شیریں جان کا قبضہ ہی بدستور رہنے دیا گیا۔ قمبر کی اس طویل لڑائی میں فریقین کا کافی مالی اور جانی نقصان ہوا لیکن آخر کار ہم فتحیاب ہو گئے۔

جنگِ قمبر کے دو دلچسپ واقعات:۔

قمبر کی لڑائی جاری تھی، ہم نے قمبر میں ایک پہاڑی پر قبضہ کرنے اور پھر اسی پہاڑی سے فریق مخالف کے ساتھ لڑنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ میں نے اپنے لشکریوں کو مذکورہ پہاڑی پر متعین کر کے وہی کوٹھہ نما مورچہ گڑھی بنانا شروع کیا۔ چار دیواری صرف مکمل

ہو چکی تھی۔ کہ لڑائی شروع ہوئی۔ رات کا وقت تھا، سردی کا موسم تھا، آسمان پر کالی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں اور ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی۔ چاروں طرف ایک خوفناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سردی نے اپنا زور دکھانا شروع کیا۔ تو میرے ساتھی جو کہ مذکورہ پہاڑی پر میرے ساتھ تھے شدتِ سردی کی تاب نہ لاکر آہستہ سے کھسک گئے۔ میرے ساتھ صرف میرے چند ذاتی ملازم رہ گئے۔ نیچے ارد گرد دشمن کا لشکر پڑا تھا۔ میرے پاس نہ تو گرم کمبل تھا اور نہ ہی کوئی اونی کوٹ یا چغہ وغیرہ تھا۔ صرف ایک ترپال ٹاٹ کا ہمارے پاس تھا جس کے اندر میرے وہ ملازم بارش اور سردی سے بچنے کی خاطر دبکے پڑے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر اگر دشمن کو یہ پتہ لگ جائے کہ میں اس پہاڑی پر اکیلا ہوں، اور لشکری غائب ہیں تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اب دشمن کو چکمہ دینا چاہیئے چنانچہ وہ صبر آزما اور قیامت خیز رات میں نے ایک مستعد سنتری کی طرح کھڑے کھڑے گزار دی۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ کوئی گرم لباس بھی پہنے ہوئے نہیں تھا۔ اس حالت میں اپنے ارد گرد پڑے ہوئے دشمن کے آدمیوں کو باتوں میں لگائے رکھا۔ رات بھر انہیں دھکیلتا رہا کہ اب تو خیر رات ہے صبح ہو جائے تو پھر دیکھیں گے۔ رات بھر ان لوگوں کو باتوں میں لگائے رکھ کر اس حقیقت سے بے خبر رکھا کہ گویا ہم اکیلے ہیں۔ اور ہمارے بہادر لشکری تو نو دو گیارہ ہو چکے ہیں۔ صبح ہونے سے پیشتر پھر میرے لشکری بھی پہنچ گئے لیکن وہ رات جس طریقے سے میں نے گزاری میری زندگی کی راتوں میں ایک یادگار رات تھی۔

دوسرا واقعہ:۔

تبر میں صرف ایک ہی گڑھی تھی۔ اتفاقاً یہ حالت ہوئی کہ میرے ساتھ صرف ایک ہی نوکر رہ گیا۔ یہ بھی رات کا وقت تھا۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ قیامت کی تاریکی تھی۔ اب میں اکیلا پھر رہا ہوں۔ اور بلند آواز سے ہدایاتِ بیداری سنا رہا ہوں۔

بعینہٖ اس طرح کہ جیسے رات کو کوئی کمانڈر اپنے فوجی کیمپ میں گشت لگا رہا ہو۔ چونکہ ہم نے مذکورہ ایک گڑھی کا محاصرہ کیا تھا، لہٰذا میرے لشکری رات کے وقت کھسک گئے تھے۔ چنانچہ یہ رات بھی میں نے اس طریقہ سے گزاری کہ دشمن کے آدمیوں کو بات چیت میں ہی لگائے رکھا۔ اور صبح تک محاصرے کو قائم رکھا۔ تا آنکہ لشکری پہنچ گئے۔

قبائلی دور میں یا اس کے بعد اس قسم کی ہزاروں صعوبتیں میں نے برداشت کی ہیں۔ کئی بار موت کے منہ میں جاتے جاتے واپس آیا۔ ہم اس قسم کی بے شمار لڑائیاں آپس میں لڑ چکے ہیں جن میں سے ان دو چار لڑائیوں کے حالات بیان کرنے سے صرف مدعا یہ ہے کہ اس ریاست کے تاریخی حالات سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس قبائلی دور کے حالات اور ہماری جد وجہد سے پوری واقفیت حاصل ہو سکے۔ اور اس پُرآشوب زمانے کے حالات کا اندازہ آسانی سے لگ سکے۔ میری زندگی اس قسم کی لڑائیاں لڑتے ہی گزری ہے۔ اور اس ریاست کے قیام کے لیے بھی راہیں ہموار کرنے کے لیے ہزاروں مشکلات اور تکالیف سے ہمیں نبٹنا پڑا۔ قبائلی دور کا سوات بھی ایک عجیب علاقہ تھا۔ جس میں چاروں طرف وحشت برس رہی تھی۔ موت ناچتی ہوئی نظر آتی تھی۔

پشتو کا زمانہ :۔

۱۹۱۵ء سے پہلے کا زمانہ جبکہ سوات میں کوئی حکومت یا حاکمانہ قوت نہیں تھی، اور نہ ہی ان لوگوں کی کوئی خاص پنچائتی تنظیم تھی، اس خودسرانہ قبائلی دور کو پشتو کا زمانے کہتے ہیں۔ یوں تو پٹھان قوم میں پشتو (پختو) اس شجاعانہ اور غیور جذبے اور قومی آئین کا بھی نام ہے کہ جس کی وجہ سے افغان قوم اقوامِ عالم میں ایک شجاع، فیاض اور غیور قوم کی حیثیت سے متعارف ہے۔ یہی پشتو (پختو) گویا مجموعہ ہے، ان اوصاف کا۔ یعنی مہمان نوازی، فیاضی شجاعت، کمزور کی دستگیری، قومی ناموس پر نثار ہونا، مذہب کے لیے کٹ مرنا، قول و اقرار

کی پابندی، صاف گوئی اور اظہارِ حق، حق کی حمایت کرنا، دوسروں کو پناہ دینا خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ میدانِ جنگ میں ڈٹ کر لڑنا، قومی اتحاد سے وابستہ رہنا۔ اپنی شرم اور ناموس پر کٹ مرنا۔ اپنے جائز حقوق کا حاصل کرنا۔ نیز اس قسم کے دوسرے قابلِ فخر روایات اور اوصاف کی پابندی جس دستور اور جس جذبے کے تحت کی جاتی ہے اس کو بھی پشتو یا پختو کہتے ہیں۔ پٹھان قوم کے ہر قبیلے میں جب طعنہ دیتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ تم میں پختو نہیں ہے اور اسی مناسبت سے بھی قبائلی دور کو پشتو کا دور کہا جاتا ہے۔ ابتدا میں گویا اس مذکورہ بالا دستور پختو کے تحت زندگی بسر کرنے کا نام ہی پشتو تھا۔ لیکن بعد میں مسلسل افراتفری اور بعض استبدادی قوتوں کے مسلط ہونے کی وجہ سے سوات کی حالت پشتو کے زمانے میں ویسی نہ رہی کہ جس قسم کے دستوری اوصاف سے مزین زندگی کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام اوصاف بالکل ختم بھی تو نہ تھے۔ تاہم حالات برعکس ضرور تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سوات کے پشتو کے زمانے میں زندگی کا انحصار قوت اور تلوار کے بل پر تھا۔ ہر وقت خطرہ ہوتا تھا اور ہر وقت موت کا فرشتہ اس وادی میں مصروف کار رہتا تھا۔ وحشت اور بربریت چاروں طرف منڈلاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ظلم، تشدد اور سفاکیت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ میاندم کے علاقے میں ایک جابر خان کی پہاڑی اراضیات میں ایک پھلدار درخت سے پھل کا ایک دانہ پختہ ہونے کی وجہ سے گر گیا تھا۔ غریب دہقان نے پھل کا وہ گرا ہوا دانہ اُٹھا لیا۔ لیکن خدائی فوجدار (خان صاحب) کو جب اطلاع ملی تو اس نے غریب دہقان کو فوراً قتل کر دیا، محض اس جُرم کے بدلے کہ اس نے خود بخود گرا ہوا پھل کا دانہ زمین سے کیوں اٹھا لیا۔ کیوں نہ زمین پر پڑا ہوا چھوڑ دیا کہ گل سڑ جاتا۔ خدا کے کسی بندے کے کام تو نہ آتا۔

پشتو کے زمانے میں اس قسم کے جابر خوانین اور سفاک ذہنیتیں اس ماحول پر مسلط تھیں۔ زندگی متوحش اور سراسیمہ سی ہو کر رہ گئی تھی، اور پھر ہم جیسے لوگوں کی زندگی تو گویا ایک چٹان تھی، جس کے ساتھ موت کی خونی موجیں ہر وقت ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی تھیں۔ ہر انسان کی زندگی کا آج

ہی آج تھا کسی کو بھی کل کے متعلق اپنی زندگی کا بھروسہ بہت کم ہوتا تھا۔ اور پھر ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ اس زمانے میں لوگوں کی ذہنیت بے وفائی اور کج روی کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اس زمانے میں بھی لوگ طاقت اور اقتدار کے غلام تھے۔ کسی بھی فرد کی وفاداری قابلِ اعتماد نہیں تھی۔ ہر انسان مشکوک تھا۔ ایک معزز پٹھان کی اگر آج میرے ساتھ پارٹی تھی تو بغیر کسی عار اور شرم کے یہ اشراف کل دوسری پارٹی میں شامل نظر آتا تھا۔ طاقت کا توازن جس طرف بھی ذرا جھکتا ہوا نظر آتا تھا۔ یار لوگ بھی اس کے ساتھ ہی اسی طرف جھکے ہوئے نظر آتے تھے۔ ذاتی مفاد اور خود غرضی کی انتہا تھی۔ قومی روایات اور نیک نامی یا بدنامی کا خیال بالکل دلوں سے نکل چکا تھا۔ دولت پرستی عروج پر تھی۔ لیکن اس تاریک ماحول میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جو کہ صدق دل سے حالات کی بہتری کے خواہاں تھے۔ یہ لوگ مضبوط کردار بھی رکھتے تھے۔ ان کا ایمان بالکل غیر متزلزل تھا۔ وہ صحیح معنوں میں وفادار اور افغانی روایات کے حامل تھے۔ آج کی طرح اس زمانے میں بھی لالچ اور تحریص دے دے کر اک دوسرے کی پارٹیوں سے افراد پھینچے جاتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ قوت اور تلوار کا زمانہ تھا۔ آج صرف دلائل اور چرب زبانی سے معاملات طے ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں پر میں اس امر کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات اور حالات ہی میرے اتالیق بنے۔ خاندانی لڑائیاں اور اس کے ساتھ ہی پارٹی بازیاں پارٹی بازیوں کے سلسلے میں جرگوں کا انعقاد اور جرگوں میں اپنی فطری ذہانت کا استعمال تقریریں اور جرگہ بازی عام لوگوں کی نفسیات سے واقف ہونا اور پھر اُن کی نفسیات کے مطابق اُن سے کام لینا، اُن کو لڑانا اور یا اُن کو اپنے ساتھ ملانا، اپنے لیے ان کی ہمدردی حاصل کرنا اور پھر بعض موقعوں پر بغیر جنگ و جدل کے حکمتِ عملی سے بعض معرکوں کا سر کرنا اور مخالف پارٹی کو ہرانا ان تمام امورات اور واقعات نے اگر ایک طرف سے تو مجھ میں ایک کامیاب جنگی کمانڈر کی صلاحیتیں پیدا کیں تو دوسری طرف سے اس کے ساتھ ہی وہ تمام صلاحیتیں بھی مجھ میں پیدا ہو گئیں جن کا ہونا کسی بھی کامیاب سیاسی رہنما کی شخصیت کے لیے ضروری ہوتا ہے

اس قسم کے بدلتے ہوئے حالات اور واقعات نے بالآخر مجھ میں وہ قوت اور اہلیت پیدا کی، کہ میں سوات کی ہنگامہ خیز اور جدال پسند سرزمین کو ایک مستحکم حکومت اور مضبوط ریاست کی شکل میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں اور میرا عقیدہ یہی ہے کہ یہ سب کچھ خداوند کریم کی مہربانی تھی۔ منشائے قدرت کی تکمیل میرے ہاتھوں رضائے الٰہی کے مطابق ہوئی۔ میں خودستائی یا خوشامد کے حق میں قطعاً نہیں ہوں۔ ہمیشہ سے حقیقت کو پسند کرتا ہوں۔ تاریخ سوات سے متعلق مذکورہ واقعات بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس دور کے حقیقی حالات بلاکم وکاست بیان کیے جائیں جن کا تعلق میری شخصیت اور اس ریاست کے تعمیری حالات سے رہا ہو۔ میرے خیال میں اسے قطعاً مناسب بھی تصور نہیں کیا جائے گا کہ ان تمام صلاحیتوں کا اعتراف اگر کیا جائے جو کہ فی الحقیقت میری ذات کو خداوند کریم نے ودیعت کی ہیں۔ یہ صلاحیتیں اور اس قسم کے تجربات اور مشاہدات سوات کو ایک ترقی یافتہ اور پُرامن سٹیٹ بنانے میں میرے لیے کافی مُمد اور معاون ثابت ہوئے۔

خدائی امداد اور درسِ عمل :۔

میرا عقیدہ ہے کہ جب خداوند پاک کے حضور سے کسی انسان کے ذریعے عام انسانوں کی بھلائی اور ترقی کا کوئی منصوبہ انسانی ہاتھوں کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچانا مطلوب ہوجاتا ہے۔ تو اس انسان کو قدرت کی طرف سے ایسے اوصاف اور صلاحیتیں بھی ودیعت ہوجاتی ہیں۔ کہ مذکورہ انسان اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اہل ہوجاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میں کسی یونیورسٹی کا سند یافتہ گریجویٹ نہیں ہوں۔ میں نے کسی مکتب یا دارالعلوم میں باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اس امر کی کوئی کمی بھی خاص محسوس نہیں کی ہے ابتدائے طفولیت ہی سے میری طبیعت جداگانہ تھی اور آگے بڑھ کر یہ کہوں کہ میں بچپن ہی سے مکتبِ عمل کا ایک ذہین طالب علم تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ چنانچہ لڑکپن سے یہ میری عادت تھی کہ:۔

۱۔ لڑکپن میں ہی جب بھی سیدو شریف میں مجھے سوات کے کسی باہر کے علاقے کا کوئی فرد مسافر ملتا تھا تو میں اس کے ساتھ بات چیت شروع کر کے اس کے حالات وہاں کے رسم و رواج، لوگوں کی اخلاقی حالت، وہاں کے سرکردہ آدمیوں کے نام اور حالاتِ زندگی، ان کے روزمرہ مشاغل، پارٹی بازیوں کے اتار چڑھاؤ وغیرہ کے متعلق باتیں پوچھ پوچھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتا تھا۔ اور جب ہمارے مہمان خانے میں کوئی معزز مسافر مقیم ہوتا تھا تو اس کے ساتھ سیاست اور ملکی حالات پر بحث کرتا تھا۔ اور مختلف قسم کے سوالات پوچھ پوچھ کر علم حاصل کرتا تھا۔ پارٹیوں کے جوڑ توڑ اور علاقائی سیاست سے واقفیت حاصل کرتا تھا۔ چنانچہ اس ذوق کا نتیجہ یہ تھا کہ میں سوات بونیر، کانا، غور بند، دیر اور باجوڑ، ایجنسی مالاکنڈ وغیرہ ان تمام علاقوں کے حالات ان کے سیاسی اتار چڑھاؤ، ان علاقوں کے سرکردہ مشاہیر، ان کے اخلاق و اطوار، ان کے مشاغل سے پوری واقفیت مجھے بچپن ہی میں حاصل ہو گئی۔ چنانچہ آج تک جب کہ میری عمر چھہتر سال ہے مجھے یہ سب کچھ یاد ہیں۔ وادئ سوات، کانا، غور بند اور بونیر کے تمام سرکردہ اور قابلِ ذکر افراد میں سے ہر فرد کو پہچانتا ہوں اور اس کے حالات سے واقف ہوں۔

۲۔ بچپن ہی میں میری یہ عادت بھی تھی کہ پشتو زبان کے جنگ نامے یعنی منظوم افسانے شوق سے سنتا تھا۔ قصۂ امیر حمزہ اور اس قسم کی دوسری کتابیں بھی سنتا تھا۔ اس قسم کے جنگ ناموں اور کتابوں میں جو مبالغہ آمیز واقعات بیان ہوتے تھے ان کے متعلق میں بخوبی سمجھتا تھا کہ حقیقت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، تاہم مذکورہ قسم کی کتابیں سننے یا مطالعہ کرنے سے ایک ذہین انسان فائدہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ چیزیں محض بیکار بھی نہیں ہوتی ہیں۔ جوان ہونے کے بعد پھر میں فارسی کی شاہنامہ فردوسی، اسکندر نامہ وغیرہ کتابیں سنتا رہا۔ جو کہ مجھے بالکل یاد تھیں ایک طالب علم کی طرح۔

۳۔ یہ تو لڑکپن کی باتیں تھیں۔ جب میری عمر ستائیس برس کی ہوگئی تو ایک واقعہ نے مجھ میں اخباری واقعات یعنی اخبار سننے کا شوق پیدا کیا۔ اٹلی نے جب لیبیا پر حملہ کیا، تو حالاتِ جنگ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے میں نے اب اخبار سننے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن اس زمانے میں سوات میں تو اخبار کا نام و نشان نہیں تھا۔ ایجنسی مالاکنڈ کے ایک قصبہ تھانہ میں ایک خان تھا جس کے پاس اخبار آتا تھا۔ میں نے اسی خان کے ساتھ رابطہ استوار کیا۔ ایک ملازم خاص کر اسی کام پر مامور کیا کہ وہ ہفتے میں ایک دن تھانے جاتا تھا اور مذکورہ خان صاحب سے ہفتے کی اخباریں اکٹھی لے آتا تھا۔ چنانچہ انہی اخباروں کو میں تاریخ وار سنتا تھا۔ اخبار سننے کے ساتھ اب محاذِ جنگ سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے لیے میں نے علمِ جغرافیہ اور نقشہ جات ممالک کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ اس غرض کے لیے میں نے دنیا اور تمام دنیا کے ممالک کے نقشے اور ان کے جغرافیے بھی منگوا لیے۔ اب میں اخبار کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک کے جغرافیے بھی سنتا رہا اور نقشے دیکھ کر محاذِ جنگ سے بھی واقف ہوتا رہا۔ چنانچہ اس طریقے سے میں نے دنیا اور دنیا کے تمام ممالک کے جغرافیے اور جغرافیائی حالات سے بھی واقفیت حاصل کی۔

۴۔ جغرافیائی حالات اور معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب علمِ تاریخ سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے تاریخ سننا بھی شروع کیا۔ اس وقت سے لے کر بعد کے زمانے تک جو تاریخیں پڑھ کر مجھے سنائی گئی تھیں، اُن میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:۔

تاریخ اسلام مکمل، ابن خلدون کی تاریخ بارہ جلدیں، بنی امیہ کی تاریخ، تاریخ بنی عباس تاریخ فرشتہ متعلق ہندوستان، ایک فرنچ مؤرخ کی تاریخ، شاہانِ اندلس امیہ مکمل تاریخ اندلس، تاریخ البرامکہ، تاریخ بہادرانِ اسلام، الفاروق مکمل، توزکِ تیموری، توزکِ بابری

اور توزکِ جہانگیری، توزکِ امیر عبدالرحمٰن، تاریخ افغان خورشید جہاں، تیمور پر لکھی ہوئی "ہیرلڈ لیمب" انگریز مورخ کی ایک کتاب "مٹبرلین" دربارِ اکبری اور ایک ضخیم کتاب ڈاکٹر گستاؤلی بان فرانسیسی کی تمدنِ عرب وغیرہ کتابیں سُن کر میں نے علمِ تاریخ سے بھی واقفیت حاصل کی۔ جس قدر تاریخیں مجھے پڑھ کر سنائی گئی ہیں مجھے ان سب سے متعلق حالات اور واقعات ایسے ہی یاد ہیں کہ جس طرح کوئی عالم شخص خود ہی پڑھ کر واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ ان مذکورہ بالا عادات اور ذوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس کے کہ میں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، لیکن مجھے علمِ جغرافیہ، علمِ تاریخ اور عملی سیاسی تعلیم حاصل ہوگئی۔ مکتبِ عمل کے ایک فاضل کی حیثیت سے میں حکمرانی کے فرائض، حکمرانی کے اوصاف اور اصولوں سے مکمل واقف ہوگیا۔ آگے چل کر اس قسم کی تعلیم زندگی کے ہر مرحلے میں اور ہر سیاسی الجھن میں میری رہنمائی کرتی رہی۔

پشتو کے زمانے میں لڑائیوں کے طریقے اور سامان:-

۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۵ء تک پشتو کا زمانہ جو کہ قریبی زمانہ ماضی ہے، وادیٔ سوات میں رائفل، پستول، ریوالور کا استعمال تقریباً عام ہو چکا تھا۔ لڑائیاں اکثر سوچی سمجھی سکیم کے تحت بھی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی یک لخت بے تدبیری لڑائیاں بھی چھڑ جاتی تھیں۔ اس ماحول میں قاعدہ یہ تھا کہ جس خطے کے لوگ لڑائی کے لیے نکل جاتے تو ان کے ساتھ باقاعدہ نقارچی بھی ہوتے تھے۔ یہ نقارچی اکثر سوار ہوتا تھا۔ اور گھوڑے کی زین پر دونوں طرف نقارے بندھے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر خطہ کے پٹھانوں کا نشان بھی ہوتا تھا۔ یہ نشانچی (علمبردار) ہمیشہ کے لیے معزز اور شجاع انسان ہوتا تھا۔ اس لیے کہ ہر لڑائی میں نشانچی کو سب سے اول ہلاک ہونے کا خطرہ ہوتا تھا۔ لڑائی کو جلتے وقت یہ نشانچی سب سے آگے آگے اپنا علم اٹھائے ہوئے جاتا تھا۔ جابر قسم کے بعض مالدار خوانین نے

باقاعدہ پیدل اور سوار مسلح ملازمین بھی اس غرض کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ لڑائی لڑنے کے لیے کوئی خاص طریقے یا اصول تو نہیں تھے۔ اور نہ ہی روٹی کھلانے کے لیے کسی خاص وقفے کا لحاظ کرتے تھے۔ یہ تو اپنے اپنے بس اور موقعے کی بات تھی۔ چنانچہ میرا یہ اصول تھا کہ میں ہمیشہ اپنے لشکریوں کو وقت سے پہلے ہی کھانا کھلا دیتا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیشہ میں نے باقاعدگی کا خیال رکھا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں دشمن لشکر سے پہلے پہلے اپنے لشکر کو کھانا کھلا دیتا تھا۔ تاہم لڑائی کے اوقات بھی مقرر تھے جن کا خیال بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن دشمن کی طرف سے عین اس بھروسے پر غافل بھی رہ نہیں سکتے تھے کہ وہ مقررہ وقت کا گویا احترام کرے گا۔ گوریلا قسم کی لڑائیاں لڑی جاتی تھیں۔ جن میں ذاتی شجاعت، بلند حوصلگی، بدنی طاقت اور چستی نیز استقلال وغیرہ اوصاف کی خاص ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اور پھر سردار یعنی سالارِ جنگ کی ذمہ داری تو دہری ہوتی تھی۔ کیونکہ لڑائی کے لیے محاذ منتخب کرنا، لڑائی کے لیے سکیم بنانا دشمن کی طاقت اور نقل و حرکت سے خبردار رہنا۔ اپنے آدمیوں کو بچانا اور ایسے طریقوں سے لڑانا کہ جیت کی امید ہو سکتی تھی ان تمام امورات کے لیے سردارِ لشکر ذمہ دار ہوتا تھا۔

دریائے سوات کے پار نیک پی خیل اور شموزئی پر نواب دیر کا قبضہ کیسے ہوا

اب اس سے پیشتر کہ نواب دیر کے تسلط سے شمالی سوات کو آزاد کرانے کی جدوجہد کا ذکر کیا جائے، یہ بتلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مذکورہ علاقوں پر نواب صاحب کا قبضہ کیسے ہو گیا اور سوات کے یہ آزاد علاقے نواب دیر کی عملداری میں کیوں کر شامل ہوئے؛ ۱۸۹۰ء میں باجوڑ کے خان عمرا خان نے دیر پر حملہ کر کے دیر کے نواب محمد شریف خان کو شکست دے دی تو نواب صاحب دیر سے نکل کر سوات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ سوات کے پٹھانوں نے افغانی روایات کا احترام کرتے ہوئے جلاوطن نواب کی خوب خاطر تواضع کی۔ سوات میں نواب صاحب کو پناہ دی گئی۔ مینگورہ شہر میں نواب صاحب

کو رہائش کے لیے مکانات دیے گئے۔ اور اخراجات کے بھی مناسب انتظامات کیے گئے۔ نواب صاحب جن دنوں مینگورہ میں جلاوطنی کے ایام بسر کرتے تھے تو سوات کے سرکردہ افراد اور خوانین کے ساتھ بھی نواب صاحب کے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں جب انگریزی فوج کی امداد سے نواب صاحب نے دوبارہ دیر پر قبضہ کر لیا۔ تو سوات کے خوانین اور عمائدین کی آمد و رفت دیر میں نواب صاحب کے پاس جاری رہی۔ دوستانہ تعلقات یوں بڑھتے گئے۔ سوات کی حالت اس زمانے میں یہ تھی۔ کہ یہاں نہ تو کوئی حکومت تھی اور نہ ہی ظالم اور مظلوم کے درمیان فیصلہ کرنے والی کوئی قوتِ حاکمہ موجود تھی۔ علاقہ نیک پی خیل، ادین زئی، شموزئی میں قتل مقاتلے اور خونریزیاں ہوتی تھیں۔ طاقتور پارٹی کمزور پارٹی کے افراد پر حملہ کر کے ان کے مال و دولت اور جائدادوں پر قابض ہو جاتے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک موقع پر مذکورہ علاقے کے دو سرکردہ خان، یوسف خان اور جلال خان، مذکورہ علاقے میں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں شکست خوردہ نے دیر جا کر نواب صاحب سے اعانت طلب کی تاکہ نوابی لشکر کی امداد سے دوبارہ اپنی جائیدادوں پر قابض ہو جائیں۔ نواب صاحب سوات کے اندرونی حالات، شورش، بدامنی، خانہ جنگیاں اور افراتفری سے تو بخوبی واقف تھے کیونکہ خود کافی عرصہ سوات میں رہ چکے تھے۔ اور نواب صاحب یہ بھی چاہتے تھے۔ بلکہ ان کی دلی آرزو تھی کہ کسی نہ کسی طرح سے سوات پر قبضہ ہو جائے۔ اب سوات کے کچھ علاقوں کی آزادی جلال خان اور یوسف خان کے روپ میں خود ان کے در دولت پر جا کر غلامی کی خواستگار ہوئی تو نواب صاحب نے بھی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشی۔ چنانچہ یوسف خان اور جلال خان کے ساتھ نواب صاحب نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ سوات کے شمال مغربی حصے پر فوج کشی کی۔ ڈھیری کے مقام پر جلاوطن خوانین اور ان کے حمایتیوں نے مبلغ بیس ہزار روپیہ کی اک تھیلی نواب صاحب کی خدمت میں بسلسلۂ اخراجاتِ لشکر کشی و مہمان نوازی پیش کی اور ساتھ درخواست کی کہ ہمارا مقصد آپ کی اعانت سے پورا ہو گیا۔ لہٰذا آپ واپس دیر تشریف لے جائیں تو مہربانی ہو گی۔ لیکن نواب صاحب جو لشکری طاقت سے مذکورہ علاقے

فتح کر چکے تھے۔ اب بھلا زبانی درخواست پر کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ نواب صاحب نے مذکورہ خوانین سے کہا کہ آپ لوگوں کے مابین یہ خانہ جنگیاں تو ہر وقت ہوتی ہیں، میرے لیے ہر وقت دیر سے لشکر بھیجنا مشکل کام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مخالف فریق طاقتور ہو کر کل پھر آپ لوگوں کو ستائے۔ اب آپ لوگ میرے دوست ہیں اور میں اپنے دوستوں کی پریشانی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس علاقے میں ایک مضبوط قلعہ بناؤں اور اس قلعے میں اپنے لشکری تعینات کر دوں۔ تاکہ بروقت ضرورت آپ لوگوں کو امداد دے سکیں اور نیز آپ لوگ آپس میں خون ریزی بھی نہ کریں۔ اب ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اپنے سے بڑھ کر طاقتور کی اعانت کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے اور آج تک قائم چلی آ رہی ہے کہ طاقتور اگر کسی کو فائدہ بھی پہنچائے تو اس میں نقصانات نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کے لیے اپنی طاقت پیدا کرنی چاہیئے اور اپنے سے بڑھ کر طاقتور کے امداد پر نازاں ہونا نادانی ہے۔ چنانچہ سوات کے مذکورہ خوانین نے بھی شدت کے ساتھ اپنی غلطی محسوس کی۔ کہ نواب صاحب کو لشکر کے ساتھ سوات کی شاداب وادی میں داخل کرا کر ہم نے حماقت کا مظاہرہ کر لیا ہے۔ اور اب اس کا کوئی علاج نہیں۔ یہ لوگ مجبور تھے کہ اگر انکار بھی کرتے تو اس صورت میں بھی نواب صاحب اپنے عزائم سے دست بردار ہونے والے تو نہیں تھے۔ البتہ انکار کی صورت میں الٹا نواب صاحب ناراض بھی ہو جاتے۔ لہٰذا مجبور تھے کہ نواب صاحب کا کہنا ہی مان لیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اقرار کیا کہ ہم نواب صاحب کو عشر دیا کریں گے۔ نواب صاحب نے علاقہ نیک پی خیل کے مقام "کبل" اور مقام نل پر اپر سوات میں قلعے بنوائے۔ اور پھر مذکورہ قلعوں میں فوج تعینات کی۔ اس طرح نیک پی خیل شموزئی وغیرہ علاقے نواب دیر کی عملداری میں شامل ہو گئے۔ غالباً یہ ۱۹۰۸ء کا زمانہ تھا۔ دیر کے نواب محمد شریف خان دور اندیش اور مدبر انسان تھے۔ لہٰذا ان کے عہد میں تو حالات کچھ اچھے تھے۔ لیکن اس کے جانشین نواب اورنگ زیب کے عہد میں سوات کی اس نوآبادی پر مظالم شروع ہو گئے۔ نواب

صاحب کے کارندے اور عمال اب ان لوگوں کو ستاتے تھے۔ لہٰذا سوات کے مذکورہ علاقوں کے لوگوں نے اس مظالم اور غلامی سے تنگ آکر آزادی حاصل کرنے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۳ء میں جب نواب صاحب کے مظالم انتہا کو پہنچ چکے تو سوات کے مقبوضہ علاقوں کے لوگ نواب دیر کے برخلاف متحد ہو گئے۔ اس زمانے میں سوات میں ایک ملا تھا جو کہ سنڈاکی ملا کے نام سے مشہور تھا۔ سنڈاکی ملا سوات اور کوہستان کے لوگوں کو انگریزوں کے برخلاف جہاد کے لیے اکسانے میں مصروف عمل تھا۔ چنانچہ انہی دنوں علاقہ نیک پی خیل کے ایک گاؤں "ننگولی" کے ایک میاں صاحب جو کہ خود بھی نواب دیر کے مظالم کا نشانہ بن چکے تھے۔ اسی میاں صاحب نے جاکر سنڈاکی ملا کی توجہ نواب دیر کے روز افزوں مظالم کی طرف مبذول کی۔ اور اُسے یہ بھی سمجھایا کہ علاقہ پار کے لوگ نواب صاحب کے لوٹ کھسوٹ سے تنگ آچکے ہیں۔ صرف انہیں منظم کرنے اور ان کی رہنمائی کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی سنڈاکی ملا نے نیک پی خیل اور شامیزئی علاقوں میں لوگوں کو منظم کرکے نواب صاحب کے "قلعہ نل" پر حملہ کر دیا۔ اور پھر مذکورہ قلعے سے نوابی لشکر کو بے دخل کر کے قلعے پر قابض ہو گئے۔ نواب صاحب کو جب اطلاع ملی تو فوراً امدادی لشکر انہوں نے روانہ کر دیا۔ نواب صاحب کے اس تازہ دم لشکر پر بھی ننگولی اور بانڈی کے مقامات پر سواتی لشکر نے حملہ کرکے انہیں "کبل" کی طرف دھکیل دیا۔ نواب دیر کے لشکر سے کافی اسلحہ بھی سواتی لشکر کے ہاتھ آگیا۔ نواب دیر کو جب اس شکست کی بھی اطلاع ملی تو اب کے بار انہوں نے اپنے ولی عہد شاہ جہان کی سرکردگی میں ایک جرار لشکر سوات روانہ کر دیا۔ اب کی بار نواب دیر کی فوج بانڈی اور ڈھیری کے مقامات پر مقیم ہوئی۔ سوات کا قومی لشکر "سمبٹ" میں مقیم ہو گیا۔ نوابی فوج نے اگرچہ بڑے زور شور سے حملہ کیا۔ لیکن سواتیوں کا بھی جذبۂ حریت بیدار ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے اب ہر قیمت پر نواب دیر کے تسلط سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کا عہد کیا ہوا تھا۔ لہٰذا نہایت بے جگری کے ساتھ لڑے اور مردانہ وار لڑے نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ میں بھی نوابی لشکر کو شکست ہوئی۔ دوسری طرف سے قومی لشکر نے "کبل"

کے مقام پر بھی نواب دیر کے قلعے کو فتح کر لیا۔ نواب دیر کے سرکردہ فوجی افسر اپنے ولی عہد کو ساتھ لے کر بعد مشکل سوات سے دیر سلامت پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ دریائے سوات کے پار وہ خونگوار علاقے نواب دیر کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ لیکن یہ خطرہ بدستور قائم رہ گیا کہ موقع ملنے پر نواب صاحب پھر لشکر کشی کریں گے۔

سوات کے لوگوں کا ہم دونوں بھائیوں کو حکومت بنانے کی دعوت دینا:۔

نواب دیر کی فوجوں کو پار کے علاقے سے بیدخل کرنے کے بعد سوات کے لوگوں اور سرکردہ عمائدین نے ایک بار پھر ہم دونوں بھائیوں کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ لیکن افسوس کہ میں اس دعوت کو اس موقع پر قبول نہ کر سکا۔ وجہ یہی تھی کہ میں اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ ؎

بہ یک مسجد دو ملا مے نہ گنجد

خواہ مخواہ چند روزہ اقتدار اور ذاتی مفاد کا لالچ میرے دل میں نہیں تھا۔ حکومت کا مطلب اور حکومت کے قیام سے تو ان لوگوں کی خلافت اور اس دیس کی ترقی مقصود خاطر تھی۔ جو کہ ہم دونوں بھائیوں کی مشترکہ حکومت میں ناممکن تھی۔ لہٰذا میں نے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ سے سوات کے لوگ مجھ سے ناراض بھی ہو گئے۔ لیکن میری نیت صاف تھی۔ حکومت سے انکار میں نے اس وطن اور اس قوم کی بھلائی کو ہی پیش نظر رکھتے ہوئے کیا تھا۔ بہرصورت سوات کے لوگ حکومت بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے بیرونی علاقے سے کسی قابل فرد کو حکمران سوات بنانے کے لیے طلب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس موقع پر میرے خیالات یہ تھے کہ سوات کے لوگ اگر کسی کو حکمران بنانا چاہتے ہیں تو شوق سے بنائیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں میری پوزیشن کیا ہو گی۔ اس کے لیے میں نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اگر ان لوگوں نے کسی خان یعنی پٹھان نسل فرد کو حکمران بنا لیا، تو میں بھی اس کو حکومت تسلیم کروں گا۔ لیکن اگر ان لوگوں نے کسی ایسے فرد کو حکمران منتخب کر لیا کہ جس کا تعلق ہماری طرح کسی مقدس

اور بزرگ خاندان سے ہو۔ یعنی سید یا میاں ہو تو پھر مجبوراً ایسے حکمران کی حکومت کی میں مخالفت کروں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا خیال تھا کہ اگر سوات میں حکومت میری نہ بھی ہو تو پھر بھی اپنے دادا "صاحب سوات" کی گدی نشینی اور اس کی بدولت روحانی اقتدار ہمارے لیے کافی ہے۔ لیکن اس صورت میں کہ سوات کا حکمران بھی کوئی آستانہ دار شخص یعنی سید وغیرہ ہو تو یقیناً وہ ہمارے روحانی اقتدار کو بھی برداشت نہ کر سکے گا۔ اور اس میں مداخلت کرے گا۔ تو اس صورت میں اس کے ساتھ ہمیں ٹکرانا پڑے گا۔ سوات کی حکومت جو کچھ بھی ہو لیکن اخوند صاحب سوات کی گدی نشینی اور روحانی اعزاز میرے لیے ایک مقدس امانت ہے جس کو چھوڑنے کے لیے میں کسی صورت میں بھی تیار نہیں تھا۔ اور نیز اس مقدس امانت کی حفاظت کرنا ہمارا حق تھا۔ ادھر تو یہ میرے خیالات اور عزائم تھے۔ ادھر سوات کے لوگوں نے موضع ستھانہ ضلع ہزارہ کے سید عبدالجبار شاہ کو حکمران سوات بنانے کے لیے طلب کیا۔ یہ عبدالجبار شاہ سوات کے پہلے امیر سید اکبر شاہ کے خاندان سے تھے۔ لہٰذا عبدالجبار شاہ کی حکومت تسلیم کرنے کے لیے تو میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ وجوہات وہی تھے کہ عبدالجبار شاہ کا تعلق بھی آستانہ دار خاندان سے تھا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں عبدالجبار شاہ کی حکومت :-

سید عبدالجبار شاہ نے ستھانہ ضلع ہزارہ سے آکر سوات میں صرف دریائے سوات کے پار شمالی علاقوں پر مشتمل حکومت سنہ ۱۹۱۴ء میں بنائی۔ ان لوگوں نے عبدالجبار شاہ کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ دریا کے اس پار علاقہ بابوزئی کے لوگوں نے جب یہ حالت دیکھی تو بابوزئی کے پٹھانوں نے بھی عبدالجبار شاہ کے ہاں آمد و رفت شروع کی۔ حتیٰ کہ میرا بھائی شہزادہ شیریں جان بھی اس کے پاس گیا۔ اور خود میری پارٹی کے افراد بھی کئی بار گئے جس کی وجہ سے میں ان افراد سے ناراض بھی ہوا۔ واضح رہے کہ اس دوران میں میری اور شہزادہ شیریں جان کی دشمنی بدستور قائم تھی اور وہ "تختہ بند" گاؤں میں سکونت پذیر تھے۔ لیکن اب میں نے حالات کی نزاکت محسوس کی۔ اب وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ میں اپنی

زندگی نثار کروں۔ اور یا اس دشمنی کو محبت اور اخوّت سے تبدیل کر دوں۔ میں نے سوچا کہ شہزادہ شیریں جان یعنی اپنے بھائی سے مجھے دو خطرے ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خود مجھے ختم کر دے۔ دوم یہ کہ فریق مخالف کے ساتھ مل کر مجھے ختم کر دے۔ اس دوران میں سوات کے لوگوں کا مخالفانہ روّیہ اور دوغلاپن ناقابلِ برداشت ہوتے جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں قتل یا شہید ہونے کو بہتر سمجھا۔ چنانچہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے پاس بطور جرگہ تختہ بند چلا گیا۔ اس کے شرائط سب تسلیم کر کے اسے راضی کر لیا۔ کئی سالوں کے بچھڑے ہوئے ہم دونوں بھائی تختہ بند سے اپنے آبائی گھر سیدو شریف آ گئے۔ اس کے بعد ہم دونوں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو گئے۔ اس موقعہ پر اگر ہم کچھ عرصہ خاموش رہتے تو ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوتا۔ سوات کے لوگ ہم سے مرعوب تھے۔ اور کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ سیدو شریف میں ہم پر حملہ کر دے لیکن اپنے ہی ایک خاص معتمد مشیر کے کہنے میں آ کر مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اور وہ غلطی یہ تھی کہ جب ہم دونوں بھائیوں کے درمیان صلح و صفائی ہو گئی تو ہم نے اپنی پارٹیوں کے افراد سے کہا کہ تم لوگ بھی آپس میں صلح کر لو کہ اب نفاق اور دشمنی کا وقت نہیں ہے چنانچہ اس بات پر کہ ہم نے انہیں صلح کرنے کے لیے کیوں کہا۔ وہ لوگ ناراض ہو گئے اور ہمارے کہنے پر انہوں نے عمل نہ کیا۔ بلکہ ہمارے خلاف عبدالجبار شاہ کے پاس چلے گئے۔ چنانچہ مجبور ہو کر اب ہم نے ان کے ساتھ لڑائی شروع کی۔ لیکن پار کے علاقے سے عبدالجبار شاہ ایک جرار لشکر کے ساتھ ان کی اعانت کے لیے پہنچ گیا۔ "ہوڈی گرام" اور "کاٹیلی" کے مقامات پر سخت لڑائیاں ہم نے لڑیں۔ لیکن اس دوران میں اپنے حریفوں اور رفیقوں کی بے وفائی ہمیں کھا گئی۔ سلام پور اور سرسرداری کے میانگاں جن کے ساتھ ہماری پارٹی اور اشتراک تھا۔ ان سب لوگوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ اور ہمارے برخلاف جرگہ بازی شروع کی۔ حالات مخدوش ہو گئے۔ سوات کے سیاہ ماحول نے اجنبیت کا روپ دھار لیا۔ ع "جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے"۔ مجبور ہو کر ان حالات میں ہم نے سیدو شریف کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اس لیے کہ تمام سوات کے متحدہ لشکر کا مقابلہ ہمارے

لیے مشکل تھا۔ چڑھتے سورج کے پجاری عبدالجبار شاہ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ لہٰذا ہم نے سیدو شریف کو چھوڑ کر علاقہ ادین زئی کے اک گاؤں "دلبار" چلے گئے۔ "دلبار" میں میں بھی ہمارے مکانات اور جائیداد ہے۔ تاہم یہ ایک قسم کی جلاوطنی ضرور تھی۔

خاموش تماشائی مالاکنڈ کا انگریز پولیٹیکل ایجنٹ اور اس کی عیاری ۱۔

جب سیدو شریف کو چھوڑ کر ہم دلبار جا رہے تھے تو ایک رات بسر کرنے کے لیے ہم ایجنسی کے قصبہ تھانہ میں ٹھہر گئے۔ رات کے وقت مجھے پیغام ملا۔ کہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ نے مجھے یاد کیا ہے۔ چونکہ اخوند صاحب سوات میرے دادا اور پھر والدِ محترم نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیے تھے۔ لہٰذا انگریز ہمیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ خاندانی حریف سمجھتے تھے۔ اور میں اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن پولیٹیکل ایجنٹ کے بلاوے پر میں ملاقات کے لیے مالاکنڈ چلا گیا۔ دوران ملاقات میں میں نے کسی قسم کی عاجزی یا کمزوری ظاہر نہ کی۔ بلکہ اپنے خاندانی وقار کے مطابق اس کے ساتھ میں نے گفتگو کی۔ جب پولیٹیکل ایجنٹ نے کہا کہ ہمیں بہت افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ تو میں نے جواب دیا کہ صاحب کوئی بات نہیں ہم لوگ اس قسم کے مشکلات سے گھبرانے والے نہیں ہیں اور نہ ہی ایسی تکالیف کو ہم اہمیت دیتے ہیں۔ قبائلی زندگی میں تو ایسا ہوتا ہے کوئی فکر نہیں ہے۔ اگر آج ہم مغلوب ہو کر اپنے وطن سے بچھڑ گئے تو کوئی غم نہیں۔ ع

یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں

کل پھر حملہ کر کے ہم اپنے دشمنوں کو مغلوب کر لیں گے۔ یہ تو آزاد زندگی ہے۔ اور اس میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ہم اس قسم کے معمولی واقعات کو اہمیت دینے والے بھی نہیں ہیں۔ تاہم آپ کے اظہارِ ہمدردی کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے جانتا تھا، اور مجھے یقین تھا۔ کہ وادیٔ سوات اور اس ماحول میں ہمارے اثر و رسوخ کو دھچکا لگنا انگریز

کے لیے باعثِ خوشی ہے۔ اس لیے یہ پولیٹیکل ایجنٹ بھی اب مجھے ٹٹولنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اس پر اپنی کسی قسم کی پریشانی یا کمزوری ظاہر ہونے نہ دی۔ ملاقات کر کے چلا آیا۔

دلبار میں سکونت اور حکومت کے لیے جدوجہد

نواب دیر کے ساتھ ہماری پارٹی تھی۔ جب ہم دلبار میں مقیم ہو گئے تو ہم نے نواب صاحب کے ساتھ زیادہ قریبی تعلقات قائم کیے۔ ہمیں اس موقعے پر کسی قسم کی مالی امداد کی ضرورت نہیں تھی۔ دلبار میں اپنی جائیداد اور اس کی آمدن ہمارے اخراجات کی کفیل تھی۔ البتہ نواب صاحب سے فوجی امداد حاصل کرنا ہمارا مطلب تھا جس کے لیے ہم کوشاں تھے۔ لیکن اس راہ میں کچھ مشکلات بھی حائل تھے اور وہ یہ تھے کہ دیر کے نواب اورنگ زیب خاں کو اس کے عمال اور سرکردہ فوجی افسر پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا وہ لوگ ہمیشہ نواب صاحب کو غلط راہ پر چلاتے تھے اور یہ کوشش کرتے تھے کہ نواب صاحب کو مسند نوابی سے کسی نہ کسی طرح علیحدہ کر کے کسی دوسرے شخص یعنی ولی عہد کو دیر کا نواب بنا دیں۔ لہٰذا اس زمانے میں خود ریاست دیر کے اندرونی حالات بھی مخدوش تھے۔ علاقہ جندول کے خان سید احمد خان کے ساتھ بھی تعلقات خراب تھے اور اکثر لڑائیاں ہوتی تھیں۔ جندول کا علاقہ اس زمانے میں ریاست دیر میں شامل نہیں تھا۔ یہ ایک علحدہ ریاست جیسی تھی۔ چونکہ ہم نے نواب صاحب سے فوجی امداد کے لیے کہا تھا۔ لہٰذا اب دلبار میں ہم اسی انتظار میں دن گزار رہے تھے کہ نواب صاحب سے فوجی امداد ملے تو سوات پر حملہ کر دیں۔ لیکن نواب صاحب ریاست دیر کے اندرونی معاملات میں کچھ مصروف تھے۔ لہٰذا اسی انتظار میں سردی کا زمانہ گزر گیا۔ جب بہار کا موسم آ گیا۔ تو سوات کے لوگوں نے لشکر منظم کر کے علاقہ ادین زئی کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا۔ اب تو نواب صاحب لشکر لے کر میدان میں آ گئے۔ ہم خود بھی اپنے ملازمین سمیت اس لشکر میں شامل ہو گئے۔ میں نے اپنے بھائی شہزادہ شیریں جان کو بونیر کے راستے سوات کے لیے روانہ کر دیا تاکہ بونیر کے دشوار گزار پہاڑوں سے ہوتا ہوا سرسبز پہنچے۔

سر اور سرداری

مینگورہ سے مدین جاتے ہوئے سڑک پر سات میل کے فاصلے پر منگلور کا مشہور قصبہ ہے اسی منگلور کے اوپر مشرقی پہاڑوں کے اوپر سر اور سرداری دو مقامات ہیں۔ یہ دونوں مقامات میانگان صاحبان جو کہ اپنا سلسلۂ نسب خاندانِ سادات سے ملاتے ہیں۔ یعنی کہ سید النسل ہیں، کی ملکیت ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں جبکہ سوات میں میری حکومت ابھی بنی نہیں تھی۔ سوات میں اسی سر سرداری کے یہ میانگان صاحبان اک طاقتور حریف کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس ماحول میں کافی قوت رکھتے تھے۔ انہی میانگان صاحبان کے ساتھ ہماری پارٹی تھی۔ یہ میری پارٹی کے مضبوط ارکان میں سے تھے۔ چنانچہ دیر کے علاقے سے میں نے اپنے بھائی کو اس غرض کے لیے انہی میانگان صاحبان کے پاس بھیجا تھا۔ کہ وہ ان کو فوراً علاقہ بابوزئی پر حملہ کرنے کے لیے تیار کردیں۔ میری پالیسی اس میں یہ تھی کہ علاقہ بابوزئی کا لشکر مدافعت کی جوابی کاروائی میں مصروف ہو جائے۔ اور علاقہ ادین زئی میں سواتی لشکر کی امداد کو نہ آئے۔ بہرصورت یہ سب کچھ تو میں کرتا رہا۔ لیکن نواب صاحب بمعہ لشکر کے جب ادین زئی آئے تو ادیچ کے قصبے میں مقیم ہو کر بس پڑے رہے۔ اب حملہ کرتے یا لڑائی شروع کرنے کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں کہ نواب صاحب کے سرکردہ افسر اس سے ناراض تھے۔ انہوں نے جنڈل کے خان سید احمد خان کو درپردہ آمادہ کیا تھا کہ اس دوران میں جبکہ نواب صاحب اپنے دارالریاست دیر سے باہر ادیچ میں مقیم ہیں۔ وہ دیر پر حملہ کردے یا دیر کے کسی علاقے پر حملہ کردیں۔ تاکہ نواب صاحب کو واپس جانا پڑے۔ غرضیکہ اس قسم کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ ایک دن میں نے نواب صاحب سے صاف کہہ دیا۔ کہ اگر آپ سواتی لشکر پر حملہ کرنا نہیں چاہتے تو پھر میں مجبور ہوں کہ سوات واپس چلا جاؤں اور سواتیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی سمجھوتہ تو کرلوں گا۔ نواب صاحب کو جب میں نے ایسا کہا تو اس کے ذہن میں جواباً ایک تجویز ابھری اور وہ تجویز بالکل ملازمین سمیت ہمیں ختم کرنے

کی تھی۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ صبح سویرے اپنے نوکروں کو ساتھ لیکر "تازہ گرام" پر حملہ کردیں۔ یہ نادر شاہی فرمان سن کر میں نے سوچا کہ نواب صاحب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہم سب کے سب تعداد میں ایک سو بیس نفر ہیں۔ یہ اب یہ ایک سو بیس نفر کے ساتھ ہمیں تازہ گرام پر حملہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، کہ ہم یقیناً ختم ہو جائیں گے۔ بہرصورت میں نے نواب صاحب کو اس وقت تو یہی جواب دیا۔ کہ بہت اچھا میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن اپنی جائے قیام پر آکر میں تجویزیں سوچنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ نواب صاحب کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ لہٰذا کچھ ایسی روش اختیار کرنی چاہیئے۔ کہ بقول کسے "سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"۔ صبح سویرے اٹھ کر میں نے نواب صاحب کے لشکر کے نقارچیوں کو حکم دیا کہ جنگ کے نقارے بجاؤ۔ تاکہ لشکر فوراً لڑائی کیلئے آراستہ ہو جائے۔ لہٰذا انہوں نے فوراً نقارے بجائے۔ نواب صاحب حیران تو ہوئے، لیکن اب مجبور تھے کہ لڑائی لڑنے کے لیے نکلیں۔ چونکہ یکدم جنگی نقارے بجائے گئے تھے۔ لہٰذا نواب صاحب یا ان کے افسروں کو تحقیق کا موقع نہیں ملا۔ جس وقت لشکر آراستہ ہو کر نکلا، تو تازہ کرام مذکورہ گاؤں کے بالمقابل جب ہم پہنچے تو میں نے اپنے آدمیوں کو سب سے اوّل حملے کا حکم دیا۔ چنانچہ نوابی لشکر سے اوّل ہی میں نے اپنے ملازمین سمیت تازہ گرام پر حملہ کر کے نشانے نوابی کی تعمیل بھی کی۔ اور اپنے آپ کو بھی بچا لیا۔ لڑائی شروع ہو گئی تو بہت جلد ہم نے تازہ گرام کو فتح کر لیا۔ تازہ گرام فتح کرنے کے بعد پھر ہم نے ایک دوسرے گاؤں شوہ پر حملہ کر کے اسے بھی فتح کر لیا۔ ادین زئی کے علاقے سے ہم نے سواتی لشکر کو نکال دیا۔ نواب صاحب پھر اپنے لشکر سمیت اوچ میں مقیم ہو گئے۔ اور مجھ سے کہا کہ آپ اپنے گاؤں دلبار چلے جائیں۔ ہم صبح سویرے اپنے لشکر سمیت آئیں گے۔ اور پھر سوات پر لشکر کشی کرنے جائیں گے۔ چنانچہ یہ پروگرام طے ہونے کے بعد ہم اپنے گاؤں دلبار چلے آئے۔ دوسرے روز اسی مقررہ پروگرام کے مطابق ہم علی الصباح اٹھ کر میں نواب صاحب اور لشکر کا انتظار کرنے لگا، دوربین لگا کر جیب میں اوچ کی طرف دیکھا تو

حیران رہ گیا کیونکہ نواب صاحب لشکر سمیت بجائے دلبار کے دیر کی طرف جا رہے تھے۔ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر میں نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ اوچ سے کچھ فاصلے پر ہی جا کر میں نے نواب صاحب کو جا لیا۔ نواب صاحب کے پاس پہنچ کر معلوم ہوا کہ جندول کے خان سید احمد خان نے دیر کے علاقہ پر حملہ کیا ہے۔ اب نواب صاحب مقابلے کے لیے جا رہے ہیں۔ تاہم اس موقع پر میں نے نواب صاحب کے ساتھ سخت کلامی کی اور اسے خوب کھری کھری سنائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب صاحب نے اپنے لشکر کو تو خان جندول کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ اور خود واپس آکر اوچ میں مقیم ہوئے تاکہ جب خان جندول کی مہم سے لشکر واپس ہو تو سوات پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو جائیں۔ جب میں واپس دلبار پہنچا تو صورت حال کچھ اور تھی۔

سوات کے علاقہ موسیٰ خیل کے عمائدین کا جرگہ

"دلبار" اپنے گاؤں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سوات کے علاقہ موسےٰ خیل کے عمائدین چند میرے منتظر بیٹھے ہیں۔ واضح رہے کہ اباخیل، موسیٰ خیل سے مراد سوات میں بریکوٹ کوٹھہ ابوہا وغیرہ مواضعات پر مشتمل علاقہ ہے۔ موسیٰ خیل کے ارکان جرگہ نے مجھے کہا کہ ہم بطور جرگہ آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ جائیں تاکہ ہم اپنے علاقے کا لشکر آراستہ کر کے پھر سوات پر حملہ کر دیں، میں نے اس موقع پر اُن لوگوں کو انکار کیا، لیکن وہ مصر تھے کہ آپ کو ساتھ لے کر ہی ہم جائیں گے۔ چکدرہ کے اس وقت کے ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ میرے دوست تھے۔ چنانچہ میں نے اس کے ساتھ بھی صلاح مشورہ کیا، انہوں نے بھی یہ صلاح دی کہ جب یہ لوگ اتنا اصرار کرتے ہیں تو پھر آپ بھی ان کا مطالبہ مان لیں اور جا کر قسمت آزمائی کر لو۔ ہو سکتا ہے کہ پانسہ پلٹ جائے۔ لہٰذا اس کے بعد ہم موسیٰ خیل کے ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ جس وقت لنڈاکی کے قریب پہنچے تو دریا کے پار عبدالجبار شاہ کے آدمی موجود تھے۔ جب ہم دریائے سوات کو عبور کرنے لگے تو اُن سپاہیوں نے ہم پر فائرنگ شروع کی۔ جب ہم دریائے سوات کو عبور کر

گئے، تو میرے ساتھ جو عمائدین موسیٰ خیل کے تھے وہ تو یہ کہہ کر بھاگ گئے کہ ہم ابھی لشکر لے آتے ہیں۔ میں نے اپنے ملازموں کے ساتھ ان مخالف سپاہیوں کا مقابلہ کیا اور آگے بڑھا۔ اتنے میں موسیٰ خیل کے کچھ آدمی بھی پہنچ گئے۔ موسیٰ خیل کے خان کے لنگڑے بھتیجے نے ہلہ گلا مچایا، کہ یہ موسیٰ خیل کے لشکری ہمارے حکم کے بغیر کیوں آئے ہیں اور جرگہ کیوں گیا ہے۔ اب عین موقع پر لنگڑے خان کی یہ شرارت نقصان دہ تھی۔ درمیان میں آکر میں نے کسی نہ کسی طرح لنگڑے خان کو راضی کر لیا۔ اب راضی ہو کر وہ خود سوات پر لشکر کشی کرنے کے لیے لنگڑاتا ہوا ہم سے آگے آگے روانہ ہوا، کوٹھا اور ابوہا، دونوں مواضعات کے لوگ نکل کر ہمارے ساتھ لشکر میں شامل ہو گئے۔ لیکن اس دوران میں ہمیں اطلاع ملی کہ عبدالجبار شاہ کے آدمیوں نے بہرام خان کو ہمارے برخلاف اکسایا ہے لہٰذا موضع ابوہا سے شاہ بڑلیئے ملک اور میں خود ہم دونوں واپس ہوئے کہ اب لنگڑے خان کے عم بہرام خان کو منائیں، جس وقت ہم بہرام خان کے پاس پہنچے تو بہرام خان کے دونوں بیٹے جو کہ عبدالجبار شاہ کے پاس گئے تھے۔ گھوڑوں پر سوار پہنچ گئے۔ اور عبدالجبار شاہ کی طرف سے جو تحریصی پیغامات لائے تھے، وہ بھی بہرام خان کے گوش گزار کیے۔ بہرصورت ہم نے رات کو مٹے میں بسر کی۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ بہرام خان کے دل میں کھوٹ ہے۔ چند معتمد دوستوں نے بھی صلاح دی کہ اس موقع پر موسیٰ خیل قوم میں دو غلاپن ہے۔ اپر سوات کا غنیم لشکر بریکوٹ پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر آپ لوگوں کو واپس جانا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے بھی یہ صلاح پسند کی اور لشکر کو واپس کر کے ہم دوبارہ اپنے گاؤں دلبار چلے آئے۔ اس موقعہ پر مجھے سخت صدمہ پہنچا، جس کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا، جس وقت ہم دلبار پہنچے تو میں کچھ بیمار تھا۔

دوبارہ نواب دیر کے لشکر کو ساتھ لے کر لشکر کشی

جب ہم کوٹھے سے واپس دلبار پہنچے تو ہم نے نقاروں کی آواز سنی۔ معلوم ہوا کہ نواب صاحب کا لشکر آرہا ہے۔ ہمیں بہت خوشی حاصل ہوئی۔ رات ہم نے دلبار میں بسر کی۔ دوسرے روز لشکر سمیت

ہم سوات کے علاقہ شموزئی میں داخل ہوگئے۔ نواب صاحب نے مجھے شموزئی کے ایک گاؤں ڈیڈاور بھیجا جب میں وہاں پہنچا تو اباخیل، موسیٰ خیل دونوں قوموں کا پیغام مجھے مل گیا۔ کہ اب ہم بالکل متفق ہیں۔ آپ آجائیں، چنانچہ دریا کو پار کرکے میں بریکوٹ پہنچ گیا۔ نواب صاحب قلعہ بنانے میں مصروف ہوگئے۔ لہذا قلعہ تعمیر کرنے میں کچھ دن تو لگ گئے۔ اس دوران میں نواب صاحب کے پاس میری آمدورفت جاری رہی۔ جب قلعہ بن گیا تو میں نے نواب صاحب سے آگے بڑھنے کو کہا۔ لیکن نواب صاحب نے کہا کہ اب تو مشکل ہوگیا۔ کیونکہ عبدالجبار شاہ نے بھی بہت سارے قلعے بنا لیے ہیں۔ اب پروگرام یہ ہے کہ ہم واپس جاتے ہیں اور پھر دوبارہ ادین بنئی کے راستے جاکر نیک پی خیل کے شمالی پہاڑ پر سے اتر کر طوطا نو بانڈی پر حملہ کریں گے۔ اور آپ لوگ بابوزئی کے علاقے پر لشکر کشی کریں، چنانچہ اس پروگرام کے مطابق نواب صاحب نے اپنے لشکر سمیت اک طویل چکر کاٹ کر اسی مذکورہ طریقے کے مطابق طوطا نو بانڈی پر حملہ کردیا۔ اور میں لشکر کو لے کر آگے سیدو کی طرف بڑھنے لگا۔ مختلف مقامات پر سواتی لشکر مخالف کو شکست پر شکست دیتے ہوئے ہم سیدو شریف اپنے آبائی مسکن میں فاتحانہ شان سے داخل ہوگئے اس سیدو میں جس کو کچھ عرصہ پہلے ہم نے انتہائی مجبور ہوکر خیرباد کہا تھا، ادھر ہمارے رفیق نواب صاحب نے طوطا نو بانڈی میں قلعہ تعمیر کرنا شروع کیا۔ ہم نے سیدو میں کافی تعداد میں حفاظتی کوٹلے تیار کیے۔ سیدو میں میرے بھائی شہزادہ شیریں جان نے مجھے کہا کہ دریا کے پار علاقے میں اگر نواب صاحب کو شکست ہوئی تو پھر ہمارے لیے بھی سیدو پر قبضہ برقرار رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ لہذا آپ جاکر نواب صاحب کے ساتھ شامل ہوجائیں۔ تاکہ بصورت دیگر ہمیں آپ امداد دے سکیں۔ اس تجویز کے مطابق میں اپنے دو چار نوکروں کو ساتھ لے کر پہاڑوں کے راستے خفیہ طور سے سیدو سے روانہ ہوگیا۔ لیکن جس وقت ہم شموزئی کے علاقے میں داخل ہوئے تو ہمیں یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ 'سربالا' کے مقام پر لڑائی لڑکر نواب صاحب کو شکست ہوئی ہے۔ لہذا ڈیڈاور میں نواب دیر کے ایک سرکردہ افسر سید میاں سے مل کر میں واپس بریکوٹ چلا آیا۔ اس اثنا میں

عبدالجبار شاہ کے لشکر نے شموزئی میں ڈیڈاور کے قلعے پر بھی حملہ کر دیا۔ میں نے نہایت تیزی کے ساتھ آبا خیل اور موسیٰ خیل کا لشکر منظم کیا اور اسی لشکر کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

مانیار کی لڑائی

مانیار کے قریب عبدالجبار شاہ کا لشکر بھی پہنچ گیا۔ اس اثنا میں نواب صاحب نے بھی حملہ کر کے دوبارہ نصف شموزئی کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ اور نوابی لشکر شموزئی میں مقیم تھا، مانیار کے قریب ہی عبدالجبار شاہ کے لشکر کے ساتھ ہماری لڑائی شروع ہو گئی۔ دریا کے پار علاقے سے نواب صاحب کے لشکر سے صرف ایک سو ساٹھ سوار ہماری امداد کو پہنچ گئے۔ چنانچہ ایک خونریز جنگ لڑنے کے بعد میں نے مخالف دشمن لشکر کو شکست دی۔ عبدالجبار شاہ کا لشکر شکست کھا کر پسپا ہو گیا۔ اور پنجی گرام میں مقیم ہوا۔ نواب صاحب کے سواروں کا دستہ بھی واپس ہوا اور میں نے اپنے لشکر کے ساتھ مانیار میں قیام کیا۔

دوسری لڑائی

میں واضح کر چکا ہوں کہ سربالا کے مقام پر شکست کھا کر نواب صاحب نے دوبارہ حملہ کر کے شموزئی کا نصف علاقہ فتح کیا تھا اور اب لشکر سمیت نواب صاحب شموزئی میں مقیم تھے۔ مانیار میں عبدالجبار شاہ کے لشکر کو شکست دے کر آبا خیل، موسیٰ خیل کے ایک جرگے کے ساتھ میں نواب صاحب کے پاس شموزئی گیا۔ میں نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ اپنے لشکر کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ تاکہ دشمن کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑی جائے چنانچہ نواب صاحب نے نوابزادہ عالم زیب خان کی سرکردگی میں لشکر بھیج دیا۔ مخالف لشکر پنجی گرام ہی میں مقیم تھا۔ "تندو ڈاگ کے پہاڑ میں ہم نے مورچے جما لیے۔

پنجی گرام کے پہاڑ میں دشمن فوج مورچہ زن تھی۔ لہٰذا لڑائی شروع ہوئی۔ دونوں

طرف سے جنگ مضبوطی کے ساتھ لڑی جارہی تھی۔ کہ اس دوران میں سوات کا جرگہ ہمارے پاس آیا۔ اور میعادی صلح کے لیے بات چیت شروع کی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ماہ رمضان سر پہ آ گیا۔ چنانچہ اس مبارک مہینے کے احترام میں میعادی صلح منظور ہوئی۔ نواب صاحب کا لشکر رخصت ہو کر پار چلا گیا۔ نواب صاحب نے وعدہ کیا کہ ماہ رمضان گزرنے کے بعد میں لشکر بھیج دونگا اس کے بعد میں سیدو شریف آگیا۔

ماہِ صیام کے بعد

رمضان کا مہینہ گزر گیا۔ کچھ عرصہ اس کے بعد بھی ہم نے انتظار کیا۔ لیکن نواب صاحب کا لشکر دوبارہ نہیں آیا۔ میرے بھائی شہزادہ شیریں جان مرحوم نے مجھے کہا کہ آپ نواب صاحب کے پاس دیر چلے جائیں اور معلومات حاصل کریں۔ کہ نواب صاحب نے اقرار کے مطابق لشکر کیوں نہ بھیجا۔

نواب صاحب کے پاس دیر میں

سیدو سے چل کر میں نواب صاحب کے پاس دیر پہنچ گیا۔ لیکن دیر میں نواب صاحب سے مل کر میں نے محسوس کیا کہ نواب صاحب کے خیالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دیر کے قومی جرگے نے نواب صاحب کو ہم سے برگشتہ خاطر کر دیا تھا۔ اور نواب صاحب کو تو خدا بخشے کچھ ایسے ہی بھلے مانس انسان تھے۔ ہر ایک کے کہنے میں آجاتے۔ آنکھوں سے زیادہ کانوں پر اعتبار کرتے تھے۔ میں نے دیر میں دو چار روز توقف کیا۔ میرا خیال تھا کہ نواب صاحب خود ہی کسی وقت مجھے بلا کر اس بارہ میں بات چیت شروع کر دیں گے۔ لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ نواب صاحب پہل نہیں کریں گے۔ تو میں خود نواب صاحب سے پھر ملا۔ نواب صاحب نے کچھ ناگوار باتیں شروع کیں، تو میں نے کہہ دیا کہ نواب صاحب میں تو لشکر لینے نہیں آیا

ہوں لیکن آپ نے خود وعدہ کیا تھا کہ میں لشکر بھیجوں گا۔ جب آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تو میں نے یہ ضروری سمجھا کہ خود دیر آ کر حالات سے واقف ہو جاؤں۔ آپ سخت و سست باتیں ہمیں کیوں سناتے ہیں۔ ہمارے ساتھ لشکر کشی کر کے آپ نے جو علاقے فتح کیے ہیں یہ مفتوحہ علاقے آپ مجھے دے دیں۔ لشکر کشی سے متعلق تمام مالی اخراجات میں آپ کو اب بھی ادا کرنے کو تیار ہوں۔ بصورت دیگر اگر آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں تو آپ یقیناً یہ محسوس کریں گے کہ ہم نے تو آپ کو نقصان نہیں فائدہ پہنچایا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ سواتی مخالف لشکر کے ساتھ تو ہماری عارضی صلح ہے۔ اب اگر میں خاموش بھی رہوں تو وہ لوگ تو خاموش نہیں رہیں گے ضرور ہم پر لشکر کشی کریں گے۔ اور میرے لیے تمام سوات کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس موقعے پر میں نواب صاحب کے ساتھ بہت نرمی برت رہا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ سوات میں کہیں ہمارے دشمنوں کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ہم میں اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔ کیونکہ اگر دشمن کو ہمارے اختلافات کا پتہ چل جائے تو حالات خراب ہو جائیں گے۔ لہٰذا میری کوشش یہی تھی کہ اب جس طرح بھی ہو سکے نواب صاحب کو رام کر لوں۔ چنانچہ میں نے نواب صاحب کو تمام حالات بیان کرنے کے بعد کہہ دیا کہ اب اگر آپ لشکر میرے ساتھ نہیں بھیجتے تو نہ بھیجیں۔ البتہ آپ ایسا کریں کہ میدان، سیند، تلاش وغیرہ علاقوں کے لوگوں کو یہ تحریری فرمان بھیجدیں۔ کہ ان لوگوں کو جب بھی میرا پیغام ملے تو ان لوگوں کا قومی لشکر فوراً میرے پاس سوات پہنچے۔ چنانچہ نواب صاحب نے بھی میرا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور فی الفور میدان، سیند، تلاش وغیرہ علاقوں کے لوگوں کو فرامین لکھ کر روانہ کر دیے۔ اس کے بعد میں دیر سے سوات چلا آیا۔

سوات کے ناکام حکمران عبدالجبار شاہ اور مخالف سواتیوں کی ایک اور کوشش

اس اثناء میں جبکہ میں سوات سے باہر رہا سوات کے لوگوں نے کانا، غوربند، چکیسر، پورن، لیلونٹے وغیرہ علاقوں میں جاکر ان لوگوں کا ایک لشکر تیار کیا۔ مخالفین کہ تجویز یہ تھی کہ سرسرداری کے میانگان صاحبان جو کہ ہمارے طرفدار تھے اور ہماری پارٹی میں شامل تھے ان پر کانا، غوربند، کی طرف سے حملہ کرکے ان کی قوّت ختم کردیں۔ تاکہ وہ ہمارے ساتھ کسی قسم کی امداد کے قابل نہ رہ جائیں۔ اس کے بعد پھر متفقہ طور سے سیدو شریف پر لشکر کشی کرکے ہمیں ختم کردیں۔ چنانچہ اس پروگرام اور جدوجہد سے باخبر ہوکر میں نے اپنا آدمی بھیج کر دیر کے ان علاقوں کا قومی لشکر طلب کرلیا۔ جن کو نواب صاحب نے فرامین بھیجے تھے۔ دیر کے ان مذکورہ علاقوں کا لشکر آگیا۔ لیکن اب لشکر والے آباخیل، موسیٰ خیل کے علاقے سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں تھے۔ مجبور ہوکر میں نے اس تجویز کو تسلیم کرلیا کہ آباخیل موسیٰ خیل کے علاقے میں دیر کا قومی لشکر مہمان ہوکر رہے۔ خود آباخیل موسیٰ خیل کے علاقے کا لشکر آکر سیدو میں مہمان ہوجائے۔ اور سیدو سے ہمارا لشکر سرسرداری کے میانگان صاحبان کی امداد کے لیے چلا جائے۔ چنانچہ اسی پروگرام کے مطابق نقل وحرکت کی گئی۔ ہمارے لشکریوں نے جاکر "شرنا" کے مقام پر سوات کے علاقہ بابوزئی کے لشکر کو شکست دی۔ کانا، غوربند وغیرہ علاقوں کے لشکر کو خود میانگان صاحبان کے لشکر نے "ملم" کے مقام پر شکست دے کر واپس بھگا دیا۔ اس دوران میں سیدو شریف میں مقیم اباخیل، موسیٰ خیل کے مہمان لشکریوں نے کچھ ایسی ناجائز

حرکتیں شروع کیں کہ ہم ان سے تنگ آ گئے ، لہٰذا مجبور ہو کر میں نے انہیں واپس رخصت کر دیا۔ میں نے دیر کے قومی لشکر کو سیدو شریف آنے کے لیے بہت کہا۔ لیکن وہ خدا کے بندے تو مہمانی کا لطف آباخیل، موسیٰ خیل کے علاقے میں اٹھانے کے لیے آئے تھے۔ مانیار سے اس طرف ایک قدم بھی بڑھانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

بہرصورت اس وقت آباخیل، موسیٰ خیل کے لشکریوں نے ہمیں اس قدر مجبور کیا تھا کہ ہم نے یہی سوچا کہ دشمن لشکر اگر چڑھائی کر کے ہمیں ختم بھی کر دے تو بہتر ہے۔ لیکن اس لشکر کو واپس کرنا ہی قرینِ مصلحت ہے۔

مخالف لشکر کی دوسری چال

سوات کے لشکر نے ہم کو ختم کرنے کا منصوبہ تو بنایا۔ لیکن اس سے پہلے انہوں نے سوات کے ملاؤں اور بزرگ خاندانوں کے افراد پر مشتمل ایک جرگہ ہمارے پاس بھیجا اور اس جرگے کے ذریعے ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا۔ کہ ہم بالکل خاموش اور لاتعلق ہو جائیں۔ ہم بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ رسمی طور سے دکھلاوے کے لیے کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم نے جرگے کے ارکان سے کہہ دیا۔ کہ ہم غیر جانبدار رہیں گے۔ اس کے بعد پھر سوات کا لشکر منتشر ہو گیا۔

علاقہ بابوزئی کی حکومت اور مقام تھانہ میں ایک کانفرنس

بہار کا موسم تھا، کہ مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ نے کسی معاملے میں سوات کا قومی جرگہ طلب کیا۔ چنانچہ سوات کے قومی جرگے کے اراکین نے ہم سے کہا کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ تھانہ میں بطور جرگہ بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم تھانے پہنچ گئے۔ سوات کے قومی جرگے کے اراکین کے ساتھ ہماری مشترکہ کانفرنس تھانہ میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں میں نے دو شرائط پیش کیں۔ جبکہ ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ سوات کے معاملات اور نواب دیر کی امداد سے

لاتعلق ہوجائیں۔ میری شرائط یہ تھیں:۔

۱۔ علاقہ بابوزئی پر میری حکومت تسلیم کی جائے۔

۲۔ آباخیل، موسیٰ خیل کے علاقے کو خود مختار علاقہ قرار دیا جائے۔ اور نیز ان کی پارٹی میرے ساتھ ہوگی۔

اراکین جرگہ نے میری شرائط تسلیم کیں۔ تو میں نے اس کے بعد وعدہ کیا کہ میں بقایا سوات سے کوئی سروکار نہیں رکھوں گا۔ چنانچہ ہماری صلح ہوگئی۔ اس کے بعد عبدالجبار شاہ کے ساتھ بھی ہماری صلح صفائی ہوگئی۔ اب یہ طے ہوا کہ نواب دیر کے پنجے سے سوات کو چھڑانے کے لیے اب مشترک جدوجہد کی جائے گی۔

نواب دیر کے برخلاف مشترک جدوجہد

تھانہ سے ہم کامیاب واپس آئے۔ اب سوات کے علاقوں سے نواب دیر کو نکالنے کے لیے ہم نے مشترک جدوجہد شروع کی۔ لہٰذا عبدالجبار شاہ کے لشکر کے ساتھ ہمارا لشکر بھی شامل ہو گیا۔ علاقہ شموزئی میں چورنگ کے مقام پر نواب صاحب کا قلعہ تو پہلے سے موجود تھا۔ ہم نے اس کے بالمقابل تیرنگ میں قلعہ بنوانا شروع کیا۔ وہیں ایک پہاڑی پر ہم نے ایک گڑھی بھی بنوائی۔ اب کافی عرصہ یہ حالت رہی کہ سامنے بالمقابل نواب صاحب کا لشکر پڑا ہوا ہے اور اس طرف ہمارا لشکر مقیم تھا۔ لڑائی شروع نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح بے کار پڑے ہوئے دونوں لشکر تھک گئے تو میعادی صلح کے لیے گفتگو شروع ہوئی۔ آخرکار میعادی صلح ہوگئی۔ دونوں لشکر واپس ہوئے۔ شموزئی کے علاقے میں ہم برابر رہے۔ یعنی کہ نصف علاقہ نواب صاحب کے قبضے میں رہا اور نصف علاقہ نواب صاحب کے قبضہ میں رہا۔ اور نصف علاقہ ہمارے پاس رہ گیا۔ نواب صاحب نے اب عبدالمتین خان کے ساتھ اتحاد کرلیا۔

نواب دیر اور عبدالمتین خان کا اتحاد

پیشتر اس سے کہ آگے کے حالات بیان کیے جائیں، کچھ یہاں پر عبدالمتین خان کے بارہ میں بتلانا ضروری سمجھتا ہوں، باجوڑ کے خان عمرا خان جنہوں نے ۱۸۹۱ء میں دیر پر حملہ کر کے نواب محمد شریف خان کو شکست دے کر دیر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ تو نواب صاحب نے جلاوطنی کے ایام سوات کے شہر مینگورہ میں گزارے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں اسی عمرا خان نے چترال جانے والی انگریزی ریلیف فوج کو روک دیا۔ اب انگریزوں نے عمرا خان کی شخصیت اور طاقت کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے ہوئے عمرا خان پر حملہ کیا۔ نواب محمد شریف خان کو دوبارہ سوات سے بلا کر دیر کا نواب بنا دیا گیا۔ عمرا خان اپنے عیال سمیت بھاگ کر کابل چلا گیا۔ عبدالمتین خان اسی عمرا خان کا فرزند تھا جو کہ عمرا خان کی وفات کے بعد بھی کابل میں رہتا تھا۔ دیر کے نواب اورنگ زیب خان نے اسے کابل سے بلا کر اس کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ جندول کے خان سید احمد خان سے جندول کا علاقہ بزور شمشیر لے کر تمہیں جندول کا خان بنا دوں گا۔ عبدالمتین خان جب باجوڑ پہنچا تو علاقہ جندول کے ایک قصبہ طور کے خوانین نے فوراً اس کے ساتھ پارٹی بنائی۔ اور طور کا قصبہ عبدالمتین خان کے حوالے کر دیا۔ یہ حالات دیکھ کر جندول کے خان سید احمد خان کے اوسان خطا ہو گئے۔ لڑائی ہوئی تو سید احمد خان شکست کھا گیا۔ نواب دیر نے جندول کے دو اہم کلیدی مقامات یعنی باڑدہ اور مونڈا جو کہ زرخیزی اور شادابی کے لیے مشہور ہیں اپنے قبضے میں کر لیے۔ بقایا جندول کا علاقہ حسب وعدہ عبدالمتین خان کے حوالے کر دیا۔ کچھ عرصہ کے لیے عبدالمتین جندول کا خان بن گیا۔

... دوبارہ حکومت کی دعوت مجھے

عبدالمتین خان کے ساتھ اتحاد کے بعد سوات کے لوگوں نے محسوس کیا۔ کہ اب سوات کو نواب دیر کے تسلط سے بچانا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ حکمران عبدالجبار شاہ کی کمزور شخصیت سے اب

یہ لوگ واقف ہو چکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سید عبدالجبار شاہ کی ذات میں ایسی کمزوریاں تھیں کہ وہ حکمرانی کے لیے موزوں انسان نہیں تھا۔ اس ہنگامہ خیز زمانے میں حالات اور افغانی سیاست کے مطابق سوات یا کسی بھی قبائلی علاقے کی حکمرانی کے لیے جس قسم کے اوصاف، جس تدبر اور جس بارعب شخصیت کا ہونا لازمی تھا، بدقسمتی سے عبدالجبار شاہ کی شخصیت اس قسم کے مذکورہ اوصاف سے یکسر عاری تھی۔ لہٰذا سوات کے لوگوں نے بجا طور سے یہ محسوس کیا کہ سید عبدالجبار شاہ بحیثیت حکمران اس قابل نہیں ہے کہ نواب دیر کی یلغاروں کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے بعد سوات کے لوگوں نے دوبارہ ایک جرگہ طلب کیا۔ ایک مجنزل قومی اجلاس میں یہ متفقہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ مجھے ایک بار پھر سوات میں حکومت بنانے اور سوات کو نواب دیر کے تسلط سے بچانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق جب سوات کے لوگوں نے مجھے حکومت بنانے کی دعوت دی تو میں نے اب کی بار یہ دعوت منظور کی۔ اس لیے کہ اب ہمارے خاندانی اختلافات تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ سید عبدالجبار شاہ سابق حکمران سوات کو احترام کے ساتھ بحفاظت تمام اس کے اپنے گاؤں سنتانہ ضلع ہزارہ پہنچایا گیا۔ اس دوران میں جب سوات کے علاقہ شموزئی کے لوگوں نے میری حکومت بننے کا سنا تو انہوں نے نواب دیر کے ساتھ اپنی پارٹی بنائی اور شموزئی کے علاقے میں ہمارا قلعہ بھی نواب صاحب کے حوالے کر دیا۔ نواب صاحب بغیر کسی جنگ لڑنے کے اب شموزئی کے سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔

۱۹۱۵ء میں بمقام کبل اجلاس عام میں میری تاجپوشی کی رسم

نہایت نامساعد حالات تھے، مایوس کن اور پُرآشوب جیسا وقت تھا جبکہ میں نے سوات میں حکومت بنانے اور پھر سوات کو ایک مضبوط ریاست کی شکل دینے، نواب دیر اور نواب امب کے تسلط سے اور اس کے ساتھ انگریزی حکومت کی خفیہ دخل اندازیوں سے سوات کو بچانے کی ذمہ داریاں قبول کیں۔ بظاہر ہر طرف سے ناکامی کے آثار نظر آ رہے تھے اس لیے کہ یہ ایک ایسی

سرزمین تھی کہ یہاں پہلے کوئی حکومت یا تنظیم ہی نہیں تھی - یہ تو قبائلی آزاد علاقہ تھا جس میں ہر طاقت ور انسان اپنے ماحول کا حکمران تھا - تشدد اور ذاتی مفاد اس کا آئین تھا - عبدالجبار شاہ بیچارے کی مختصر عہدِ حکومت میں بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا - کوئی خزانہ نہیں تھا - لشکری تنظیم نہیں تھی - ملکی بچاؤ کے لیے قلعے نہیں تھے - سوائے اس کے کہ اس زرعی قسم کے علاقے کے لوگ عشر کی صورت میں غلہ دینا تسلیم کر چکے تھے - اس زمانے میں بظاہر نقد آمدن کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی تھی، اور یہ کیسے ہو سکتا تھا جبکہ سوات کا علاقہ اس زمانے میں سابق صوبہ سرحد کے اضلاع مردان، پشاور سے بالکل کٹا ہوا تھا - آمدورفت کے ذرائع نہیں تھے - پیدل آمدورفت تھی - وہ بھی ہزاروں تکالیف اور مشکلات کے ساتھ ہوتی تھی - باربرداری کے لیے خچر استعمال کیے جاتے تھے - نمک جیسی سستی اور عام دستیاب ہونے والی چیز جو کہ انسانی ضروریات زندگی میں اہم اور بنیادی شے ہے - اس ماحول میں کمیاب تھی - تحصیل نوشہرہ کے خٹک اگر خچروں پر تجارت کے لیے نمک لاتے تھے تو یہاں کے لوگ بہت خوشی سے نمک کو گھی اور شہد کے ساتھ برابر تولنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے غرضیکہ اس قسم کے حالات تھے اور پھر سب سے زیادہ مایوس کن امر یہ تھا کہ ان لوگوں کی وفاداری کا کوئی بھروسہ نہیں تھا - بہت جلد اور یک دم یہ بدل جاتے تھے - ان تمام حوصلہ شکن امورات کے باوجود ایک امر یہ تھا کہ میں نے صدق دل سے اور عزم صمیم سے ان لوگوں اور اس وطن کی حالت سنوارنے کا تہیہ کیا ہوا تھا - اپنی صداقت اور خلوص کے ساتھ ساتھ مجھے بحیثیت ایک مسلمان کے خدائی امداد پر کامل بھروسہ تھا - مجھے اس خدائی ارشاد پر مکمل اعتماد تھا کہ ہم ان لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں جو خلوص دل سے ہمت کرتے ہیں - لہٰذا میرا عقیدہ تھا کہ خداوند کریم کے فضل و کرم سے ہی ہم کامیاب ہوں گے - اس قبائلی ماحول کے حکمران کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ خود بھی شجاع اور نڈر ہو - اور بحیثیت سپریم کمانڈر کے فوجی طور طریقوں سے بھی واقف ہو - اس کے ساتھ ساتھ ایک دور اندیش مدبر اور سیاستدان بھی ہو - زیادہ ضرورت اس وقت اسلحے کی تھی - انگریزی علاقے سے ہمارے لیے اسلحہ حاصل کرنا مشکل تھا - بہرصورت خداوند کریم کی

ذات پر تکیہ کرتے ہوئے اِن نے سوات کی حکمرانی جو اس زمانے میں صدہا مصائب اور خطرات کا ایک مجموعہ تھی قبول کی۔ ابتدا میں تو یہ بالکل کانٹوں کا ہار تھا۔ یہ ۱۹۱۵ء کا زمانہ تھا جبکہ یورپ میں جنگِ عظیم لڑی جارہی تھی۔ دریائے سوات کے پار علاقہ نیک پی خیل میں کبل ایک پُرفضا اور خوشگوار مقام ہے۔ اسی کبل میں قدرتی بنا ہوا ایک وسیع سبزہ زار میدان ہے۔ اس سبزہ زار میں سوات کے سرکردہ عمائدین اور عام لوگوں کا ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا۔ اسی اجلاس میں میری دستار بندی (تاجپوشی) کی رسم ادا ہوئی۔ سوات کے لوگوں نے بیعت کرکے میری حکمرانی تسلیم کی اور بحیثیت حکمران قوم کی طرف سے مجھے بادشاہ صاحب کا خطاب دیا گیا۔

حکمران سوات بننے کے بعد

حکمران بننے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہمارا مقابلہ ایک ایسے مضبوط اور مستحکم ریاست کے نواب کے ساتھ ہے۔ جس کے پاس خزانہ، اسلحہ، لشکر پیادہ، سوار فوج اور لڑائی کے تمام ساز و سامان موجود ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی انگریزی حکومت بھی اس کی پشت پناہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد اور میرے دادا، اخوند صاحب سوات نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیے تھے۔ لہٰذا انگریز ہمیں خاندانی دشمن سمجھتے تھے۔ اور اس کے برعکس دیر کو وفادار ریاست سمجھتے تھے۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ سوات ایک ایسی سرزمین تھی۔ کہ یہاں کے لوگ کسی قانون، کسی ضابطے اور پابندی کو برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ حکومت بنانے کے بعد اب ریاستی باشندوں کی حیثیت سے ان کے فرائض کیا ہیں۔ اس قسم کے نامساعد اور حوصلہ شکن حالات تھے۔ جبکہ اللہ کا نام لے کر سمندرِ حیات میں کشتیٔ سوات کی ناخدائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا احساس تھا۔ اور میں اس حقیقت سے آگاہ تھا۔ کہ انیسویں صدی کے رجلِ عظیم صاحب سوات نے سوات کے تعمیر و اصلاح کا جو سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب مجھے

اسے پایۂ تکمیل کو پہنچانا ہے۔ اپنے عظیم اور قابل صد احترام دادا یعنی صاحبِ سوات کی عظمت اور احترام کی حفاظت بھی اس کے ساتھ ہی اب میرے فرائض میں سے اہم فرض تھا۔ چنانچہ میں تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ سب سے اول تو یہ ضرور تھا کہ سوات کے علاقہ شموزئی کو نواب صاحب کے تسلط سے آزاد کراؤں۔ لہٰذا لشکر کی آراستگی شروع کی۔

پہلی کامیابی، علاقہ شموزئی پر قبضہ کرنا۔

۱۹۱۵ء میں ہی جندول کے خان عبدالمتین خان اور نواب صاحب کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ ان کا اتحاد زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکا۔ اختلافات پیدا ہوگئے۔ جب مجھے ان اختلافات کے متعلق اطلاع ملی تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان حالات میں نواب صاحب سوات پر لشکر کشی کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ لہٰذا اس موقعے کو غنیمت سمجھ کر میں نے علاقہ شموزئی پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا۔ شموزئی کو فتح کرنے کے بعد ہم علاقہ ادین زئی کو بھی فتح کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے کہ اس دوران میں مجھے اطلاع ملی کہ نواب دیر نے جندول کے خان عبدالمتین خان کو شکست دے دی۔ لہٰذا ہماری پیش قدمی رک گئی۔ ادین زئی کا علاقہ نواب صاحب کے قبضے میں رہ گیا۔

صرف ایک سال کے بعد شہزادہ شیریں جان کی شہادت

۱۹۱۶ء میں سوات کے چند خوانین نے نواب صاحب دیر کے ساتھ پارٹی بنالی۔ نواب صاحب نے مکمل تیاری کے بعد ایک جرار لشکر لے کر ادین زئی کے راستے سوات کے علاقہ شموزئی پر لشکر کشی کی۔ نواب صاحب کے ساتھ اب کے بار ریاستی افواج کے علاوہ باجوڑ، سیند میدان وغیرہ علاقوں کا قومی لشکر بھی تھا۔ علاقہ شموزئی میں لڑائی شروع ہوگئی۔ ریاست سوات کے کچھ لشکر کی کمان میرے بھائی شہزادہ شیریں جان کے ہاتھ میں تھی۔ شموزئی کے ایک

مقام خزانہ کے قلعے میں شہزادہ موصوف محصور ہو گئے۔ اب یہ تو میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ سوات کی نوزائیدہ ریاست کی طاقت ریاست دیر کے مقابلے میں تو بہت کم تھی۔ اسلحہ اور سیگزین کی کمی تھی۔ ایک خونریز جنگ لڑنے کے بعد نواب صاحب کو اس جنگ میں جیت ہوئی۔ اس لڑائی میں میرا بھائی شیریں جان شہید ہو گیا۔ سوات کے سینکڑوں دوسرے افراد بھی اس جنگ میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ سینکڑوں مجروح ہو گئے۔ نواب دیر کے فاتح لشکریوں نے ہر قسم کے جنگی اور قومی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہایت وحشیانہ مظالم کیے میں نے خود بھی چند سواروں اور ایک دستہ پیدل فوج کے ساتھ سونگلی کے راستے نواب صاحب کی فوجوں پر حملہ کر دیا، لیکن بیسود۔ چونگی کا قلعہ ہمارے قبضہ میں تھا لیکن ہم کمزور تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس موقعے پر ہم اس قلعے پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتے۔ بے فائدہ کشت و خون کی ضرورت نہیں ہے۔ مذکورہ قلعے کو بھی ہم نے چھوڑ دیا۔ شموزئی کے علاقے پر دوبارہ نواب دیر نے قبضہ کر لیا۔

مولوی عبدالعزیز ہشت نگری کی کاروائی

اس زمانے میں جبکہ ہماری حالت کمزور تھی اور ہمیں قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ ہم قوت سے سوات کو بچا سکیں گے۔ لیکن خدا کی مہربانی شامل حال تھی۔ اس وقت جبکہ نواب دیر لشکر سمیت علاقہ شموزئی میں مقیم تھے تو باجوڑ کے خارخان بھی اپنے قومی لشکر کے ساتھ نواب صاحب کے ساتھ شامل تھے۔ اور اس جنگ میں حصہ لے چکے تھے۔ اب یہ مشترکہ فوج شموزئی میں مقیم تھی تو سوات کی ریاست خطرے میں تھی، لیکن میرے ایک خاص معتمد مولانا عبدالعزیز جو اتمان زئی علاقہ ہشت نگر ضلع پشاور کے رہنے والے تھے۔ اور میرے خاص اشخاص کارندوں میں سے ایک تھے۔ انہی دنوں کسی خاص کام کے لیے باجوڑ گئے تھے۔ باجوڑ میں جب اسے میرے بھائی شہزادہ شیریں جان کی شہادت کی اطلاع ملی تو باجوڑ کے بابڑے ملا صاحب سے مل کر انھوں نے علاقہ باجوڑ میں باجوڑ کے خان آف خار کے برخلاف لوگوں کو اس کے مظالم کے حالات بیان کیے سالارزئی

قوم میں جابجا یہ پراپیگنڈہ کیا کہ خارخان کا خواہ مخواہ نواب دیر کے ساتھ مل کر سوات پر لشکر کشی کرنا ایک ظالمانہ فعل ہے۔ ان لوگوں کے مظالم کی انتہا یہ ہے کہ سوات کے اس جنگ میں ظالموں نے صاحبِ سوات کے نواسے شہزادہ شیریں جان کو بھی شہید کر دیا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالعزیز کی تقاریر سے سالارزئی قوم خارخان کے اس ظالمانہ رویے اور نامناسب اتحاد کے برخلاف مشتعل ہو گئی۔ انہوں نے خارخان کے علاقے پر وہاں باجوڑ میں لشکر کشی کر کے اس کے ماموں کو قتل کر دیا اور ساتھ ہی اس کے دو قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ خان آف خار کو جب شموزئی میں ان واقعات کی اطلاع ملی۔ تو اب وہ مجبور تھا کہ واپس اپنے وطن جائے۔ چنانچہ جب خارخان اپنے لشکر سمیت روانہ ہوا تو اب نواب صاحب بھی اصولاً اس کے ساتھ واپس جانے اور امداد کرنے پر مجبور تھے۔ لہٰذا علاقہ شموزئی سے نواب صاحب اور خارخان دونوں اپنے لشکروں سمیت واپس چلے گئے۔ اس حکمت عملی کی بدولت سوات کے نوزائیدہ ریاست کی سرحدوں پر آئی ہوئی بلا کچھ عرصہ کے لیے ٹل گئی۔

استحکامِ حکومت اور فوجی تنظیم

سوات کی حکومت اور اس کی دعوت نامنظور کرنے کے سلسلے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کسی بھی ریاست میں دو حکمرانوں کی حکومت بیک وقت ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ شموزئی کے اس جنگ میں شہزادہ شیریں جان کی شہادت کا صدمہ میرے لیے ناقابلِ فراموش صدمہ تھا جو کہ اس جنگ میں مجھے پہنچ گیا۔ وہ برادرِ عزیز جس کے ساتھ صلح اور اتحاد کرنے کے لیے میں اپنی جان پر کھیل گیا تھا اس کی شہادت میرے لیے باعثِ غم واندوہ ضرور تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں اس حقیقت کا اعتراف کروں گا کہ میرا بھائی جب زندہ تھا تو باوجود اس کے کہ سوات میں بانیٔ ریاست اور حکمران میں تھا وہ بھی خود کو حکومت میں برابر کا شریک سمجھتا تھا۔ مجھے اس کی یہ شرکت بھی گوارا تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ہر فوجی اور سیاسی معاملے میں میرے ساتھ اختلاف بھی کرتے تھے۔ اور ہر معاملے میں مخالف رائے دیا کرتے تھے۔ مثلاً جب میں کہتا کہ سوار فوج کو مضبوط کرنا از حد ضروری ہے کیونکہ نواب صاحب کی سوار

فوج مضبوط ہے تو شہزادہ موصوف کہتے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پیدل فوج کو مضبوط کرنا از حد ضروری ہے اُنھیں حالات کی نزاکت کا احساس ہی نہیں تھا اب جبکہ وہ شہید گئے تو میں تنہا رہ گیا۔ نواب صاحب جب شموزئی سے چلے گئے تو میں نے سوار فوج کی طرف زیادہ توجہ کی اور سوار فوج کو پہلے سے زیادہ مضبوط اور منظم بنا دیا۔ نواب صاحب کے جانے کے بعد ہمیں جو موقع مل گیا تو اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اپنی قوت حتی المقدور بڑھائی۔

۱۹۱۷ء میں نواب دیر کا سوات پر دوسرا حملہ

ایک سال گزر گیا تو دیر کے نواب صاحب کو پھر سوات پر لشکر کشی کرنے کا خیال آیا۔ اب کے پھر ایک جرار لشکر ساتھ لے کر شمال کی طرف سے سوات کے علاقہ نیک پی خیل میں اتر آیا اور طوطا تو بانڈی پر حملہ کر دیا۔ طوطان بانڈی میں ہمارا قلعہ تھا۔ پاکا ڈھیری کے مقام پر ہماری فوج مقیم ہو گئی۔ نواب صاحب پہاڑ سے اتر آئے تو لڑائی شروع ہو گئی۔ سوات کے چند خوانین درپردہ نواب صاحب سے ملے ہوئے تھے۔ لیکن لڑائی میں ہم نے نواب صاحب کو شکست دے دی۔ واضح رہے کہ اس جنگ میں سوات کے سوار فوج کی تعداد صرف ساٹھ تھی۔ اور بس۔ انہی ساٹھ سواروں کے ساتھ ہم نے نواب صاحب کے سوار فوج کا مقابلہ کیا شکست کھا کر نواب صاحب براستہ شموزئی واپس ہوئے۔

نواب دیر کا تیسرا حملہ ریاست سوات پر

چند مہینے گزر گئے تو نواب صاحب پھر لشکر لے کر شموزئی کے راستے سوات میں داخل ہوئے۔ شموزئی سے کچھ آگے بڑھ کر جاؤنٹر اور سویگلی کے مقامات پر نواب صاحب بمعہ لشکر مقیم ہو گئے۔ میدانوں میں ہماری فوج جمع ہو گئی۔ کچھ عرصہ یونہی دونوں فوجیں بالمقابل پڑی رہیں۔ لیکن نواب صاحب نے محسوس کیا کہ لڑائی میں شاید انھیں پھر شکست ہو جائے

لہٰذا بغیر لڑے ہی یہ لشکر واپس چلے گئے۔

اب خدا کی شان دیکھئے کہ ہم اس قدر طاقتور اور قابل ہو چکے تھے کہ نواب صاحب جیسے طاقتور حریف بھی ہمارے ساتھ جنگ سے ہچکچانے لگے۔ یہ سب کچھ خدائی امداد کے ذریعے تھا۔

۱۹۱۸ء میں نواب صاحب کا چوتھا زوردار حملہ سوات پر

۱۹۱۸ء میں ایک سال کے بعد جب اپر سوات کی ایک پارٹی نے نواب دیر کے ساتھ پارٹی بنائی تو نواب صاحب نے پھر ایک جرار لشکر کے ساتھ سوات پر اپر سوات کے راستے حملہ کیا۔ بہا کے مقام پر لڑائی ہوئی لیکن نواب صاحب کو فتح حاصل ہو گئی۔ لہٰذا ہم پسپا ہوتے اور واپس آ کر قلعہ نل میں اور سمبٹ میں ہم مقیم ہو گئے۔ نواب دیر اپنے لشکر سمیت آگے بڑھا اور طوطکی میں قلعہ بنوانا شروع کیا۔ شان گوئی میں اس کی فوج مقیم ہو گئی۔ اس دوران میں جبکہ اپر سوات کی ایک پارٹی نواب صاحب کے ساتھ جرگے شروع کیے۔ اس دوران میں پھر حالت ایسی تھی کہ ہم انتہائی کمزور تھے۔ لیکن انہی دنوں ایک عجیب واقع پیش آیا۔

ایک خواب ایک حقیقت

آگے چل کر میں اپنے خوابوں کے متعلق کچھ بیان کروں گا۔ یہاں پر ایک خواب بیان کرتا ہوں کہ جس کا تعلق اس جنگ سے ہے۔ سیدو میں دو عورتیں تھیں۔ دونوں کے شوہر زندہ تھے۔ لیکن یہ دونوں عورتیں بہت جھگڑالو عورتیں تھیں۔ شور و شر، جھگڑا کرنے اور طوفانِ بدتمیزی برپا کرنے میں ایک دوسری سے بڑھ کر تھیں۔ انہی دنوں میں جب کہ اپر سوات میں نواب دیر کا لشکر مقیم تھا ہماری حالت نازک تھی۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا اور خواب میں سیدو کی مذکورہ جنگ باز عورتوں کو اس حالت میں دیکھا کہ گویا وہ دونوں ایک ہی خاوند کی دو منکوحہ عورتیں ہیں اور سوکنوں کی حیثیت سے دونوں آپس میں زور شور سے لڑ رہی ہیں۔ اور جھگڑتی ہیں۔ میں نے

دونوں کو منع کیا کہ آپس میں مت لڑو۔ لیکن انہوں نے میرا کہا نہ مانا، بدستور جھگڑتی رہیں۔ میں نے دونوں میں سے ایک کو تھپڑ مارا تو خاموش ہوگئیں۔ یہ خواب دیکھ کر میں جاگ پڑا۔ اب خدائی امداد کا تماشہ دیکھئے کہ اس دوران میں جبکہ نواب دیر اپنے لشکر سمیت اپر سوات کے شانگوٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اُدھر عبدالمتین خان نے جندول پر حملہ کرکے جندول کے اہم مقام بارڑوے پر قبضہ کر لیا۔ ان دنوں میں ڈاک مالاکنڈ کے راستے آتی تھی۔ لہٰذا دن کو تو مجھے کوئی اطلاع نہ ملی۔ لیکن رات کو چکدرے سے ایک سپاہی آیا تو مجھے اس کے ذریعے ان مذکورہ واقعات کی اطلاع ملی کہ عبدالمتین خان نے بارڑوے پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنے محرر کو طلب کیا۔ اور اپنے لشکر والوں کو ایک خط بدیں مضمون لکھوایا کہ تم لوگ تیار ہو جاؤ۔ نواب دیر لشکر سمیت واپس جائے گا۔ جب نواب صاحب کا لشکر روانہ ہو جائے تو پھر اس پر حملہ کر دو۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی۔ چنانچہ دوسرے روز جب مخالف لشکر روانہ ہوا تو ہمارے لشکر نے میری ہدایات کے بموجب ان پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں نواب دیر کے لشکر کے سینکڑوں آدمی ہلاک ہوگئے۔ نواب صاحب بُری حالت میں سوات سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہمارا لشکر برابر تعاقب میں جا رہا تھا۔ اس لڑائی میں ہم نے شموزئی کے علاقے پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور پھر شموزئی سے بھی آگے بڑھ کر ادین زئی کے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا ہم ادین زئی سے بھی آگے بڑھ رہے تھے کہ اس دوران میں ہمیں اطلاع ملی کہ نواب صاحب نے عبدالمتین خان کو شکست دے کر جندول کو دوبارہ فتح کر لیا۔ لہٰذا ہماری پیش قدمی رک گئی۔ ادین زئی پر ہم نے مکمل قبضہ کر لیا۔

۱۹۱۸ء میں نواب دیر نے اگرچہ پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ہم پر حملہ کیا تھا لیکن اس جنگ میں ہمیں فائدہ ہوا کہ اپنے علاقے شموزئی کے ساتھ ساتھ ادین زئی کے علاقے کو بھی ہم نے فتح کر لیا۔

استحکامِ حکومت اور وسعت

سوات میں ازی خیل اور جانی خیل کے علاقے میری عملداری میں شامل نہیں تھے۔ مذکورہ

لڑائی میں فتح حاصل کرنے کے بعد ازی خیل اور جانکی خیل کے لوگ بطور جرگہ میرے پاس آئے اور حکومت میں اپنے علاقے شامل کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ یہ علاقے بھی حکومت میں شامل ہو گئے۔ اب حالت یہ تھی کہ لنڈاکی تک کا علاقہ میرے قبضے میں آ گیا۔ وادیٔ سوات پر میری حکومت قائم ہو گئی۔ اور خاصی مضبوط ہو گئی۔ اس دوران میں ہم نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ سوات کی فوجوں کو منظم کیا۔ اور خوب مضبوط کیا۔ صورتِ حال اب یہ تھی کہ سوار فوج کی تعداد سات سو تک پہنچ چکی تھی۔ جبکہ ۱۹۱۷ء میں نواب دیر کے ساتھ دوسری جنگ لڑتے وقت میرے پاس ساٹھ سواروں کا صرف ایک دستہ تھا۔

اس زمانے کا سوات

اور خوانین لوگ

اب میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں جب کہ میں نے سوات میں حکومت بنائی اس دور میں اس ماحول میں بسنے والے خوانین کی ذہنیت کے متعلق کچھ بتلاؤں۔ حقیقت یہ ہے کہ سوات کی اس زمانے میں خوانین کی گرفت میں کچھ ایسی حالت تھی جیسا کسی خوبصورت اور نازک بلبل کی صیاد کے کھردرے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ سہمی ہوئی پریشان حالت جو کسی پنچھی کی پنجۂ صیاد میں ہوتی ہے۔ بس کچھ ایسی ہی حالت سوات کی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں ان لوگوں نے قولاً تحریری حکومت تسلیم کی۔ لیکن اس حقیقت سے بے خبر تھے۔ کہ حکومت بننے کے بعد شہریوں کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ کسی ضابطے یا قانون کے ماتحت رہ کر زندگی بسر کریں۔ سوات کے خوانین اور صاحب حیثیت قسم کے لوگ تو قطعاً اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ وہ خود بھی کسی قانون کی پابندی کریں۔ یہ تو خدائی فوجدار بنے ہوئے اپنے آپ کو ہر اخلاقی اور قانونی پابندی سے بالاتر سمجھتے تھے۔ اب رہ گئی مذہبی پابندی۔ تو یار لوگ اس سے بھی خود کو آزاد کیے ہوئے تھے۔ حکومت بننے کے بعد ان لوگوں نے یہ تسلیم کیا کہ ہم عُشر دیا کریں گے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ جب کسی علاقے یا گاؤں میں عشر لینے کا وقت آتا تو اس علاقے کا خان اپنے آدمی لے آتا۔ کہ یہ میرا قاضی ہے۔ یہ میرا ناظر ہے اور یہ میرا چوکیدار ہے۔ اب ان کو عُشر دے دو۔ گویا ان کی تنخواہ مجھ سے لیا کرتے تھے یا اپنا دیا ہوا عُشر ان حیلوں اور بہانوں سے واپس لیتے تھے۔ اس طرح ان لوگوں نے یہ بھی تسلیم کیا تھا

کہ سوار فوج کے گھوڑوں کے لیے چارہ وغیرہ مہیا کریں گے۔ لیکن جب کبھی موقع آتا تو پھر تعمیلِ حکم میں حیل وحجت بھی کرتے۔ سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ میرے لیے یہ تھا کہ سوات کے آزاد قبائلی لوگ جو ہر پابندی اور ہر ضابطے سے آزاد تھے۔ اور جن کی زندگی ایک وحشیانہ قسم کی زندگی تھی۔ ان لوگوں کو کس طرح ضابطہ اور قانون کی پابندی کرنے کا خوگر بنایا جائے۔ اپر سوات کا علاقہ تو ایک ایسا علاقہ تھا کہ جس نے سوات کے اندر ہی ایک علاقۂ غیر کی صورت اختیار کی تھی۔ اس علاقے میں تو دو چار جابر قسم کے خوانین بری طرح سے حاوی ہو چکے تھے۔ میرے عملے میں کوئی بھی ایسا افسر یا کارندہ نہیں تھا کہ وہ اپر سوات میں جا کر کام کر سکے اور یا کسی حکم کی تعمیل کروا سکے۔ لہٰذا یہ حالت تھی کہ صدر مقام سیدو شریف میں تو میرے عمال کام کرتے تھے اور میں خود اکثر ہی اپر سوات کے علاقے میں مصروف کار رہتا تھا۔ اس طریقے سے کہ دو دن ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کے فیصلے وغیرہ کرتا تھا۔ تو پھر دو دن دوسرے گاؤں میں اس طرح سارے مواضعات میں دو دو دن کیمپ لگاتا تھا۔ حکومت کا کاروبار چلانا تو ایک طرف حالت یہ تھی کہ اس علاقے میں جو میری ذاتی جائیداد تھی اس پر بھی یہ خوانین صاحبان غاصبانہ رنگ میں قابض تھے۔ اور ہماری یہ طاقت کہاں تھی کہ اپنی جائیداد کو اپنا کہہ سکیں۔ اب اسی سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ جب ہماری یہ حالت تھی تو پھر دوسرے لوگ یعنی عوام کی کیا حالت ہوگی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ ملک خدا کا قبضہ خان صاحب کا، تمام لوگوں کی زندگی خوانین کے رحم وکرم پہ منحصر تھی۔ اور اگر کسی غریب شخص کی منکوحہ عورت حسین ہوتی، تو کوئی بھی خان یا طاقتور شخص اگر چاہتا تو اس سے جبراً چھین لیتا۔ اس پر سوات کے علاقے میں خوانین کی تنظیم کچھ اس طرح تھی کہ ایک ہی جابر اور قاہر قسم کے خان اعظم کی سرکردگی اور اس کی ماتحتی اور رضامندی حاصل کرنے کے بعد مختلف علاقوں میں چھوٹے خوانین خان ازم کے اس استبدادی طریق کار کو اپنائے ہوئے تھے۔ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں۔ کہ مذکورہ علاقے میں میری ذاتی جائیداد تھی۔ لیکن میں اپنے دہقان کو لکڑی جلانے کے لیے لانے کو نہیں

کہہ سکتا تھا۔ اس وقت جبکہ سوات میں عبدالجبار شاہ برائے نام حکمران تھا۔ ہم علاقہ ادین زئی یعنی دلبار میں جلاوطنی کے دن بسر کر رہے تھے، تو اپر سوات کے ایک جابر قسم کے خان نے اپر سوات کے ایک گاؤں میں میری ملکیت ایک محلے پر قبضہ کیا تھا۔ مکانات اور جائداد پر قبضہ کرنا تو درکنار وہاں جو شخص میرا ناظر یعنی ناظم جائداد تھا اس کی منکوحہ عورت کو بھی ظالم نے جبراً اپنی داشتہ بننے پر مجبور کیا۔ میرا ناظر تو بیچارہ اسی شرم اور غصے کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔ جہاں سے وہ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ جب ہم جلاوطنی کی زندگی گزار کر واپس گئے اور پھر جب میں نے اپنی حکومت بھی بنائی، تین سال تک تو اس غاصب خان سے باوجود حکمران ہونے کے اپنی زمین وغیرہ واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکا، حتیٰ کہ حکمران بننے کے بعد جب میں نے سوات میں مستقل تقسیم اراضی کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا تب کہیں جا کر مجھے بھی اپنی زمین کو اپنی کہنے اور اپنی ملکیت تصور کرنے کے حقوق حاصل ہو گئے۔ اس منصوبے کی بدولت سینکڑوں کو اپنا حق مل گیا۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ حالت تھی کہ کسی کمزور فرد کو جب بھی کسی طاقتور خان کے جی میں آتا جائداد سے بیدخل کر دیتا۔ کوئی عدالت یا حکومت تو یہاں نہیں تھی کہ جس میں کوئی جا کر داد خواہی کے لیے فریاد کرتا۔ بس یہاں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ چل رہا تھا۔

جرائم کے سلسلے میں مجرموں سے جرمانے کی وصولی

میں کہہ چکا ہوں کہ یہ لوگ کسی ضابطے کی پابندی برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے حکومت بننے کے بعد جب عدالت کی طرف سے کسی مجرم کو جرمانے کی سزا دی جاتی، تو جرمانے کی رقم وصول کرنے کا مسئلہ ایک دردِ سر بن جاتا۔ جب کسی گاؤں میں کسی مجرم سے جرمانے کی رقم وصول کرنے کے لیے سرکاری ملازم ہم بھیج دیتے تو بجائے اس کے کہ اس مجرم سے وصولی جرم کے سلسلے میں اس علاقے کا خان یا ملک ملازم حکومت کے ساتھ تعاون

کرے، یوں ہو جاتا کہ مذکورہ علاقے کا خان پچاس یا چالیس معززین کا ایک وفد ساتھ لے کر بطور جرگہ مجرم کی سفارش کے لیے سیدو پہنچ جاتا - اور پھر سیدو شریف میں خان مذکور معہ افراد جرگہ دو چار وقت میرے مہمان بن کر مقیم ہو جاتے - اس طرح بجائے مجرم کے خان صاحب مجھ سے جرمانہ وصول کر لیتے - چالیس پچاس افراد کا دو چار وقت مہمان بن کر رہنا اگر جرمانہ نہیں ہے تو اور کیا ہے - اور اس زمانے میں یہ مہمانی بھی ضروری تھی - اس لیے کہ آمد و رفت کے ذرائع مثلاً موٹر لاریاں یا سڑکیں نہیں تھیں - لہٰذا مجبوری تھی - تو یہ تھی اس ابتدائی زمانے میں خوانین کی ذہنیت - اب اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ ان لوگوں کو پابندیٔ ضابطہ کے لیے تیار کرنے میں ہمیں کن کن مشکلات سے دو چار ہونا پڑا تھا -

رقم جرمانہ کی وصولی کے طریقے

کچھ عرصہ تو یہ حالت رہی - لیکن میں نے سوچا کہ حکومت کا کاروبار یوں نہیں چلے گا - ان لوگوں کو قانون اور ضابطے کا احترام کرنا تو سکھانا ضروری ہے - لہٰذا جرمانے کی رقم وصول کرنے کے لیے میں نے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ جس علاقے میں کسی مجرم کو جرمانے کی سزا مل جاتی تو اس علاقے کے خان یا ملک سے میں کہہ دیتا کہ مجرم سے جرمانے کی رقم وصول کر کے تم خود لے لو - سرکاری خزانے میں بھی داخل نہ کرو - جب یہ طریقہ جاری ہو گیا تب تو خوانین صاحبان جرمانے کی رقم وصول کرنے کے سلسلے میں ایسے مدعی بن جاتے کہ گویا رقم انہی کی ہے - اور مجرم کو گویا بطور قرض دی تھی - اس طریقے سے جب وصولی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور کچھ عرصہ گزر گیا تو میں نے جرمانے کی رقم نصف کر دی - یعنی نصف رقم تو خزانے میں داخل کرنے کا حکم جاری کیا اور نصف رقم علاقے کے خان یا ملک کو دی جاتی اور اگر کسی علاقے میں دو خان یا ملک ہوتے تو پھر جرمانے کی رقم تین حصوں میں تقسیم ہو جاتی تہائی رقم تو خزانے میں داخل ہو جاتی اور بقایا دو حصے مساوی ان دو خانوں میں تقسیم ہو جاتی

جب اس طریقے پر بھی کچھ عرصہ گزر گیا تو میں نے اس سلسلے کو کچھ اور بڑھایا۔ اس طریقے سے کہ اب دو تہائی حصہ رقم تو داخل خزانہ کی جاتی تھی اور تہائی حصہ خان یا ملک کو دیا جاتا میں نے بحیثیت حکمران ریاست کے علاقوں میں خوانین اور ملکوں کو یہ ذہن نشین کرایا۔ کہ ضابطے کی پابندی ہر حالت میں ضروری ہے۔ غرضیکہ استحکام حکومت کی راہ میں لڑائیوں کے علاوہ دوسری بھی ہزاروں مشکلات حائل تھیں۔ لیکن خدا کی مہربانی شامل حال تھی۔ کہ میں ان سب سے نبٹتا رہا۔ وہ بھی تنہا۔

جن دنوں میرا بھائی زندہ تھا اس قسم کے نامساعد حالات اور ان لوگوں کی ذہنیت دیکھ کر تو وہ بگڑ جاتا۔ اور پھر مجھ سے کہتا کہ اس قسم کی حکومت آخر کس کام کی۔ اس کو تو چھوڑنا ہی بہتر ہے۔ خواہ مخواہ اپنی آسودگی اور فراغت ہم نے ان لوگوں کے لیے قربان کر دی۔ اور انہیں تو احساس ہی نہیں ہے۔ اس طرح میرے وزیر وغیرہ بھی یہی کہا کرتے تھے۔ کہ یہ لوگ کبھی راہ راست پر نہیں آئیں گے۔ لیکن میں انہیں ٹھنڈے دل سے سمجھاتا رہا۔ کہ ہمیں صبر اور حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔ ہماری جدوجہد مخلصانہ ہے۔ یہ ضائع نہیں ہوگی۔ پھر انہیں میں یہ مثال پیش کرتا کہ حکومت کی مثال تو نوزائیدہ بچے کی ہے۔ آپ نہیں دیکھتے کہ نوزائیدہ بچے کی پرورش میں اس کے والدین کو کتنی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ آخر کار وہی بچہ جوان ہو کر والدین کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن جاتا ہے۔ ہماری حکومت بھی ایسی ہے جب یہ مضبوط ہو جائے گی تو یہ مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ اس طریقے سے میں اپنے کارندوں، اور دوسروں کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ اور خود کام میں لگا رہا۔ اور اس گاڑی کو آگے کھینچتا رہا۔ اور انتظامات کرتا جاتا تھا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ماحول میں اس زمانے میں دوسرا کوئی اس قسم کا ذہین اور مدبر انسان نہیں تھا کہ جو حکمرانی کے پیچیدہ معاملات سنتا یا کوئی معقول رائے وقتاً فوقتاً دیتا۔ اس ضمن میں اپنی ذمہ داریوں سے آپ نبٹتا رہا اور پیچیدہ مسائل کا حل بھی خود ہی ڈھونڈتا رہا۔

ایک واقعہ، ایک حکایت

حکومت سے پیشتر اور پھر حکومت کے ابتدائی دنوں میں سوات میں غریب لوگ خوانین سے کس قدر سہمے ہوئے تھے اس کے متعلق ایک واقعہ بیان کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حکومت کے ابتدائی ایام میں میں اپر سوات کے قلعۂ نل میں مقیم تھا۔ ایک ملازم نے رپورٹ کی کہ ایک شخص ملنے آیا ہے۔ میں نے اجازت دے دی کہ اسے اندر بھیج دو۔ جب وہ شخص اندر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے پاس ایک گٹھڑی جیسی ہے جسے بغل میں دبائے ہوئے وہ شخص سہما ہوا اور ہراساں ادھر ادھر دیکھتا ہوا بیچارہ میری طرف بڑھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں کچھ متحیر ہو گیا۔ جب وہ میرے قریب آیا تو اس نے وہ گٹھڑی کھولی۔ جس میں سے کچھ سیب نکلے وہ شخص میرا اپنا ہی دہقان تھا۔ اور میری ہی اراضیات کے سیب کے درختوں سے وہ سیب توڑ کر میرے لیے لایا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آخر تم اس قدر گھبرائے ہوئے، اور ہراساں کیوں ہو؟ اس نے جواباً کہا کہ میں ڈرتا ہوں کہ خان یا اس کا کوئی آدمی نہ دیکھ لے۔ میں ہنس پڑا اور اسے کہا کہ جب تمہیں اس قدر خطرہ ہے تو پھر سیب لانے کی کیا ضرورت تھی اب یہ حالت تھی اس وقت کہ کوئی دہقان خان سے پوچھے بغیر اپنے مالک کو اس کی ملکیت کی پیداوار میں سے کوئی چیز تحفۃً بھی پیش کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

ایک دوسرا واقعہ، انسانی زندگی کی اہمیت

ایک دفعہ پھر میں اسی مذکورہ نل قلعے میں مقیم تھا۔ اتفاقاً ضرورت پڑ گئی۔ میں نے اپنے ایک ملازم کو سمبٹ چم سے اسپغول لانے کے لیے بھیج دیا۔ ابھی مذکورہ ملازم قلعے سے نکل کر ایک فرلانگ تک گیا تھا کہ اس علاقے کے خان کے نوکر نے اس پر فائر کر دیا لیکن میرا ملازم گولی لگنے سے بچ گیا۔ لہٰذا اس نے بھی فائر کنندہ پر جوابی فائر کر دیا۔ لیکن اس کا نشانہ

بھی خطا ہوگیا۔ خان کا نوکر بھی بچ گیا۔ قلعہ سے سپاہی موقع پر جانے کے لیے تیار ہوئے تو میں نے منع کیا۔ کہ مت جاؤ۔ دونوں ایک دوسرے پر فائر کر چکے ہیں۔ خوش قسمتی سے دونوں بچ گئے ہیں۔ اب اگر تم لوگ جاؤ گے تو خواہ مخواہ بات بڑھ جائے گی۔ لہٰذا جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے روز میں نے اس خان سے جس کے ملازم نے یہ نامناسب حرکت کی تھی گلہ کیا کہ خان صاحب آپ کے نوکر نے بغیر کسی سبب اور معقول وجہ کے سرکاری ملازم پر فائر کر کے اقدامِ قتل کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ اس نے سراسر زیادتی کی ہے اور اچھا کام نہیں کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ خان مذکور کچھ اظہارِ تاسف کرتے، بات کو باتوں میں ٹال گئے، یوں کہ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔ عام لوگ جاہل اور ان پڑھ تھے۔ حتیٰ کہ سرکردہ قسم کے معززین کی یہ حالت تھی کہ آدابِ مجلس اور طریق گفتگو سے بالکل نابلد تھے۔ جب کسی مقدمے یا متنازعہ فیہ معاملے کا فیصلہ ہوتا تو جانبین میں سے اکثر ایسی باتیں مجھے سننی پڑتیں کہ قطعاً ناقابلِ برداشت ہوتی تھیں۔ لیکن میں صبر کرتا رہا۔ اور حوصلے سے کام لیتا رہا۔ اس سرکش اور غیر مہذب ماحول میں اور نامساعد حالات میں اگر میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوا ہوں تو اس کے وجوہات یہ تھے۔ کہ ایک تو خدا کی مہربانی شاملِ حال تھی، میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہوا ہے بس اتنا کہ منشائے قدرت کی تکمیل میرے ہاتھوں ہوئی ہے دوئم یہ کہ میں نے انتہائی صبر سے کام لیا ہے۔ نہایت ٹھنڈے دل اور حوصلے سے اپنے پروگرام پر عمل کرتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت حالات ہی ایسے تھے۔ کہ صبر اور حوصلے سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ غصے اور جلد بازی سے اگر کام لیا جاتا تو نتائج کچھ خوشگوار نہ ہوتے ۱۹۱۵ء سے پہلے اور بعد کے چند سال تک تو سوات کی حالت عرب کے دورِ جاہلیت سے کچھ مشابہ تھی۔ اگرچہ حالات صبر آزما اور کٹھن تھے لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی کبھی مایوس ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ بتدریج سوات کو ایک مستحکم اور پُرامن ریاست کی شکل دینے میں بفضلِ خدا ہم کامیاب ہوگئے۔ اور یہ تو پہلے کہہ چکا ہوں کہ پٹھان خوانین

اور طاقتور افراد کی ذہنیت کچھ ایسی جابرانہ تھی کہ ان کے خیال میں گویا عام لوگ تو انسان ہی نہیں تھے اور نہ ہی بقول اُن کے عام لوگوں کو خدا کی زمین پہ جینے کا حق تھا۔ ان کی مشقت، ان کی محنت، ان کی شب و روز کی تگ و دو اور تمام جد و جہد گویا ان خوانین کے لیے ہوتی تھی۔ خوانین کو یہ کھلی آزادی تھی کہ جب بھی ان کا دل چاہے تو کسی غریب انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیں۔ وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے کہ جب بھی ان کے بوالہوسانہ جذبات بیدار ہوں تو کسی عورت کی عصمت لوٹ کر کسی مظلوم کی عزت اور غیرت کا مذاق اڑائیں۔ اور یا جب بھی ان کے جی میں آئے کسی کی جائداد پہ بالجبر قابض ہو جائیں یا کسی کے مال و دولت کو لوٹیں پٹھان ایک شجاع اور غیور قوم ہے لیکن کسی تنظیم کے نہ ہونے اور باقی دنیا سے کٹ کر علیحدہ ایک محصور پہاڑی ماحول میں رہنے کی وجہ سے اور پھر خود سرانہ زندگی کے باعث وادئ سوات میں پٹھانوں کے شجاعانہ اوصاف نے اپنی مقررہ حدود سے آگے بڑھ کر وحشت، بربریت اور سفاکیت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ طاقتور اور جابر افراد تو یہ سمجھتے تھے کہ حکومت اگر بن بھی جائے تو کوئی بات نہیں، حکمران ہمارا تابع رہے گا اور ہم ہمیشہ من مانی کرتے رہیں گے۔ یہ لوگ خود کو ہر پابندی سے بالاتر اور ہر قانون سے مستثنیٰ سمجھے ہوئے تھے۔

لیکن قدرت کو عام لوگوں یعنی اکثریت کی بھلائی منظور تھی۔ لہٰذا میری حکومت کامیاب ہو گئی۔ استحکام حکومت سے پہلے نہ صرف یہ کہ سوات کی زرعی حالت خراب تھی یہاں کے تجارتی حالات بھی ناگفتہ بہ تھے۔ یہاں کے تجارت پیشہ لوگوں سے خوانین اور پٹھان جبراً روپیہ چھین لیتے تھے۔ ان لوگوں کو زبردستی اپنے لیے دعوتوں کا اہتمام کرنے پہ مجبور کرتے تھے۔ دعوت اڑاتے وقت صاحب خانہ کے اساس البیت میں سے کوئی چیز مثلاً قالین یا کراکری پسند آجاتی تو وہ بھی اپنے ساتھ یہ کہہ کر اٹھا لے جاتے کہ سیٹھ صاحب تو اکثر پشاور جاتے ہیں اور لے آئینگے لہٰذا ان حالات میں تجارتی فروغ کے کیا امکانات ہو سکتے تھے۔ وطن کی خاک ہر انسان کو کچھ ایسی عزیز ہوتی ہے کہ ہزار مظالم سہتا ہے اور اس امید پر زندگی بسر کرتا ہے کہ کبھی تو حالات

بہتر ہو جائیں گے۔ دوئم یہ کہ جابر خوانین اور پٹھانوں میں برائیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ زراعت کی حالت بھی اس لیے خراب تھی کہ دہقان یعنی کاشتکار طبقے کے لوگ خوانین کی ظالمانہ بیگاروں اور ناجائز ٹیکسوں اور نذرانوں سے اس قدر عاجز آچکے تھے کہ زراعت کے ساتھ ان کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ جب یہ امید بھی نہ ہو کہ انسان اپنی محنت اور مشقت سے خود بھی کچھ فائدہ حاصل کرے گا۔ تو وہ محنت اور مشقت آخر کس عہد سے پر کرے خود سوات کے لوگوں کے لیے جو کمزور تھے زندگی ایک دردناک عذاب بن چکی تھی۔ ہاں ہم اس ماحول کے پٹھانوں میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جنہیں اپنی پستی کا احساس تھا۔ اور یہ چاہتے تھے کہ حالات کی اصلاح ہو جائے۔ طاقتور اور جابر خوانین اگرچہ کسی اخلاقی یا قانونی پابندی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن حکومت تسلیم کرتے یا حکومت بنانے کے لیے اس لیے آمادہ ہوئے کہ ان کی شکارگاہ میں ایک اور ان سے صد گونہ طاقتور اور جابر شکاری گھس آیا تھا۔ یہ لوگ نواب دیر کے ہاتھوں تنگ آچکے تھے۔ اس ماحول کے اکثر پٹھانوں کو دوسری ریاست کے نواب کی غلامی بھی قطعاً گوارا نہ تھی۔ لیکن ان کا یہ بھی خیال تھا کہ حکمران سوات کا بس یہی کام ہوگا کہ سوات کو نواب صاحب سے بچائے گا۔ اور لڑائی میں ان لوگوں کی رہنمائی کرے گا۔ اندرونی معاملات میں گویا حکمران ان کے صلاح و مشورے کا پابند رہے گا۔ ان کے جابرانہ اور ظالمانہ کردار سے حکمران کو کوئی واسطہ ہی نہیں ہوگا لیکن میں نے ارادہ کیا ہوا تھا کہ میں حکومت ایسی بناؤں گا کہ جس میں عوام الناس کا فائدہ ہو۔ میں ان لوگوں کا بھی خواہ تھا۔ بحیثیت ایک افغان مسلمان کے میں نہیں چاہتا تھا کہ میری قوم کی اخلاقی حالت ایسی ہو۔ کہ وہ بجائے شجاع اور غیور کے سفاک اور ظالم کہلائیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے اور یا ذاتی مفاد اور اقتدار کے نشے میں کچھ ایسے سرشار ہیں کہ انہیں اپنے قومی کردار اور ناموس کی بدنامی اور ملتِ اسلامیہ کے ساتھ وابستگی کا احساس ہی نہیں ہے۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ حکومت ایسی ہونی چاہیئے کہ مظلوم کو ظالم کے مظالم سے آزاد کرائے اور

اس خطۂ ارضی میں بسنے والوں کی اخلاقی حالت سدھر جائے۔ اکثریت کو فائدہ پہنچے، انسان دوسرے انسان کو جبراً اپنی بندگی کے لیے مجبور نہ کرے۔ اور یہاں کے لوگ زندگی کے بلند مقاصد سے واقف ہو جائیں۔ میں نے مضبوطی کے ساتھ یہ ارادہ کیا تھا کہ دشتِ ظلمات میں ان بھٹکنے والوں کو میں زندگی کے روشن اور پُر نور راستوں پر پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ لہٰذا میں مصروفِ کار رہا۔ جو کچھ بھی لوگ کہتے رہے میں نے اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ خدا کا فضل و کرم ساتھ تھا کہ ہم نے بہت جلد کامیابی حاصل کی۔

ایک مثال

اب یہاں پر میں ایک مثال پیش کروں گا۔ بایں ہمہ کہ سوات کے لوگ حنفی مذہب تھے سنّی مسلمان تھے لیکن حکومت بننے سے پہلے یہ حالت تھی کہ علاقہ سوات کی ساری مسجدیں خوانین کے غلّے کے گودام بنے ہوئے تھے۔ فصل کے وقت جب غلّہ خچروں اور گدھوں پر لاتے تو ان خچروں اور گدھوں کو بارسمیت مسجد کے صحن میں یا دالان کے اندر لے جا کر ان سے بار اتارتے تھے۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ مسجد جو خدا کا گھر کہلاتا ہے اور عبادتِ الٰہی کے لیے مخصوص ہوتا ہے، ایک مسلمان پر مسجد کا احترام فرض ہے۔ اب اندازہ لگائیے کہ جس خطۂ زمین کے مسلمان مسجدوں کے احترام سے اس قدر غافل اور بے پرواہ ہوں، نہ صرف غافل اور بے پرواہ بلکہ ان کی بے حرمتی بھی کرتے ہوں تو پھر ان مسلمانوں کی اخلاقی حالت کیا ہو گی؟

ایک لطیفہ

غالباً اسی ہی زمانے کا وہ واقعہ ہو گا۔ کہ کسی علاقے کے ایک گاؤں کی مسجد غلّے سے خالی تھی۔ مسجد کا امام بھی تھا، لیکن نمازی کم تھے۔ ایک گدھا تھا جو کہ ہر وقت مسجد میں داخل ہوتا

تھا۔ اور صحن میں لید کرتا تھا۔ ملّا صاحب اس گدھے سے تنگ آ گئے تو ایک دن گدھے کے مالک کے پاس جا کر شکایت کی کہ آپ کا گدھا ہر وقت مسجد میں آ کر لید کر جاتا ہے۔ مہربانی ہوگی، کہ اپنے گدھے کی نگہداشت کیا کریں۔ گدھے کے مالک نے ہنس کر کہا کہ ملّا صاحب! اب گدھا تو گدھا ہے بیچارہ، جانوروں میں کم عقل اور جاہل جانور ہے، لہٰذا بیوقوف خر سے کیا گلہ۔ آپ مجھے دیکھیں کہ کبھی آپ کی مسجد کے قریب سے بھی نہیں گزرا ہوں۔ مسجد میں داخل ہونا تو کجا۔

مولانا صاحب یہ سن کر خاموش ہی ہو گئے۔ کہ جب یہ حالت ہے تو کسی سے کیا شکوہ۔ غرضیکہ سوات میں باوجود سنّی مسلمان ہونے کے ان لوگوں کی یہ حالت تھی کہ مسجد کے احترام سے ہی واقف نہیں تھے۔ علم کا تو نام و نشان ہی نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ لوگ علم کی طرف توجہ کرتے تھے۔ اور نہ انہیں تحصیلِ علم کی ضرورت کا احساس تھا۔

خوانین کی ذہنیت کے متعلق ایک اور مثال

میں بتا چکا ہوں کہ حکومت کے ابتدائی سالوں میں میں اکثر اپر سوات میں ہی رہا کرتا تھا اس لیے کہ اپر سوات کا علاقہ ہی زیادہ توجہ طلب تھا۔ ایک دن میں اپر سوات کے قلعہ نیل میں ہی بیٹھا ہوا تھا، میرے ساتھ مجلس میں اس علاقے کا خان بھی بیٹھا تھا۔ دوران گفتگو میں اتفاقاً کوئی ایسی بات پیش آئی۔ کہ میں نے اپنے ملازم المشہور جمیل ملّا کے حق میں کچھ تعریفی جملے استعمال کیے کہ جمیل ملّا اچھا آدمی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خان صاحب دوسروں کو اچھا کہنے پر خفا ہوتے ہیں۔ میری زبانی جمیل ملّا کی تعریف سن کر تو خان صاحب آگ بگولا ہو گئے پہلے تو طنزیہ رنگ میں میرے الفاظ دہرائے "جمیل ملا اچھا آدمی ہے۔" اس کے بعد میرے روبرو ہی فحش گالیاں اور مغلظات بکنا شروع کیے۔ بیچارے جمیل ملّا کے حق میں کافی دیر تک خان مذکور گالیاں بکتے رہے۔ اور میں چپ چاپ خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ اور دل میں یہ سوچتا رہا کہ خداوندا یہ کیسے لوگ ہیں۔ اور ان کی ذہنیت کیسی ہے کہ یہ دوسرے

غریب انسان کی برائے نام تعریف بھی نہیں سُن سکتے۔ یہ دوسروں کو انسان بھی نہیں سمجھتے عجیب و غریب لوگ ہیں اور بڑے فخر سے پھر خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں۔ خان صاحب مغلظات کا ایک طویل قصیدہ سُنا کر چُپ ہو گئے۔ میرے سامنے میرے ایک ملازم کو بغیر کسی معقول وجہ کے گالیاں دینا انتہائی بدتہذیبی اور اخلاقی رذالت کا ایک مظاہرہ تھا۔ لیکن میں نے صبر سے کام لیا۔ میں نے سوچا کہ اس موقع پر اگر خان کے منہ پر ایک تھپڑ مار دوں تو نتیجہ یہی ہوگا کہ رات کو جرگہ لے کر خان صاحب کو منانے جاؤں گا۔ لہٰذا اس سے یہ بہتر ہے کہ اب صبر سے کام لوں۔ دراصل خان کو اپنی طاقت اور دولت پر اس قدر بے جا غرور اور گھمنڈ تھا۔ حالانکہ بدزبانی اور فحش کلامی تو افغانی تہذیب اور اوصاف کا بھی تقاضا نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو افغانی تہذیب کی توہین تھی، لیکن مجبوری تھی۔ حکومت کے ابتدائی ایام تھے۔ وقت کی نزاکت اور سیاست کے تقاضے یہی تھے۔ کہ کسی طاقتور خان کو ناراض نہ کیا جائے لہٰذا میں یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا۔

فوجی ڈسپلن اور ضابطہ

ان دنوں میں اگرچہ فوجی تنظیم ہو چکی تھی۔ دوسرے علاقوں بالخصوص دریا کے اس طرف جنوبی علاقوں کے لوگ نسبتاً اچھے تھے لیکن اپر سوات کے لوگ نہ تو قانون کا احترام کرتے تھے اور نہ ہی اس علاقے کے فوجی ملازم فوجی ڈسپلن اور ضابطے کی پابندی کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ علاقے شموزئی میں نواب صاحب کے ایک قلعے پر لشکر کشی مقصود تھی۔ میں خود اپر سوات میں موجود تھا۔ میں نے اس علاقے کے تمام فوجیوں کو بلا کر انہیں بذاتِ خود یہ حکم سنایا کہ تم لوگوں کو کل صرف ایک دن کی مہلت دی جاتی ہے، تیار ہو کر لو اور پرسوں یعنی دوسرے روز روانہ ہو کر شموزئی کے علاقے میں محاذِ جنگ پر پہنچ جاؤ۔ مذکورہ لشکریوں کو یہ احکام اور ہدایات سنا کر میں گھر آیا۔ اب یار لوگ کیا کرتے ہیں کہ بجائے ایک دن کے قصداً

دو دن گھر دل میں پڑے رہے۔ دو دن گزر گئے تو تیسرے روز اپرسوات کے لاڈلے محاذِ جنگ پر جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ لیکن اب یہ معمولی فاصلہ یعنی اپرسوات سے شموزئی کا فاصلہ جو کہ فوجی رفتار کے مطابق زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں کی مسافت کا راستہ ہے، یار لوگ کس طریقے سے طے کرتے ہیں، سُنیے۔

اپرسوات سے جب یہ لشکری روانہ ہوئے تو قریب ہی نیک پی خیل کے مواضعات ننگولی اور بانڈی میں مقیم ہو گئے۔ صرف چند میل ہی آ کر مذکورہ مواضعات میں یاروں نے رات گزاری اور مہمانی کا لطف حاصل کیا۔ دوسروں پر مہمان بن کر ہی پکائی تیار کھانے میں بھی تو ایک مزہ ہوتا ہے۔ دوسرے روز مذکورہ مواضعات سے جو روانہ ہوئے تو خدا خدا کر کے دن کے ایک بجے کانجو پہنچ گئے۔ اور کانجو میں ہی اب دوسری رات گزارنے کے ارادے ظاہر کیے۔ اس وقت یہ دستور تھا کہ جب لشکری محاذِ جنگ پر جاتے تھے تو کھانے کے وقت جس گاؤں میں پہنچ جاتے اس گاؤں والے ان کو کھانا کھلاتے رہتے۔ لیکن اپرسوات کے مذکورہ لشکر نے عین ظہر کے وقت جب کانجو میں شب باش ہونے کے ارادے ظاہر کیے تو کانجو کے لوگوں نے انہیں صاف جواب دیا کہ بھئی تم لوگوں کے پاس کافی وقت ہے۔ اور شام ہونے سے پہلے بخوبی تم لوگ شموزئی پہنچ سکتے ہو۔ لہٰذا ہم تمہیں کانجو میں رات گزارنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہمیں بیجا تنگ مت کرو۔

لشکر والوں نے جب یہ ٹکا سا جواب سنا تو ان کی بھی رگِ فرعونیت پھڑک اٹھی اور فرمانے لگے کہ اب تو ہم جبراً کانجو میں رات گزاریں گے۔ اور کانجو کے لوگ ہمارے قیام و طعام کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی لشکریوں نے کانجو کے اردگرد باغات کو بھی تاراج کرنا شروع کر دیا۔ اب کانجو کے لوگ مجبور ہوئے کہ مسلح ہو کر طاقت سے ان لشکریوں کو کانجو کی حدود سے نکال دیں۔ چنانچہ کانجو کے لوگوں نے پہلے تو لشکریوں سے کہا کہ تم لوگ گاؤں کی حدود سے نکل جاؤ۔ انہوں نے نہیں مانا تو لڑائی شروع ہوئی۔ اب

سیدو شریف میں ایک پہاڑی پر بیٹھ کر میں دوربین سے یہ سب حالات دیکھ رہا ہوں۔ لہٰذا میں نے کئی آدمی دوڑا کر لشکریوں کے پاس بھیجے اور انہیں یہ حکم دیا کہ تم لوگ شموزئی چلے جاؤ، لیکن ان کی طرف سے یہ جواب ملا کہ اب تو ہم تب شموزئی جائیں گے کہ کانجو کے لوگوں کے ساتھ ہمارا فیصلہ ہو جائے۔ بہرصورت کانجو کے لوگوں نے لشکر والوں کو گاؤں کی حدود سے نکال دیا۔ اس معرکے میں کچھ لوگ زخمی بھی ہو گئے۔ کانجو کی حدود سے باہر آ کر اپر سوات کا لشکر دو حصے ہو گیا۔ ایک حصے کے لشکری تو واپس اپنے گھروں کو اپر سوات چلے گئے اور دوسرے حصے کے لشکریوں نے کہا کہ ہم تو محاذِ جنگ پر جاتے ہیں۔ لیکن نیک پی خیل کے علاقے پر سے گزر کر تو ہرگز نہیں جائیں گے۔ ان لوگوں نے ہماری بے عزتی کی ہے لہٰذا یہ لوگ دریائے سوات کو پار کر کے اس طرف چلے آئے۔ نوآں کلی اور آہنگر ڈھیری میں رات گزار کر دوسرے روز محاذِ جنگ پر جانے کے لیے پھر روانہ ہوئے۔ چار پانچ میل ہی چل کر یاروں نے ہوڈی گرام میں کیمپ لگایا۔ اور وہیں رات گزار دی۔ اس دوران میں شموزئی میں ہم نے وہ قلعہ ہی فتح کر لیا کہ جس پر لڑنے کے لیے یہ جا رہے تھے۔ لہٰذا اپر سوات کے یہ لشکری محاذِ جنگ پر پہنچے بغیر ہی واپس ہوئے۔ اور پھر واپسی پر شہر مینگورہ کے بازار کو لوٹ کر اپر سوات چلے گئے۔ فوجی ڈسپلن اور ضابطے کی پابندی تو درکنار انہیں تو اپنی قومی روایات کا بھی کچھ احساس نہیں تھا۔ پٹھانوں کا یہ طریقہ ہے کہ حتی الوسع دوسروں پر مہمان بننے سے گریز کرتے ہیں۔ مگر یہاں تو یہ لوگ اپنے ہی بھائیوں کو جبراً میزبانی پر مجبور کرتے تھے اور پھر لوٹتے تھے۔ اس قسم کی مثالیں بیان کرنے سے مطلب یہی ہے کہ اندازہ لگانے میں آسانی ہو کہ ہمارے لیے حکومت کے ابتدائی ایام میں کس قدر مشکلات حائل تھیں۔ اس قسم کے لشکریوں کو لڑانا اور ان میں جذبۂ اطاعت پیدا کرنا اور اس قسم کے شہریوں کو پابندیٔ قوانین کے لیے تیار کرانا یہ سب کس قدر مشکل اور کٹھن امور تھے۔ جس سے مجھے تنہا ہی نبٹنا پڑا۔ اس قسم کے حالات کے باوجود میں بددل یا مایوس کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ اصلاح کی کوشش تیز کرتا رہا۔

اور اس طریقے سے ریاست سوات کی حکومت کی یہ گاڑی منزل کامیابی کی طرف پورے زور سے اکیلے ہی کھینچتا ہوا میں آگے بڑھتا گیا۔ اس بھاری وزن دار اور جا بجا اٹکنے والی گاڑی کے لیے، یقیناً زیادہ قوت درکار تھی جو کہ بفضلِ خدا مجھ میں پیدا ہوتی گئی۔ ہر چند کہ سڑک شکستہ اور ناہموار تھی لیکن خدائی فضل و کرم شامل حال تھی۔ لہٰذا ہم آگے بڑھتے گئے

جاہلیت اور دیدہ دلیری کی ایک اور مثال

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ نواب دیر اور نواب امب اور عبدالجبار شاہ کے ساتھ ہماری دشمنی تھی، وہ لوگ وقتاً فوقتاً انتشار ڈالنے کے لیے اور یہاں کے حالات اور فوجی تیاریوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اپنے آدمی سوات بھیجتے تھے۔ جب کسی مخالف دشمن کا کوئی مخبر سوات میں کسی خان کے پاس آجاتا تو ان لوگوں کی ہوشیاری یا دیدہ دلیری دیکھیئے کہ جس خان یا ملک کے پاس دشمن کا مخبر آجاتا تو اس مخبر کو ساتھ لے کر میرے پاس آجاتے اور شریکِ مجلس ہو جاتے۔ گویا انہیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ دشمن ریاست کے مخبروں کے ساتھ تعلقات اور یا دشمن ریاستوں کے سربراہوں کے ساتھ نامہ و پیام، اپنی ریاست اور حکمران کے ساتھ صریح غداری ہے۔ چوری کے ساتھ ساتھ سینہ زوری غالباً اسی کو کہتے ہیں کہ پھر اسی مخبر کو ساتھ لے کر میرے پاس بھی آجاتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ سوات کا کوئی خان اپنا کوئی عزیز یا رشتہ دار نواب دیر یا نواب امب کے پاس بھیج دیتا۔ اور مجھے اطلاع مل جاتی۔ جب میں اس خان سے اس کے متعلق پوچھتا تو نہایت بیباکی سے یہ جواب دیتا کہ میں نے تو اپنا آدمی نواب صاحب کے پاس کوئی رائفل یا پستول لانے کے لیے بھیجا ہے۔ آپ خود تو ہمیں رائفل یا پستول دیتے نہیں۔ دوسروں سے نہ مانگیں تو کیا کریں اب میں ان کو کہاں سے روز روز نئی رائفلیں دیتا۔ جبکہ خود ہمارے پاس فوجی ضروریات کے لیے اسلحہ کی بڑی کمی تھی۔ لہٰذا مجبوراً اس پر بھی خاموشی اختیار کر لیتا۔

جو بھی ملے ہمیں دیا کرو، اللہ کے فقیر"

گذشتہ تمثیلات سے یہ بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ میرے لیے کس قدر مشکلات حائل تھیں۔ ابتدائی دنوں میں تو میں ان لوگوں کی عجیب و غریب ذہنیت سے اس قدر عاجز آ چکا تھا کہ اگر سوات سے باہر بیرونی علاقوں سے کوئی دوست یا معتقد میرے لیے تحفتہً کوئی چیز اچھی سی مثلاً کابلی چادر، کشمیری پٹو وغیرہ لے آتے، تو سوات کے خوانین یعنی ان مالدار فقیروں کے ڈر سے میں اس چیز کو استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر کبھی غلطی کر کے اس قسم کی چیز مثلاً کابلی چادر اوڑھ لیتا اور کوئی خان مجھے نئی چادر اوڑھے ہوئے دیکھ لیتا تو پھر وہ چادر میری نہ رہتی۔ خان صاحب فوراً ہی ڈھیٹ بن کر کہتے کہ "بادشاہ صاحب آپ کیا کرتے ہیں اسے، یہ چادر تو بہت خوبصورت ہے لہذا مجھے دے دو۔" اب وہ ایک چادر تحفتہً آئی ہوئی تو میں اس مانگنے والے کو دے دیتا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ دوسرے خوانین کو یہ پتہ چل جاتا کہ بادشاہ صاحب نے فلاں خان کو چادر دی ہے۔ پھر وہ بھی آکر مانگتے تھے کہ ہمیں بھی اسی قسم کی چادریں ملنی چاہئیں۔ نہیں تو ہم روٹھ جائیں گے۔ پھر مجبور ہو کر اسی نمونے کی چادریں قیمتاً خرید کر ان بگڑے دل رئیسوں میں بانٹ دیتا۔ نتیجہ یہی ہوتا کہ کسی دوست یا معتقد کا نذرانہ میرے حق میں جرمانے کی صورت اختیار کر لیتا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو وہ لوگ ناراض ہوتے تھے ان کو ناراض کرنا نہ دانشمندی کا تقاضا تھا اور نہ ہی اس وقت کے مخصوص سیاست کا۔ اب ان حالات میں میں مجبور تھا۔ کہ اس قسم کی چیزیں اگر کوئی لاتا بھی تو میں استعمال نہیں کرتا تھا، مجھے کسی چیز کے کسی کو دینے میں تو کوئی عار نہیں تھا۔ لیکن مشکل یہی تھا کہ پھر اس نمونے کی چیزیں قیمتاً پیدا کرنا بھی اکثر مشکل ہو جاتا۔ اس صورت میں اگر ایک خان یا ملک کو کوئی چیز دے دیتا اور دوسروں کے لیے پیدا نہ کرتا تو پھر ان کی ناراضگی مول لینی پڑتی۔ لہٰذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود پر جبر کروں اور کوئی چیز اس قسم کی استعمال

ہی نہ کروں۔

انہی ایام میں ایک دفعہ ایک شخص میرے لیے ایک بہت ہی خوبصورت کابلی پٹو لے آیا۔ میں نے سوچا کہ اب اس ماحول میں خود تو اس چادر کو میں اوڑھ نہیں سکتا، لہٰذا میں نے وہ چادر اپنی والدہ محترمہ کو دے دی۔ اتنے میں قریب کے ایک خان صاحب کو اطلاع مل گئی کہ کوئی شخص بادشاہ صاحب کو بہت ہی قیمتی چادر دے گیا ہے۔ بس خان صاحب نے فوراً اپنا خاص آدمی میرے پاس بھیجا اور اس کی زبانی یہ پیغام بھیجا کہ کابل سے آئے ہوئے اس پٹو کو میرے آدمی کے ہاتھ بھیج دیں۔ میں نے جواباً کہہ دیا کہ مجھے افسوس ہے کہ وہ چادر میری دسترس میں اب نہیں۔ وہ تو میں والدۂ بزرگوارہ کو دے چکا ہوں۔ اب خان صاحب کا اخلاقی ظرف دیکھیئے، دوبارہ پیغام بھیجا کہ والدۂ محترمہ سے واپس مانگ کر وہ چادر مجھے دے دیں۔ میں نے اسے کہا کہ تمہارا خان ناراض ہوتا ہے یا خوش ہوتا ہے لیکن ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ میں والدۂ محترمہ سے پھر چادر مانگ کر خان صاحب کو دے دوں۔ تو یہ تھی حکومت کے ابتدائی ایام میں سوات کے عمائدین اور خوانین کی ذہنیت اور اخلاقی معیار لیکن اس کے باوجود میری حالت وہی تھی جو ایک نوزائیدہ بچے کی پرورش کے وقت ایک شفیق اور غم خوار باپ کی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ لوگ جاہل ہیں، انہیں کوئی دوش نہیں۔ یہ آخر کار سمجھ جائیں گے اور مجھے ہی ان کو سمجھانا ہے۔ ان کے مستقبل کو سنوارنا اور نکھارنا ہے۔ اس لیے اس قسم کے واقعات کے باوجود کبھی میں بددل نہیں ہوا۔

ریاست میں آمد و رفت کے ذرائع

سڑکیں، شاہراہیں اور راستے

سوات کے متعلق یہ کہاوت مشہور تھی کہ سوات کا سب کچھ بے راہ اور بے طریقہ ہے۔ لیکن سوات کا پانی صرف راہ پر بہتا ہے۔ مطلب یہی تھا کہ سوات میں آمد و رفت کے لیے پگڈنڈیاں، راستے اور شاہراہیں بالکل نہیں تھیں۔ پانی کا دیالہ یا نہر جہاں بہتا تھا بس اسی دیالے یا نہر کا کنارا راستہ ہوتا تھا۔ اسی پر یہ لوگ چلتے جاتے تھے۔ صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ اپر سوات سے اگر کوئی شخص دوسرے مقام کے لیے روانہ ہوتا، تو اس طرح کہ اپنے گاؤں سے نکلتے ہی جوتے پاؤں سے نکال کر بغل میں دبا لیتا اور پھر دونوں پائنچے چڑھا کر کھیتوں کے درمیان بہتے ہوئے پانی میں سے گزرتا ہوا جاتا تھا۔ اور جہاں کوئی دیالہ یا نہر ہوتا تو بس اسی کے کنارے اس طریقے سے سفر کرتا جاتا تھا۔ کبھی دیالے کے ایک کنارے اور کبھی کود کر دوسرے کنارے چلتا تھا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جانیکا سفر بازیگری کا ایک نمونہ یا "لانگ جمپ" اور "ہائی جمپ" کی مشق ہوتا تھا۔ جو کہ یہ لوگ کرتے جاتے تھے۔ کوئی راستہ کوئی شاہراہ نہیں تھی۔ سوات میں جتنی شاہراہیں، سڑکیں، باربرداری کے راستے بنے ہوئے ہیں یہ سب میری حکومت بننے کے بعد بنے ہیں

قلعوں کی تعمیر، ملکی ڈیفنس کا استحکام

حکومت بنانے کے بعد اس ریاست کے دفاع کا استحکام ضروری تھا۔ اس غرض کے لیے

قلعہ جات تعمیر کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس وقت تو یہ حالت تھی کہ حکم دے کر ان لوگوں سے کوئی کام کرانا تو بہت مشکل تھا۔ یہ حکم ماننے کے لیے تو تیار ہی نہ تھے۔ لہٰذا میں نے کبھی ان پر یہ ظاہر ہونے ہی نہیں دیا کہ گویا میں حکمرانی کرتا ہوں۔ اور یا میری نیت حکومت کرنے کی ہے۔ بلکہ جب کبھی کسی علاقے میں کوئی قلعہ بنوانے کی ضرورت میں محسوس کرتا تو اس علاقے کے لوگوں کو جمع کر کے ان سے کہتا کہ بھئی میں تو حکومت یا حکمرانی کا شوقین نہیں ہوں۔ آپ لوگوں نے مجبور کر کے یہ ذمہ واری مجھے سونپی ہے۔ اب اگر آپ لوگ پشیمان ہیں تو میں اسے چھوڑ دوں گا پھر نواب صاحب کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کر لیں گے۔ نواب صاحب کا نام سن کر تو یہ لوگ فوراً بول اُٹھتے کہ ہم تو نواب صاحب کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ تب میں ان سے کہتا کہ جب آپ لوگ نواب صاحب کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرتے، تو پھر نواب صاحب کے مقابلے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم مضبوط ہو جائیں اور جا بجا قلعے تعمیر کریں۔ اب اس وقت اشد ضرورت ہے۔ کہ آپ کے علاقے میں فلاں مقام پر ایک مضبوط قلعہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے، تیار ہو جائے۔ تب وہ لوگ کہتے کہ ہم تیار ہیں۔ اس طریقے سے دو چار روز میں ہی ایک قلعہ تعمیر ہو جاتا۔ چنانچہ مختلف علاقوں میں موزوں مقامات پر ہم نے قلعے بنوا لیے میں نے ریاست سوات میں تمام قلعے ایسے موزوں مقامات پر ایسے طریقے سے بنوائے ہیں کہ سب قلعے ایک دوسرے سے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس طریقے سے میں نے ریاست سوات کے ڈیفنس کے منصوبے کا ایک حصہ پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ ان لوگوں کی نفسیات سے میں واقف تھا۔ لہٰذا میں نے ان لوگوں کو فوراً سختی کے ساتھ قوانین کی پابندی کے لیے کبھی مجبور نہیں کیا۔ بلکہ آہستہ آہستہ بتدریج صبر کے ساتھ مختلف قوانین نافذ کراتا رہا۔ حکومت بنانے کے بعد بھی جب آٹھ دس سال کا عرصہ گزر گیا تب کہیں جا کر قوانین کے نفاذ میں ہم کامیاب ہو گئے۔

اصلاحات

سوات میں باطل رسومات اور بُرے قسم کے رواجوں کا زور تھا۔ غریب قسم کے وہ لوگ

جو دوسروں کے مکانات (کھنڈروں) میں رہتے تھے اور جو فقیر کہلاتے تھے۔ حکومت بننے سے قبل ان لوگوں پر ناروا مظالم کیے جاتے تھے۔ یہ تو گویا بنی اسرائیل کے غلام تھے۔ جو کہ بیگاروں میں ہر وقت جوتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو حکومت بننے کے بعد اس قسم کی ناجائز بیگاروں سے نجات حاصل ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ باطل رسومات اور وحشیانہ رواجوں کو بھی ہم ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان لوگوں کو سمجھایا گیا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان پر مسجد کا احترام فرض ہے۔ چنانچہ مسجدوں کی حالت یہ بھی حکومت بننے کے بعد درست ہوئی۔ اور برے رواجوں کا انسداد کیا گیا۔

قوانین کا نفاذ

یہاں پر میں یہ کہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ اگر خداداد فطری صلاحیتوں کا اعتراف خودستائی نہیں ہے۔ تو پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ ریاست سوات میں قوانین کے نفاذ اور نیز دفتری اور عدالتی طریق کار کے لیے جو طریقے اور رُولز بنائے گئے ہیں یا وضع ہوئے ہیں یہ سب کچھ میں نے اپنے ہی ذہن اور دماغ سے کام لیا ہے۔ اس قبائلی ماحول اور اس میں رہنے والے لوگوں کے مخصوص حالات اور نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے یہاں کے لیے قوانین بنائے ہیں۔ میری کوشش یہ تھی کہ اصلاحات اور قوانین کا نفاذ اس طریقے سے کیا جائے کہ ایک طرف تو ان لوگوں کو جہل، بدعات اور رسومات قبیحہ کی آلائشوں سے پاک کیا جائے۔ اور دوسری طرف ان کے جابرانہ اور ظالمانہ ذہنیت کو اس طریقے سے ختم کیا جائے۔ کہ ان کے حریت پسند اور شجاعانہ کردار کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے اور اس کے ساتھ ہی یہ لوگ قانون کی پابندی کرنا اور ترقی کرنے کے طریقے بھی سیکھ جائیں۔ واضح رہے کہ سوات ہی وہ پہلی ریاست ہے کہ جہاں میں نے اس قسم کی کوشش کی ہے۔ کہ ان لوگوں کے مجرمانہ اور سنگدلانہ کردار کو اس طریقے سے پُرامن بنانے کی جدوجہد کی۔ کہ ان کے جذبۂ حریت اور شجاعانہ اوصاف کو بھی

ساتھ ساتھ مجروح ہونے سے بچایا جائے۔ لیکن شجاعانہ اوصاف کا مطلب میرے نزدیک یہ قطعاً نہیں ہے کہ یہ لوگ آپس میں قتل مقاتلے کریں۔ رہزنی اور ڈاکہ زنی جیسے جرائم کا ارتکاب کریں۔ یا آپس میں ایک دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگیں۔ یہ تو سراسر بزدلانہ اور بہیمانہ افعال ہیں۔ جن کا انسداد ضروری تھا۔ اس ضمن میں جو کچھ بھی میں نے کیا ہے اپنے ہی دل و دماغ کو اپنا رہبر بنا کر کیا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت میرے سامنے ایسی کوئی مثالی ریاست موجود ہی نہیں تھی۔ کہ جس کے حکمران یا سربراہ کو ایسی مشکلات اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ لہٰذا تقلید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مختلف عدالتوں میں قوانین کا نفاذ میں نے اس طریقے سے کیا ہے۔

۱۔ جب بھی کسی علاقے کو فتح کر لیتا یا کوئی علاقہ از خود حکومت میں شامل ہو جاتا تو اس علاقے کے لوگوں کا ایک عام جرگہ (اجلاس) طلب کر لیتا۔ پھر ان لوگوں سے کہتا کہ آپ لوگ خود ہی اپنے لیے قوانین بنائیں۔ مثلاً آپ کے علاقے میں قتل ہو جائے تو قاتل کے لیے کیا سزا ہونی چاہیئے۔ اس طرح دوسرے جرائم مثلاً سرقہ، سرقہ بالجبر، استحصال بالجبر، رہزنی ڈکیتی، زنا اور زنا بالجبر وغیرہ کے لیے کیا سزائیں ہونی چاہئیں۔ پھر جب تمام جرائم سے متعلق سزاؤں کے لیے علاقہ کے لوگ بیٹھ کر متفقہ طور سے قوانین منظور کر لیتے۔ تو اس کے بعد حسب ضابطہ ان قوانین کو ارکانِ جرگہ کی طرف سے ایک قومی عہد نامے کی صورت میں قلمبند بھی کر لیتے اس پر ارکانِ جرگہ کے دستخط اور انگوٹھے ثبت کیے جاتے۔ تب یہ عہد نامہ مکمل ہو جاتا۔ اور اس علاقے میں جرائم کے سلسلہ میں اس عہد نامے کے قوانین کے مطابق عمل درآمد کیا جاتا۔

۲۔ جب کسی علاقے کو فتح کر لیتا اور یا حکومت میں شامل کر لیتا تو سب سے اوّل اس علاقے کی آمدن کا اندازہ یا تخمینہ لگا لیتے۔ اس کے بعد اس علاقے میں حکومت کے نیر خواہ اور دوست طبقے سے عہدیداران مثلاً جمعدار صوبیدار وغیرہ بھرتی کر لیتا۔ پھر ان عہدیداروں کو مقررہ تعداد کے مطابق سپاہی بھرتی کرنے کا حکم دیا جاتا۔ جب

اس طریقے سے اس علاقے میں فوجی تنظیم کی کارروائی مکمل ہو جاتی تو باضابطہ رجسٹروں میں اندراجات ہو جاتے۔ تحصیل بنائی جاتی۔ اور تحصیل میں تحصیلدار کا تقرر ہو جاتا۔

جب بھی مذکورہ قسم کا کوئی علاقہ حکومت کی عملداری میں شامل ہو جاتا، تو اس علاقے میں قلعہ یا قلعے بنوائے جاتے۔ حفاظت کے لیے اس علاقے کے غریب افراد کو بھرتی کر کے قلعوں میں تعینات کیا جاتا۔ پھر مرکز یعنی سیدو سے کسی حقدار سینئر ملازم کو جمعدار یا صوبیدار کے عہدے پر ترقی دے کر مذکورہ قلعے کا انچارج افسر مقرر کر دیتا۔ یہ اس لیے کہ ابتدا میں یہ لوگ بے اعتبار قسم کے تھے۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ کسی بھی قلعے کا انچارج افسر معتمد شخص ہو۔ اس طرح جب کانا غور بند وغیرہ علاقوں سے آگے بڑھ کر کوہستانی علاقوں کو فتح کیا گیا تو کوہستانی لوگ، جو بہت زیادہ بے اعتبار تھے، چونکہ سوات کے لوگ کوہستانی علاقوں میں جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لہٰذا کانا غور بند کے علاقوں میں سے دوست اور بہی خواہ افراد اور ان کے عزیزوں کو ترقیاں دیکر کوہستانی قلعوں کے انچارج افسر بنا دیے جاتے۔ یہ اس لیے کہ کوہستانی علاقہ ان سے متصل اور نزدیک بھی ہے۔

چنانچہ ان مذکورہ بالا طریقوں سے ہم نے ریاستِ سوات کے مختلف علاقوں میں قوانین بھی نافذ کرائے اور ساتھ ساتھ فوجی تنظیم بھی مکمل کی۔

عید کے تہوار پر سوات میں لڑائیاں

ایک تباہ کُن اور مذموم رواج کا انسداد

عید جو کہ مسلمانوں کے مذہبی تہوار ہیں تمام دنیا جہاں بھی مسلمان بستے ہیں عید کی تقریب نہایت تزک و احتشام سے منائی جاتی ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے۔ کہ ایام عید میں سب مسلمان بے غم ہو کر مسرت اور شادمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اپنے خالق کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن سوات میں میری حکومت بننے سے پہلے تو یہ عید بھی زالے طور طریقوں سے منائی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں اسلامی احکام کو بھی یہ لوگ قطعاً نظر انداز کر گئے تھے۔ سوات میں یہ طریقہ تھا کہ ہر عید پر یہ لوگ آپس میں لڑتے تھے۔ عید کے سفید کپڑوں کو سرخ انسانی خون سے تار تار انہیں بہت پسند ہوتا تھا۔ دستور یہ تھا کہ ہر گاؤں والے عید کی نماز ادا ہونے کے بعد دوسرے گاؤں والوں سے لڑنے نکل جاتے تھے۔ ادھر سے وہ لوگ بھی نکل آتے۔ اس طرح مختلف علاقوں میں مختلف دیہاتوں کے مابین لڑائیوں کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ عید کے دن یہ لوگ سفید اور صاف کپڑے پہن کر لڑائی کے لیے گھروں سے نکل جاتے۔ اس قسم کی لڑائیاں اکثر پتھر مار مار کر لڑی جاتی تھیں۔ اور کافی کشت و خون ہو جاتا۔ حکمران ہونے کے بعد میں نے فی الفور اس ظالمانہ اور وحشیانہ رواج کو ختم کر دیا اور پھر ان لوگوں کو صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق عید کا تہوار منانے کا طریقہ سکھلا دیا۔ دریائے سوات کے کنارے ایک وسیع میدان میں عید کا میلہ لگایا جاتا تھا جس میں علاوہ دوسرے کرتبوں کے نیزہ بازی بھی کی جاتی تھی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ یہ لوگ

عید کی مسرت سے لطف اندوز ہونے سے واقف ہوئے۔ اور آج یہ حالت ہے۔ کہ دریائے سوات کے کنارے، سی وسیع میدان میں سوات کے لوگ جس دھوم دھام سے عید کا میلہ لگاتے ہیں۔ اس کی مثال شاید ہی دوسرے علاقے میں مل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس میلے میں سوات اور بونیر کے علاوہ ضلع مردان، ضلع پشاور، شتر نگر۔ درہ آفریدی اور درۂ خیبر تک کے علاقوں کے پٹھان شامل ہوتے ہیں۔ اب پٹھان قوم کے تمام علاقوں میں سوات کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ سوات میں عید کی اسلامی تقریب نہایت تزک و احتشام سے منائی جاتی ہے اور دریائے سوات کے کنارے وسیع اور خوبصورت میدان میں عید کا میلہ صحیح معنوں میں پٹھان تہذیب اور ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

تعلیم، سوات کے علاقوں میں

حکومت بننے سے قبل سوات میں تعلیم کا تو نام و نشان بھی نہیں تھا۔ خود میری بھی کوئی خاص تعلیم نہیں تھی۔ لیکن سوات میں پڑھا لکھا انسان بھی میں ہی ہوں کہ حکمران بننے سے کافی عرصہ پہلے اپنے کاروبار اور خط و کتابت کے لیے ایک منشی (محرر) رکھا تھا۔ حکومت بنانے سے پہلے ہی میں نے جب منشی کی ضرورت محسوس کی تو سوات میں کوئی خواندہ آدمی اس قسم کا نہیں ملتا تھا جو کہ محرری کا کام کر سکے۔ کاٹیلی گاؤں میں ایک ملا صاحب ہوتے تھے جو کہ کچھ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ میں نے اسی ملا صاحب کو بلا کر کہا کہ اگر آپ میرے منشی بن جائیں تو مہربانی ہوگی۔ کیونکہ مجھے ایک کاتب کی ضرورت ہے۔ یہ سن کر مولانا صاحب تو بہت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے کہ واہ میاں گل صاحب میں تو عالم آدمی ہوں اور اپنی قاضی گیری کروں گا۔ آپ مجھے محرر بننے کا کہتے ہیں جس کا بہت افسوس ہے۔ ملا صاحب کی منطق سن کر میں بھی خاموش ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں سے بحث کرنا ہی بیکار ہے ان دنوں میں میرا ایک ملازم تھا جس کا نام حضرت علی تھا۔ اس نے فارسی نظم کی کچھ

کتابیں پڑھی تھیں۔ چنانچہ اس نے مجھے کہا کہ میں کچھ عرصہ کے لیے تھانہ چلا جاؤں گا اور محنت کر کے خط و کتابت سیکھ لوں گا۔ چنانچہ میں نے اس حضرت علی کو تھانہ بھیج دیا۔ سولہ مہینے مالاکنڈ کے قصبہ تھانہ میں رہ کر اس نے کچھ لکھنا سیکھ لیا۔ پھر میں نے اس کو اپنا منشی بنا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مجھے ایک دوسرے محرر کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو ایک دوسرے آدمی کو خط و کتابت سیکھنے کے لیے تھانہ بھیج دیا۔ جب وہ بھی کام سیکھ کر واپس ہوا تو پھر اسے بھی منشی رکھ لیا۔ سوات کے ماحول میں حکومت بنانے سے قبل یہ دونوں میرے محرر رہے۔ تو یہ تھی اس زمانے میں سوات کی علمی حالت کہ اس ماحول میں خط لکھنے یا خط پڑھانے کے لیے کسی خواندہ آدمی کا ملنا ہی مشکل تھا۔

ان لوگوں میں کسی قسم کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہی نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہاں کے والدین یہ محسوس کرتے تھے کہ اپنی اولاد کو تعلیم دلانا بھی والدین کے فرائض میں گویا شامل ہوتا ہے۔ کچھ عجیب سی حالت تھی سوات کی۔

دلم رفیقِ سمندر مزاج می طلبد
سمومِ غیرتِ وادیٔ آتشیں دارم (نظیری)

۱۹۲۱ء کا ہنگامہ خیز سال، پیہم مشکلات اور ادین زئی کی لڑائیاں

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ ادین زئی کا علاقہ جو کہ نواب دیر کا علاقہ تھا۔ اپر سوات کی لڑائی میں نواب دیر کو شکست دے کر ہم نے یہ علاقہ فتح کر کے ریاست سوات میں شامل کر لیا تھا۔ ادین زئی کے مذکورہ علاقے میں موزوں مقامات مثلاً اوچ اور شوہ وغیرہ میں ہم نے قلعے بھی بنوائے تھے۔ اور وہاں کے لوگوں کو ہی بھرتی کر کے ان قلعوں میں تعینات کیے تھے۔ اس دوران میں اگرچہ ہماری مالی حالت کمزور تھی لیکن قرض لے کر میں نے سوار فوج کو خوب مضبوط کیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نواب دیر کی سوار فوج خاصی مضبوط تھی ادین زئی کے علاقے پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس کے ایک سال بعد نواب صاحب نے دوبارہ ادین زئی کے علاقے پر لشکر کشی کی۔ ابتدا میں تو ہماری فوج لڑتی رہی۔ لیکن بعد میں ہمارے فوج کے ایک حصے کو مغلوب کر کے نواب صاحب کی فوج بائیں پہلو سے اوچ کو چھوڑ کر شوہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن جب ہماری سوار فوج نے حملہ کیا تو پھر نواب صاحب کو شکست ہوئی۔ اس جنگ میں ہم نے نواب صاحب کے ساٹھ ستر گھوڑوں کے علاوہ بہت سارے دوسرے سامان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب ایک سال کا عرصہ تو گزر گیا۔ نواب صاحب نے محسوس کیا کہ اب طاقت کے بل پر فوجی طریقوں سے دوبارہ ادین زئی کے علاقے پر قبضہ کرنا تو مشکل ہے۔ لہٰذا انہوں نے حکمتِ عملی سے کام لیا

چکدرہ کے ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ کو بھاری رشوت دے کر اپنا طرفدار بنا لیا۔ ڈپٹی صاحب نے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کو یہ ذہن نشین کرا لیا کہ حکومت برطانیہ کا مفاد اسی میں ہے کہ ادین زئی کا علاقہ نواب دیر کے قبضے میں رہے۔ کیونکہ چترال جانے کے لیے سڑک بھی علاقہ ادین زئی پر سے گزرتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ نے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے علاقہ ادین زئی اور سوات کے خوانین تک یہ پیغام پہنچایا کہ اگر تم لوگ حکمران سوات کے برخلاف بغاوت کرو گے تو انگریزی حکومت تم لوگوں کو مالا مال کر دے گی۔ چنانچہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ نے ہی سوات اور ادین زئی کے علاقوں میں لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔

اسی سال ستمبر کے مہینے میں نواب دیر نے پھر لشکر کشی کی۔ ہماری پوزیشن اگرچہ کمزور تھی، لیکن جو وہ کہتے ہیں کہ "جسے خدا رکھے اسے کون چکھے" کے مصداق خدائی امداد ہمیں مل گئی۔ وہ اس طرح کہ نواب دیر کے لشکر میں ایک بیماری پھیل گئی جس کی وجہ سے خود بخود لشکر کو واپس ہونا پڑا۔ ادین زئی کا علاقہ بدستور ہمارے قبضہ میں رہ گیا۔ حکومتِ سوات کے استحکام اور سلامتی کے لیے اور اس کے ساتھ ہی ہماری صلاحیتوں کے لیے یہ ایک آزمائشی سال تھا۔ ایک مصیبت یہی تھی کہ نواب دیر جیسے طاقتور حریف کے علاوہ مالاکنڈ کا ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ بھی خواہ مخواہ دشمنی پر اتر آیا تھا۔ لہٰذا صورتِ حال اس آزمائشی سال ۱۹۲۱ء میں کچھ ایسی تھی کہ:۔

۱۔ نواب دیر اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ لشکر کشی کے لیے تیار تھا۔

۲۔ دوسری طرف سے نواب امب عبدالجبار شاہ سابق حکمران کے ذریعے حملے کے لیے مکمل تیاری کر چکا تھا۔

۳۔ اندرون ریاست پولیٹیکل ایجنٹ کی شہ پر چند طاقتور خوانین بغاوت کے لیے تیار موقعے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

۴۔ ایک طاقتور اور مضبوط لشکر جو کہ کوہستان کا تھا، کے حملے کا خطرہ تھا۔

اب اس تمام صورتِ حال سے مجھ اکیلے کو نبٹنا تھا۔ کوئی معاون یا صلاح کار نہیں تھا۔

صرف ایک بات تھی کہ میرا عقیدہ مضبوط تھا۔ اور خدائی امداد پر مجھے مکمل بھروسہ اور یقین تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہمارا مقصد تو یہی ہے۔ کہ "جیو اور جینے دو" ہم صرف اپنی ترقی کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی ایک ریاست بنائی ہے تاکہ اسے صحیح اصولوں پر چلائیں۔ اور خود کو نواب دیر کی غلامی سے بھی بچائیں۔ نیز ریاست سوات کے لوگوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے بھی مناسب جدوجہد کریں۔ ہمارے مقاصد نیک تھے۔ ہم لڑنے کے خواہشمند نہیں تھے لیکن دوسرے لوگ ہمیں لڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں یقیناً خداوند کریم ہماری مدد کرے گا۔ اس وقت یعنی آج سے تقریباً چالیس سال پہلے بھی میرا یہی عقیدہ تھا۔ اور آج بھی یہی ہے کہ خدا ہمیشہ حق پر رہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ بہرصورت یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر مشکل اور نازک ساعت میں خدائی امداد پر میرا اعتقاد مضبوط رہا ہے۔

علاقہ ادین زئی کی بغاوت، ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ کے ایما پر

ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ چکدرہ، ادین زئی کے لوگوں کو بغاوت پر اکساتا تھا۔ انگریز نواب دیر کو اپنا حلیف اور وفادار سمجھتے تھے۔ سوات میں ہماری حکومت اور استحکام اور نیز فوجی قوت کو انگریزی اقتدار کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے تھے۔ اس کے وجوہات میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کہ انگریز ہمیں خاندانی دشمن سمجھتے تھے۔ چنانچہ ڈپٹی ایجنٹ آف چکدرہ کے ایما پر سب سے اول ادین زئی کے لوگوں نے بغاوت کی۔ ان باغیوں نے علاقہ ادین زئی میں ہمارے قلعوں کو بھی محاصرے میں لے لیا۔ ان دنوں میں میں اپر سوات کے قلعہ نکل میں مقیم تھا۔ مجھے جب اس بغاوت کی اطلاع ملی تو میں نے فوراً لشکر بھیجنے کا انتظام کیا۔ دوسرے روز علی الصباح سورج نکلنے سے پہلے ہی ہماری فوج آندھی اور طوفان کی طرح دوڑتی ہوئی ادین زئی پہنچ چکی تھی، اور پھر نہایت تیزی کے ساتھ مقامی لوگوں کے شور و شر اور بغاوت کا خاتمہ کرا دیا۔ بغاوت کے سرکردہ اماکین بھاگ کر دیر میں نواب صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ہم نے ان بھگوڑے

باغیوں کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بلا کر عہدے دے دیے اور اپنا طرفدار بنالیا۔ جب اس طریقے سے بغاوت برپا کرنے کی سکیم ناکام ہوگئی تو مجبور ہوکر اب نواب صاحب لشکر لے کر مقابلے پر آئے۔ اس جنگ میں نواب صاحب کے پاس توپیں بھی تھیں۔ اور ہمارے پاس اس وقت توپیں نہیں تھیں۔ توپوں کی گولہ باری سے بچنے کے لیے ہم نے زمین دوز مورچے بنوائے۔ لیکن پھر بھی نواب صاحب لڑائی شروع کرنے میں پس وپیش کرتے رہے وجہ یہ تھی کہ ہماری سوار فوج اب اتنی مضبوط تھی۔ کہ نواب صاحب کو اپنی شکست کا خوف دامن گیر تھا۔ اس کے علاوہ نواب صاحب اس انتظار میں بھی تھے کہ بونیر کے راستے عبدالجبار شاہ حملہ کرے گا۔ اور سوات میں خوانین بغاوت برپا کریں گے۔ چنانچہ پروگرام مقررہ کے مطابق سب سے اول نواب امب کے لشکر نے علاقہ بونیر میں جنوب مشرقی طرف سے گوقند پر حملہ کر دیا۔ واضح رہے کہ علاقہ بونیر میں عبدالجبار شاہ کے وساطت سے نواب امب کی بھی ایک پارٹی بنی ہوئی تھی۔ اس وقت بونیر کا علاقہ آزاد تھا اور میری عملداری میں شامل نہیں تھا۔ ایک طرف سے تو نواب امب کے لشکر نے گوقند پر حملہ کر کے ہماری پارٹی کے لشکر کو مغلوب کر کے آگے بڑھے۔ دوسری طرف سوات میں علاقہ بابوزئی، علاقہ نیک پی خیل اور اپر سوات کے علاقہ میں ایک ایک پارٹی نے اعلانیہ بغاوت کی۔ ان مذکورہ علاقوں میں اعلانیہ مخالفوں کے علاوہ ایسے منافق اور بداعتماد لوگ بھی تھے جو بظاہر ہمارے اور درپردہ دشمن کے حمائتی تھے۔ نواب دیر کے ایما پر کوہستانی علاقوں کے ایک لشکر نے "مدین" کا محاصرہ کرلیا۔ اسی سلسلے میں نواب دیر کے ایجنٹ عرصہ سے کوہستانی علاقوں میں مصروفِ کار تھے۔ بونیر کی طرف سے نواب امب کا لشکر آگے بڑھتا ہوا "کڑاکڑ" پر پہنچ گیا۔

اب ہماری مشکلات کی صورتِ حال یہ تھی، کہ:۔

۱۔ منجہ کے مقام پر سوات کے اندرونی باغیوں کے لشکر کا مقابلہ کرنا۔

۲۔ مدین کے مقام پر کوہستانی لشکر کا مقابلہ کرنا۔
۳۔ کوہ کڑاکڑ پر آئے ہوئے نواب امب کی فوج کا مقابلہ۔
۴۔ علاقہ ادین زئی میں اپنے طاقتور حریف نواب دیر اور اس کی تمام قوتوں سے نبٹنا۔
۵۔ مالاکنڈ کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کی خفیہ شرارتوں سے خبردار رہنا۔ اور نیز اس کا انسداد کرنا۔

ان مذکورہ پانچوں محاذوں کی نگرانی، مذکورہ محاذوں پر فوجوں کی جنگی رہنمائی، اور پیچھے سے سیاسی پشت پناہی اور راشن وغیرہ کی رسد رسانی، ایمونیشن، میگزین کا بندوبست اور سپلائی غرضیکہ یہ تمام ذمہ داریاں میری تھی اور میں ہی ان لوگوں کے حوصلے بڑھاتا رہا۔ پولیٹیکل ایجنٹ کا یہ پانچواں خفیہ محاذ دراصل سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اعلانیہ جنگ میں تو دشمن کے ساتھ انسان کسی نہ کسی طرح نبٹ لیتا ہے۔ لیکن خفیہ دشمن خطرناک ہوتا ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے ایجنٹ مختلف علاقوں میں مصروفِ کار تھے۔ عام لوگوں میں نفرت اور مایوسی پھیلاتے تھے، بہرصورت ان پانچوں محاذوں پر بھی ہم لڑنے سے قطعاً ہراساں نہیں ہوئے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا، کہ ہم لڑیں گے اور مردانہ وار لڑیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ آخرکار خداوند کریم کے فضل و کرم سے ہم ہی کامیاب ہوں گے۔ مذکورہ بالا چاروں محاذوں پر ابتدا میں تو ہماری فوجوں کو ہزیمت جیسی ہوئی۔ لیکن مورچوں پر ڈٹے رہے۔ حالات بظاہر بہت ہی مایوس کن جیسے تھے مرکز سیدو شریف میں میرے پاس تیس اردلی تھے۔ ان اردلیوں سے ہی میں سارے کام لیتا رہا۔

۱۔ جنگ میں غلہ پسائی کا کام بھی ان کے ذمہ تھا۔
۲۔ ڈاک رسانی اور پیغام رسانی کا کام بھی یہی اردلی کرتے تھے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ حالات اگرچہ حوصلہ شکن تھے لیکن میں نے یہی سوچا کہ گھبراہٹ سے تو کام بگڑتے ہیں اور بنتے نہیں، لہٰذا گھبرانا بے سود ہے۔ ان تمام مشکلات سے دلیری کے ساتھ نبٹنا چاہیئے۔ سیدو شریف میں ہم نے کافی گڑھیاں (حفاظتی کوٹھے) بنوائے تھے۔ لیکن اس

موقعہ پر سپاہیوں سے خالی تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں باغی لشکر والے رات کو آ کر ان گڑھیوں پر قبضہ نہ کر لیں اور پھر اس صورت میں سیدو چھوڑنے پر کہیں مجبور نہ ہونا پڑے۔ لہٰذا اس کے لیے میں نے یہ ترکیب نکالی کہ کارخانۂ اسلحہ کے کارتوس بنانے والے ملازمین کو رات کو رائفلیں دے کر مذکورہ گڑھیوں میں حفاظت کے لیے تعینات کر دیتا۔ حالت یہ تھی کہ سیدو میں بجز چند اردلیوں کے میرے پاس اور کوئی ملازم وغیرہ نہیں تھے۔ ادین زئی سے اپر سوات کا لشکر منجہ کے محاذ پر آ گیا۔ ازی خیل، جانکی خیل کا لشکر مدین چلا گیا۔ اباخیل، موسیٰ خیل کا لشکر کوہ کڑاکڑ پر تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر صبح مجھے حوصلہ شکن قسم کی اطلاعات نقصانات کے متعلق ملتی تھیں۔ اب اس صورت میں مجھے ایک معتبر اور معقول پیامبر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاکہ اباخیل، موسیٰ خیل تک میرا پیغام پہنچ جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے میں نے 'نمبردار' کے میاں صاحب کو بلایا اور پیغام سے متعلق سمجھا کر کڑاکڑ روانہ کیا۔ لیکن سیدو سے چل کر میاں صاحب تو پھر مرغزار میں ہی مقیم ہو گئے، تب میں نے اسے بلا لیا اور اسے کہا کہ میاں صاحب آپ سیدو میں رہ جائیں۔ سیدو کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔ اور میں خود بریکوٹ جاتا ہوں۔ چنانچہ میاں صاحب کو سیدو میں چھوڑ کر میں خود دو چار اردلیوں کے ساتھ بریکوٹ پہنچ گیا۔ بریکوٹ اباخیل، موسیٰ خیل کے لوگوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ اور مجھے اس لیے وہاں جانا پڑ گیا کہ اس وقت اباخیل، موسیٰ خیل کی حالت کچھ ایسی تھی:۔

۱۔ چند خوانین جو صدق دل سے میرے حمائتی تھے۔

۲۔ چند معززین جو کہ میرے حمائتی تو تھے لیکن بزدل تھے۔

۳۔ چند خوانین جنہوں نے نواب امب کے ساتھ پارٹی بنائی تھی۔

اب یہ ضرور تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے کڑاکڑ تک آئے ہوئے نواب امب کے لشکر کو یا تو واپسی پر مجبور کیا جائے اور یا اسے شکست دی جائے۔ بصورت دیگر اگر وہ سوات کی طرف بڑھ جاتے تو صورتِ حال بدل جاتی۔ اس لیے کہ ہماری قوتِ مدافعت تو چار حصوں میں بٹ

پکی تھی۔ اندرون سوات کے لوگ دو غلے تھے۔ لہٰذا عبدالجبار شاہ کی دوبارہ کامیابی کے خدشات بھی تھے۔ لہٰذا ہر لحاظ سے یہ ضروری تھا کہ اس لشکر کی مدافعت کی جائے۔ "تھانہ" میں چند خوانین جو میرے دوست تھے میں نے ان کو بھی بلایا۔ اور پھر بری کوٹ میں صرف قوتِ زبان سے کام لے کر میں نے مذکورہ بالا تین حصول میں بٹے ہوئے خوانین کو ان کے افغانیت اور حب الوطنی کے واسطے دلا دلا کر متفق کر دیا۔ اور نیز ان کی آپس میں صلح وصفائی بھی کرا کر ان کی تسلی کرا دی۔ اب علاقہ اباخیل، موسیٰ خیل کا جو لشکر کڑاکڑ پہاڑ پر تھا اور اکثر اراکین جرگہ قومی بھی اس لشکر میں شامل تھے، لہٰذا خطرہ تھا کہ وہ لوگ کہیں نواب امب کے لشکر کے ساتھ مل نہ جائیں۔ بری کوٹ میں خوانین کے متحد ہونے کے متعلق اب لشکر والوں کو بھی اطلاع دینا ضروری تھا تاکہ لشکر بھی متحد ہو جائے۔ ان لوگوں کو قابو کرنے کے لیے اب مجھے اپنے ساتھیوں سمیت پہاڑ پر جانا پڑ گیا۔ کڑاکڑ میں ایک خاص اعتباری نوجوان کی وساطت سے مشکوک افراد کو اپنے پاس بلا لیا۔ رات کو ان کے ساتھ ہی زمین پر سو کر میں نے رات بسر کی۔ اور اس اثنا میں ان لوگوں کو رام کر لیا۔ ان کے شکوک رفع کر دیے اور ان کے حوصلے بڑھا دیے۔

یونیر کے عمائدین کے ساتھ ایک جرگہ اور کامیابی

اب جبکہ اباخیل موسیٰ خیل کے خوانین اور لشکر کے متعلق اطمینان حاصل ہو گیا۔ تو میں نے علاقہ یونیر کے لوگوں میں سے ان کے نمائندہ عمائدین کی ایک کانفرنس طلب کی۔ اراکین جرگہ (کانفرنس) سے خطاب کرتے ہوئے میں نے ان کو یاد دلایا کہ آپ لوگوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر نواب امب کا لشکر ہمارے حدود میں آئے تو ہم لوگ اس کے برخلاف آپ کے ساتھ لشکر میں شامل ہو کر نواب امب کے لشکر کو اپنے حدود سے نکالیں گے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ نواب امب کا لشکر آپ لوگوں کے علاقے پر سے ہوتا ہوا کوہ کڑاکڑ پر ہماری سرحد پر مقیم ہے

اور ہمارے ارادوں سے یہ لشکر آیا ہوا ہے۔ ان حالات میں آپ لوگوں کو اپنے معاہدے کا احترام کرنا چاہیئے۔ آپ اپنا وعدہ ایفا کریں۔ کیونکہ افغانی غیرت کا یہی تقاضا ہے۔

جرگے کے اراکین میری تقریر سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے مجھے جواباً کہا، کہ بہت اچھا۔ ہم اوّل تو رسماً نواب امب کے لشکر سے یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری حدود سے نکل جائیں۔ اگر انہوں نے ہمارے مطالبے کو تسلیم نہ کیا تو پھر ہم لوگ آپ کے ساتھ مشترک لشکر کر کے انھیں زبردستی ان حدود کو چھوڑنے پر مجبور کریں گے۔ چنانچہ اسی پر بونیر والوں کے ساتھ ہمارا سمجھوتہ ہو گیا۔ ادھر جب اس اشتراکِ عمل کی اطلاع نواب امب کے لشکر کو ملی تو وہ کڑاکر کے محاذ کو چھوڑ کر یہ لشکری واپس علاقہ بونیر چلے گئے۔ بونیر میں ڈگر کے مقام پر اس لشکر نے کیمپ کیا۔ میں بتلا چکا ہوں کہ بونیر کا علاقہ ان دنوں ریاست سوات کا حصہ نہیں تھا۔ چنانچہ کڑاکڑ کے محاذ پر ہم کامیاب ہو گئے۔ اسی روز منجہ کے مقام پر باغی لشکر کو ہمارے لشکر نے شکست دے کر پسپا کر دیا۔

علاقہ ادین زئی میں "اوچ" کے محاذ پر نواب دیر نے حملہ کیا تو ہمارے لشکر نے اسے بھی پسپائی پر مجبور کر دیا۔ ان حالات کو دیکھ کر نواب دیر نے میعادی صلح کے لیے گفتگو شروع کی چنانچہ چھ مہینے کے لیے میعادی صلح ہم نے منظور کی۔ اس کے بعد ہم نے مدین کو بھی فتح کر لیا۔ کوہستانی لشکر شکست کھا کر واپس ہو گیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے خفیہ منصوبوں کو بھی ہم نے ناکام بنا دیا۔ یہ لڑائی مسلسل ساڑھے پانچ مہینے جاری رہی۔ ریاست سوات کی تاریخ میں یہ ایک قسم کی جنگِ عظیم تھی۔ جس میں خداوند کریم کے فضل و کرم سے ہر محاذ پہ میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ سنہ ۱۹۲۱ء کا یہ سال جبکہ یہ جنگ شروع ہوئی، تو یہ سال ہماری صلاحیتوں کے لیے ایک کٹھن آزمائشی سال تھا۔ چاروں طرف سے دشمنوں کا زور تھا۔ اندرون ریاست باغی عناصر تھے۔ یہ سب گویا سوات کی نوزائیدہ ریاست کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انگریزی حکومت ان کی پشت پناہ تھی۔ میرے پاس

باشعور اور سمجھنے والے کارکن اور عمّال بھی نہیں تھے۔ لہٰذا کافی صعوبتیں اور مشکلات برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود پھر خوشی حاصل ہوئی کہ ہم اس آزمائش میں بھی کامیاب ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ سوات کی نوزائیدہ ریاست کی پشت پناہی قدرت خود کر رہی ہے۔ لہٰذا دنیا کی کوئی طاقت ہمارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ جب قدرت کو ہماری اعانت منظور ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ختم نہیں کر سکتی۔ مجھے ریاست سوات کے باغی عناصر کے تخریبی ذہن پر ایک بار پھر تعجب ہوا۔ کہ یہ لوگ دوسروں کے آلۂ کار بن کر محض معمولی قسم کے دنیاوی مفاد کے لیے اپنے جنت نظیر دیس اور اپنی قوم اور اپنے حکمران کے ساتھ غداری کرتے ہوئے شرماتے بھی نہیں۔ ع

بدیں عقل و دانش بباید گریست۔

ادین زئی پر سے گزرتی ہوئی چترال سڑک

اور اُس کے متعلق قوانین کا احترام

چترال کے لیے چونکہ سڑک علاقہ ادین زئی پر سے گزرتی ہے، لڑائی کے دوران میں نواب دیر کے لشکری اس سڑک پر آزادانہ آمد و رفت کرتے تھے۔ واضح رہے کہ یہ وہی سڑک ہے کہ جس پر ۱۸۹۵ء میں انگریزی فوج کو چترال جاتے ہوئے باجوڑ کے عمرا خان نے روک دیا تھا اور پھر دیر کے نواب محمد شریف خان نے انگریزوں کی اعانت سے دیر کا نواب بن کر اس سڑک کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ اور انگریزوں نے دس ہزار روپیہ سالانہ دینا منظور کیا تھا۔ چنانچہ اسی روڈ پر ادین زئی کی لڑائی میں نواب دیر کے لشکری آزادانہ پھرتے تھے۔ فوجی اصولوں کے مطابق چونکہ نواب دیر کے ساتھ ہم جنگ لڑ رہے تھے لہٰذا ہمیں اس سڑک پر بھی قبضہ کرنے کا حق تھا۔ اس لیے کہ اسی سڑک پر دشمن کے لشکری تھانہ سے راشن وغیرہ لے جایا کرتے تھے اور ہمارا حق تھا کہ دشمن فوجوں کو راشن کی رسد سے محروم کر دیتے۔ لیکن ہم نے دورانِ جنگ میں نہ تو سڑک پر قبضہ کیا اور نہ ہی دشمن کے لشکریوں کو مذکورہ سڑک استعمال کرنے سے روکا اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ جو کہ نواب دیر کا طرفدار تھا، کو سڑک کے بہانے خواہ مخواہ مداخلت کرنے کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ اور اس طرح حفاظت سڑک کی آڑ میں انگریزی حکومت کو نواب دیر کے ساتھ فوجی امداد اعلانیہ کرنے کا موقعہ ہاتھ آجائے گا۔ لہٰذا ہم نے سڑک کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ اور خاموش رہے۔ اگرچہ نواب دیر کے ساتھ

اس سلسلے میں چھیڑ چھاڑ کرتے تو بھی ہم حق بجانب ہوتے۔ لیکن خاموش رہنے کی میری پالیسی ہی اس موقعہ پر کامیاب ثابت ہوئی۔ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کو نواب دیر کے ساتھ اعلانیہ فوجی امداد کا ہم نے موقعہ ہی نہ دیا۔

۱۹۲۲ء میں علاقہ ادین زئی کی واپسی

نواب صاحب کے فوجی حربے ناکام ہو گئے، انھوں نے محسوس کیا کہ اب بزور تلوار علاقہ ادین زئی پر قبضہ کرنا مشکل ہے تو نواب صاحب نے انگریزی حکومت کا سہارا لیا۔ اور ہزاروں واسطے دلا کر انگریزی حکومت کو مجبور کیا کہ ادین زئی کا علاقہ ہم سے واپس لے کر نواب صاحب کو دے دیں۔ چنانچہ مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ نے مجھ سے پوچھے بغیر نواب دیر کے ساتھ یہ معاہدہ کر لیا، کہ :۔

"ادین زئی کا علاقہ تمہیں واپس دلایا جائے گا، لیکن آپ سوات پر اس وقت تک دوبارہ لشکر کشی نہیں کریں گے، جب تک کہ سوات میں آپ کی پارٹی تین گن حکمران سوات کی پارٹی سے تعداد میں بڑھ نہ جائے۔ اس کے بعد بھی پولیٹیکل ایجنٹ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد ہی آپ سوات پر لشکر کشی کریں گے۔"

چنانچہ نواب دیر کے ساتھ بالا بالا یہ معاہدہ طے کرنے کے بعد انگریزوں نے مجھ سے کہا کہ اب آپ ادین زئی کا علاقہ نواب دیر کو واپس کر دیں۔ دو تین مہینے تو اس مطالبے کو میں ٹالتا رہا۔ یہ مطالبہ سراسر اگرچہ جانبدارانہ اور غیر منصفانہ تھا۔ لیکن ہم مجبور تھے، کیونکہ کپڑا اور دوسری ضروریاتِ زندگی کے لیے ہم انگریزی علاقوں کے محتاج تھے۔ اب اگر انگریزی حکومت کے اس مطالبے کو میں تسلیم نہ کرتا، تو یہ ضروری تھا کہ ہم ضروریاتِ زندگی سے محروم کرائے جاتے۔ لہٰذا چار و ناچار ادین زئی کا وہ علاقہ جو میں نے بزورِ شمشیر فتح کیا تھا۔

نواب دیر کو واپس کر دیا۔

کانا، غوربند اور علاقہ بونیر کی تسخیر کے منصوبے

ادین زئی کا علاقہ واپس کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بونیر، کانا اور غوربند کے علاقے فتح کیے بغیر ریاست سوات کا استحکام ناممکن ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں سب سے اوّل علاقہ بونیر کے وہ عمائدین جو کہ میری پارٹی میں شامل تھے اور سیدو میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ اب آپ ہمارے ساتھ بونیر پر لشکر کشی کریں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ فی الحال ہم کمزور ہیں اور اس قابل نہیں ہیں کہ لشکر کشی کریں۔ لیکن اس موقع پر حکمتِ عملی سے کام لیں گے۔ چنانچہ میں نے بونیر والوں کو سمجھایا کہ آپ لوگ عام جرگے میں مجھ سے مطالبہ کریں کہ ہمارے ساتھ بونیر پر چڑھائی کرو۔ تب میں انکار کر دوں گا۔ اور آپ لوگ بظاہر ناراض ہو کر واپس بونیر چلے جائیں۔ تاکہ بونیر میں مخالف پارٹی کی یہ تسلی ہو جائے کہ ہم میں اور آپ میں گویا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔ جب ان کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ آپ لوگوں کا اب میرے ساتھ تعلق خاص نہیں رہا تو یقیناً وہ لوگ نواب امب کے لشکر کو جو کہ بونیر میں مقیم ہے واپس کر دیں گے اس کے بعد پھر ہم اطمینان سے بونیر پر لشکر کشی کر سکیں گے۔ چنانچہ بونیر والوں نے میری ہدایات کے مطابق عمل کیا۔ اوّل تو مجھ سے لشکر کشی کا مطالبہ کیا۔ جب میں نے انکار کیا تو وہ لوگ بظاہر ناراض ہو کر چلے گئے۔ بونیر میں مخالف پارٹی کو ہمارے اختلاف کے متعلق تسلی ہو گئی تو نواب امب کے لشکر کو انھوں نے رخصت کر دیا۔ واضح رہے کہ ان دنوں میں جبکہ بونیر کا علاقہ ایک آزاد اور خود مختار علاقہ تھا، میں دو پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی کا اتحاد میرے ساتھ تھا اور دوسری پارٹی کا اتحاد نواب امب کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اسی ضمن میں جب ہماری حدود کوہ کڑا کڑ سے نواب کا لشکر واپس ہو کر بونیر میں مقیم ہو گیا تھا تو اس کے

بعد اس وقت تک مقیم رہا، جب کہ ہمارے اختلافات سے مطمئن ہو کر خود بونیر والوں نے نواب امب کے مذکورہ لشکر کو واپس کر دیا۔

دروازۂ کوہستان، بحرین پر قبضہ

اس وقت تک کوہستانی علاقے ہماری عملداری میں شامل نہیں تھے۔ اور کوہستانی علاقوں کو چھیڑنے کا خیال بھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس دوران میں ایسا ہوا۔ کہ کوہستانیوں کا ایک وفد بطور جرگہ میرے پاس آیا۔ اور اپنے علاقے کو ریاست سوات میں شامل کرنے کی درخواست کی۔ اس وقت طریقے کے مطابق اگر کسی علاقے کے عمائدین رضاکارانہ طور سے بھی اپنے علاقے کو ریاست میں شامل کرنا چاہتے تھے تو بھی لشکر کشی ضروری ہوتی تھی۔ ان ایام میں جب کہ میرا ارادہ بونیر کو فتح کرنے کا تھا میں کوہستانی علاقے پر لشکر کشی کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن کوہستانی وفد کے اراکین مُصر تھے کہ ہم تو اپنے ساتھ ہی لشکر لے کر جائیں گے۔ میں نے سپہ سالار کو کچھ لشکر دے کر ان کی دلجوئی کے ساتھ جانے کی اجازت دی۔ اور یہ ہدایت کی کہ پھر کسی بہانے واپس آجائیں۔ لیکن جس وقت یہ لشکر بحرین پہنچ گیا تو لشکر والوں نے یہ سمجھا کہ بحرین فتح کرنا تو آسان ہے، اب یہاں تک ہم آئے ہیں تو کیوں نہ اسے فتح کر لیں۔ لہٰذا مجھ سے پوچھے بغیر ہی انھوں نے بحرین پر قبضہ کر لیا۔ کوہستانی لشکر نے یکدم متحد ہو کر ہمارے لشکر کو بحرین سے باہر دھکیل دیا۔ اب انہیں اپنی کمزوری کا بھی احساس ہوا۔ لہٰذا امدادی فوج بھیجنے کے لیے فوراً میرے پاس آدمی بھیج دیا۔ اس زمانے میں پیغام رسانی کے ذرائع مثلاً ٹیلی فون وغیرہ نہیں تھے۔ لہٰذا اطلاع ملنے میں تاخیر تو لازمی تھی۔ اس دوران میں کوہستانی لشکر نے ہمارے لشکر والوں کو جنہوں نے بحرین سے باہر ایک پہاڑی پر قبضہ جمایا تھا خوب تنگ کیا۔ اور قریب تھا کہ سپہ سالار سمیت سارے لشکر کا خاتمہ ہو جاتا۔ کہ اتنے میں وہ امدادی لشکر جو میں نے روانہ کیا تھا مدین پہنچ گیا۔ جونہی کہ کوہستانی لشکر کو یہ اطلاع ملی

کہ امدادی لشکر پہنچنے والا ہے تو کوہستانی لشکر منتشر ہو گیا۔ اس طرح ہم نے بحرین جیسے اہم مقام کو فتح کر لیا۔ بحرین میں قلعہ بنوایا گیا اور قلعے میں سپاہی حسب ضابطہ تعینات ہو گئے۔ اس کے بعد پھر بحرین سے ہمارا لشکر واپس آ گیا۔ اس لڑائی میں اگر امدادی فوج بھیجنے میں عجلت نہ کرتا تو پھر یقیناً ہمارے لشکر کا ایک فرد بھی زندہ بچنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ اور پھر شاید صورتِ حال کچھ اور ہوتی۔ سپہ سالار نے اس موقعہ پر میری ہدایات حاصل کیے بغیر اور نیز میرے حکم کے بغیر بحرین پر چڑھائی کر کے غلطی کی تھی۔ ایک ایسی غلطی جو کہ سینکڑوں افراد کی بے جا ہلاکت کا موجب ہو سکتی تھی۔ لیکن بروقت امداد پہنچنے کی وجہ سے نتیجہ فائدے کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔ لہٰذا اس سلسلے میں کوئی خاص باز پرس تعزیری میں نے سپہ سالار سے نہیں کی۔ تاہم میں نے اسے سختی کے ساتھ متنبہ کیا۔ کہ آئندہ وہ اس قسم کی احمقانہ جرأت نیک نیتی کے ساتھ بھی نہ کرے۔

علاقہ بونیر پر قبضہ اور انگریزوں کے ساتھ ایک سیاسی چال، سنہ ۱۹۲۳ء

جیسا کہ پہلے بتلا چکا ہوں کہ بونیر سے جب نواب امب کی فوجیں واپس ہوئیں تو کچھ عرصہ کے بعد ہم نے بونیر کی تسخیر کے لیے تیاری شروع کی۔ پولیٹیکل ایجنٹ مالاکنڈ کو بھی یہ اطلاع ملی۔ کہ حکمران سوات اب بونیر کو تسخیر کرنے کے لیے فوجی تیاریوں میں مصروف ہے۔ چنانچہ ان اطلاعات کی تصدیق کے لیے پولیٹیکل ایجنٹ نے اپنے پولیٹیکل تحصیلدار کو میرے پاس سیدو میں بھیج دیا اس پولیٹیکل تحصیلدار کے چونکہ ہمارے ساتھ تعلقات کچھ اچھے نہیں تھے۔ لہٰذا جس وقت مذکورہ تحصیلدار صاحب سیدو میں میرے پاس پہنچ گئے تو میں نے سرسری طور سے ان سے پوچھا، کہ کیسے آئے ہو۔ جواباً اس نے کہا کہ مجھے پولیٹیکل ایجنٹ نے آپ سے یہ پوچھنے کو بھیجا ہے کہ کیا واقعی آپ کا ارادہ علاقہ بونیر پر لشکر کشی کرنے کا ہے؟ اب میں نے سوچا کہ اس موقعہ پر اگر میں اسے کہہ دوں کہ ہاں میں بونیر پر لشکر کشی کرنا چاہتا ہوں تو لازمی نتیجہ یہی ہوگا۔ کہ پولیٹیکل ایجنٹ لکھ دے گا کہ "مت کرو" اور پھر عدولِ حکم کے سلسلے میں اس کی ناراضگی اعلانیہ مول لینی پڑے گی۔

اور اگر اب انکار کروں کہ میں تو لشکر کشی کرنا نہیں چاہتا، اور پھر کروں تو پھر بھی ایجنٹ صاحب ناراض ہوں گے۔ کہ مجھے غلط فہمی میں رکھا۔ لہٰذا کچھ ایسا جواب دینا چاہیئے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی پولیٹیکل ایجنٹ مطمئن بھی ہو جائے اور ہم پر بھی بعد میں الزام نہ آئے میں نے اس دوران میں جواب سوچ لیا۔ چنانچہ میں نے پولیٹیکل تحصیلدار کے سامنے اپنی کمزوری بیان کی۔ اور اسے کہا کہ کیا کریں۔ ہم مجبور ہیں۔ مجھے خود تو نہ حکمرانی کا شوق ہے اور نہ حکومت کے ساتھ کوئی خاص دلچسپی ہے لیکن سوات کے لوگوں نے اب یہ ذمہ داری مجھے سونپی ہے تو اب اپنے فرائض سے مجبور ہوں کہ اس ریاست کی حفاظت اور استحکام کے لیے ہر ممکن کوشش کروں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ نواب امب ہر وقت بونیر میں مداخلت کرتا ہے اور بونیر کے لوگوں کو ہمارے برخلاف اکساتا ہے اور خواہ مخواہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ریاست سوات کے استحکام میں خلل پڑے۔ اس لیے مناسب تو یہی ہے کہ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب اس معاملے میں مداخلت کرلیں۔ اور بونیر کو ایک قسم کا غیر جانبدار علاقہ قرار دیں۔ اور اگر پولیٹیکل ایجنٹ صاحب ایسا نہیں کرتے تو پھر ہم مجبور ہیں کہ باوجود کمزور ہونے کے نواب امب کی شرارتوں سے محفوظ رہنے کے لیے کچھ جدوجہد کریں اور جو کچھ بھی نتیجہ ہو اس کا لحاظ کیے بغیر لشکر کشی کرنے کے لیے ہم مجبور ہوں گے۔ اس پر تحصیلدار نے دوبارہ سوال کیا کہ آپ کب بونیر پر لشکر کشی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے دوبارہ عاجزانہ لہجے میں مذکورہ واقعہ سب دہرا دیا۔ چنانچہ تحصیلدار صاحب نے واپس جاکر پولیٹیکل ایجنٹ سے کہہ دیا کہ حکمران سوات کمزور حالت میں ہے اور موجودہ حالات میں اس قابل نہیں ہے کہ بونیر پر لشکر کشی کر سکے۔ بونیر پر لشکر کشی کی افواہوں کا دراصل مطلب یہ ہے کہ پولیٹیکل ایجنٹ مداخلت کر کے بونیر کو ایک غیر جانبدار علاقہ قرار دے۔ چنانچہ تحصیلدار کی اس یقین دہانی کے بعد ایجنٹ صاحب مطمئن ہو گئے۔ دوسرے سال اتفاقاً ایسا ہوا کہ میری بھاوج فوت ہو گئی۔ تو میں نے بونیر میں اپنی پارٹی کے افراد کو یہ پیغام بھیج دیا کہ

فاتحہ خوانی کے بہانے سیدو آجاؤ۔ چنانچہ وہ لوگ فاتحہ خوانی کے لیے سیدو پہنچ گئے۔ یہاں آکر انھوں نے پھر مطالبہ کیا کہ ہمارے ساتھ بونیر پر لشکر کشی کرو۔ میں نے پھر اظہار انکار کیا، کہ بھئی ہم کمزور ہیں، لشکر کشی نہیں کرسکتے۔ پھر ان سے میں نے کہا کہ کھانا تیار ہے۔ اس لیے آپ لوگ کھانا کھالیں۔ جب وہ لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے تو میں نے ان سے کہا، کہ آپ لوگ کھانا کھاکر پھر فوراً بونیر پہنچیں۔ کل صبح ہمارا لشکر بھی بونیر پہنچ جائیگا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ لشکر سے ایک دن پہلے بونیر پہنچ جائیں اور وہاں لشکر کشی کی افواہیں پھیلا دیں۔ تاکہ لوگ مرعوب ہوجائیں۔ چنانچہ بونیر والے کھانا کھاکر واپس بونیر چلے گئے۔ دوسرے روز جب ہمارا لشکر بونیر پہنچا تو بونیر کے اکثر لوگ خوفزدہ ہوکر بونیر خالی کرچکے تھے۔ لہٰذا ہمارے لشکر نے مقیم ہوکر علاقہ بونیر پر قبضہ جمالیا۔ اس اثنا میں علاقہ مخوزئی کے لوگ بھی میرے پاس سیدو آگئے۔ اور علاقہ مخوزئی کو ریاست سوات میں شامل کردیا۔ اور لشکر والوں نے میرے احکام کے بموجب علاقہ مخوزئی کے قلعے سنبھال لیے۔ علاقہ بونیر میں قلعہ جات کی تعمیر اور دوسرے تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد ہمارا لشکر علاقہ بونیر سے واپس آگیا۔ اب ضرورت تھی کہ لشکر والے کچھ دن آرام کریں۔

ادائے قرض اور ایک واقعۂ افسوسناک

علاقہ بونیر پر لشکر کشی کے دوران میں میاں صاحب آف سرداری کا لشکر بھی ہمارے لشکر میں شامل تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ میری پارٹی تھی۔ لشکر کشی کے دوران میں میاں صاحب نے یہ مطالبہ کیا کہ مخوزئی اور لیلونئے کے علاقے فتح ہونے کے بعد مجھے دیے جائیں۔ بونیر سے میرے وزیر نے مجھے لکھا کہ میاں صاحب تو لیلونئے اور مخوزئی کے علاقے مانگتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس موقعہ پر اگر میاں صاحب کو صاف صاف جواب دیا جائے تو نتیجہ یہی ہوگا کہ لشکر میں انتشار پیدا ہوگا۔ لہٰذا

میں نے وزیر کو لکھ دیا کہ اپنے خطوط وغیرہ خفیہ بھیجا کرو۔ اور اس موقعہ پر ہنر اور حکمتِ عملی سے کام لو۔ میاں صاحب کو یہ کہو کہ جب مذکورہ علاقے فتح ہو جائیں اور ہم ان کے انتظامات وغیرہ سے مطمئن ہو جائیں تو سیدو میں جا کر حد بندی وغیرہ کے متعلق فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ علاقہ مخوزئی میں جب وہاں کے قلعوں پر ہمارے لشکری مقرر ہو گئے اور ہمارا لشکر علاقہ بونیر سے واپس سوات آ گیا تو سرداری کے میاں صاحب کے آدمیوں نے مخوزئی کے قلعے ہمارے آدمیوں سے جبراً چھین لیے۔ اور اس کے ساتھ ہی کہ ادھر مخوزئی میں تو میاں صاحب کے آدمیوں نے یہ نامناسب اقدام کیا، میاں صاحب سیدو میں میرے پاس پہنچ گئے اور مطالبہ کیا کہ آپ میرے ساتھ لشکر کشی کر کے اب لیلونئے کا علاقہ میرے لیے فتح کرو۔ مطلب یہی تھا کہ مخوزئی کا علاقہ تو میرا ہو گیا۔ اب لیلونئے کا علاقہ بھی دلا دو۔ اس موقعہ پر میاں صاحب کا یہ مطالبہ عجیب تھا۔ کیونکہ خود میاں صاحب کی جابرانہ ذہنیت دوستی کی حدود سے نکل کر ریاست سوات کی سلامتی اور میرے فرائض حکمرانی سے متصادم ہو چکی تھی۔ ریاست سوات کے ایک علاقے میں سرکاری ملازمین کو بالجبر قلعوں سے نکال کر اور پھر خود قلعوں پر قبضہ کرنا میاں صاحب گویا تشدد انہ قسم کے سنگین بغاوت کے جرائم کے مرتکب ہونے کے بعد اب آ کر سیدو میں میرے پاس بیٹھے ہیں۔ اور مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ میرے ساتھ لشکر کشی کر کے میرے لیے لیلونئے کا علاقہ فتح کر دو۔ گویا کہ میاں صاحب ریاست کے اندر اپنے لیے جداگانہ ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اس موقعہ پر میں عجیب و غریب حالات سے دوچار ہو گیا۔ میاں صاحب کی دوستی اور بعض موقعوں پر رفیقانہ تعاون کے پیش نظر میں نے اسے بہت سمجھایا کہ لشکر والے حال ہی میں بونیر سے واپس آئے ہیں۔ لہٰذا انہیں کچھ عرصہ آرام کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد لیلونئے کے علاقے پر لشکر کشی کے متعلق سوچیں گے۔ لیکن بقول شاعر ؎

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں　　بھائی صاحب تو کچھ دیوانے ہیں

میاں صاحب اپنی ہی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ذاتی دوستی اور تعلقات فرائض حکمرانی کی راہ میں بُری طرح حائل ہو رہے ہیں کسی بھی ریاست میں ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی با اصول اور خیر اندیش رعیت حکمران یہ برداشت کر سکتا ہے کہ ریاست کے دو وسیع علاقوں کا نظم و نسق اور اس میں بسنے والے ہزاروں افراد کی زندگیاں ایک ایسے جابر کے حوالے کیے جائیں، جسے صرف ذاتی اقتدار اور دولت سے سروکار ہو اور جو حکمرانی کے فرائض اور اصولوں سے ناآشنا ہو۔ محض اس وجہ سے کہ مذکورہ قسم کا وہ طاقتور فرد حکمران کا دوست اور معاون رہا ہے۔ لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس موقعہ پر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں اپنے ذاتی تعلقات اور دوستانہ حقوق کو حکمرانی کے صحیح اور بلند نصب العین اور نوزائیدہ ریاست کے استحکام اور سلامتی پر قربان کر دوں۔ چنانچہ میں نے فی الفور میاں صاحب کو گرفتار کر کے جیل میں نظر بند کر دیا۔ اور اس کے گاؤں سردار پر لشکر کشی کر کے اس کی فوجی قوت کو ختم کر دیا۔ میں کہہ چکا ہوں، ریاست سوات کو جن طاقتور اور استبدادی قسم کے عناصر سے نجات دلانا چاہتا تھا، انہیں میں سے ایک یہی ہمارے دوست میاں صاحب بھی تھے۔ علاقہ مخوزئی میں سرکاری ملازمین کو جبراً سرکاری قلعوں سے بے دخل کرا کر وہاں اپنے لشکری تعینات کرانا اور سارے علاقے میں خواہ مخواہ دہشت اور سراسیمگی پھیلانا، یہ سب اقدامات میاں صاحب کے باغیانہ جرائم تھے اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ کہ علاقہ مخوزئی کے عمائدین نے خود سید و میں آ کر رضا کارانہ طور سے اپنے علاقے کو ریاست سوات میں شامل کیا ہوا تھا۔ لہٰذا اب ریاستی حکومت اس علاقے کی بہبود اور اس کے عوام کے حفاظت مال و جان اور نیز ان کی آزادی کی حفاظت کی ذمہ دار تھی۔ لہٰذا میاں صاحب کو نظر بند کرنے اور اس کے خطرناک فوجی قوت کو ختم کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ سردار پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہم نے مخوزئی کے ان قلعوں پر بھی دوبارہ قبضہ کر لیا۔ کہ جن پر میاں صاحب مذکور کے آدمی جبراً

قابض ہو چکے تھے۔

۱۹۲۳ء کانا، پورن وغیرہ علاقوں کے متحدہ لشکر کی ہنگامہ آرائی

اس دوران میں پورن، کانا، چکیسر وغیرہ علاقوں میں بعض شرپسند افراد نے لشکر منظم کیا۔ دریائے سندھ کے پار علاقہ الائی کا لشکر بھی انہوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس متحدہ لشکر نے آ کر علاقہ مخوزئی پر حملہ کر دیا۔ میں نے مذکورہ علاقوں یعنی کانا، چکیسر وغیرہ میں معزز اراکین پر مشتمل وفد بطور جرگہ بھیج دیے۔ اور ان لوگوں سے یہ اپیل کی کہ اپنے ہی علاقوں میں مداخلت سے باز آ جائیں۔ لیکن ان لوگوں نے ایک نہ سنی۔ آخر کار ہم مجبور ہوئے کہ لڑیں۔ مخوزئی کے محاذ پر لڑائی ہوئی۔ ہمارے لشکری تعداد میں کم تھے لیکن انہوں نے بے جگری سے لڑ کر حملہ آور لشکر کو شکست دے دی۔ اور پھر آگے بڑھ کر ہم نے پورن، لیلونئے وغیرہ علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ مخوزئی کا علاقہ بھی مکمل فتح ہو گیا۔ اب صرف چکیسر آزاد رہ گیا۔ مقبوضہ علاقوں کے سرکردہ باغی افراد جو لشکر کشی کے محرک تھے بھاگ کر چکیسر چلے گئے۔ مفتوحہ علاقوں میں حسب ضابطہ تمام انتظامات پایۂ تکمیل پہنچانے کے بعد ہمارا لشکر بھی واپس سوات آ گیا۔ اب یہ ضروری تھا کہ لشکر والوں کو آرام کرنے کا موقعہ دیا جاتا۔ لیکن حالات ایسے کہاں تھے کہ لشکر والے یا ہم آرام کر لیتے ریاست سوات کی تاریخ میں یہ ۱۹۲۳ء کا سال بھی بہت اہم تھا۔ کہ اس سال میں بونیر، مخوزئی، پورن، لیلونئے۔ غور بند اور سرداری جیسے علاقے ہم نے فتح کر کے ریاست میں شامل کر لیئے۔

سنہ ۱۹۲۴ء نواب امب کی لشکر کشی علاقہ بونیر پر

پورن وغیرہ محاذ سے ہمارے لشکر کو آئے ہوئے بمشکل پندرہ دن ہو چکے تھے کہ اب ہمیں اطلاع ملی کہ نواب امب دوبارہ حملہ کے راستے علاقہ بونیر میں ایک جرار لشکر بھیج چکا ہے۔ چنانچہ ہم نے فوراً اپنے ایک وزیر کی سرکردگی میں لشکر مقابلے کے لیے روانہ کر دیا۔ وادی حملہ میں ہماری فوج "نواگئی" کے مقام پر مقیم ہوگئی۔ نواب امب کے لشکر نے جو کچھ فاصلے پر نیچے مقیم تھا رات کو نقل و حرکت شروع کی۔ وادی حملہ کے لوگ بھی دشمن لشکر میں شامل ہو گئے۔ مخالف لشکر نے ایک طویل چکر کاٹ کر ہمارے لشکر کے عقب میں ایک جگہ کیمپ لگایا۔ دوسرے روز میرے وزیر نے یہ غلطی کی کہ بغیر کسی سکیم اور تدبیر کے لڑائی چھیڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی میں مخالف لشکر کا پلہ بھاری رہا لیکن اسی وزیر نے دوبارہ کچھ دانائی سے کام لیا۔ کہ باوجود ہزیمت خوردگی کے لشکر کو اپنی جائے قیام سے ہٹایا نہیں بلکہ ڈٹا رہا۔ جہاں کہ لڑائی ہوئی تھی یہ مقام "سوما" کے نام سے مشہور ہے۔ وزیر نے اپنے ہزیمت خوردہ لشکر کو جمع کر کے ان کے حوصلے بڑھا دیے اور انہیں تسلی دی۔ جب مجھے اس ہزیمت کی اطلاع ملی، تو میں نے فوراً امدادی لشکر روانہ کر دیا۔ لیکن اس دوران میں علاقہ بونیر میں سالار زئی تحصیل کے لوگ بغاوت پر اتر آئے۔ جب ہمارا امدادی لشکر علاقہ سالار زئی پر سے گزر رہا تھا۔ تو سالار زئی کے لوگوں نے متحد ہو کر لشکر پر حملہ کر دیا۔ ان سے اسلحے وغیرہ چھین لیے۔ مجھے اس افسوسناک واقعہ کی اطلاع شام کے وقت ملی، تو میں نے سپہ سالار کو فوراً حکم دیا کہ علاقہ نیک پی خیل کے لشکر کو طلب کر کے بونیر بھیج دو۔ گرمی کا موسم تھا۔ دریائے سوات طغیانی پر تھا، لیکن اب ہماری فوج کافی حد تک پابند ڈسپلن ہو چکی تھی۔ اب فوجیوں نے قانون اور فوجی قواعد

کا احترام کرنا سیکھ لیا تھا۔ لہٰذا نیک پی خیل کے جوانوں نے ہمت اور شجاعت سے کام لے کر رات کی سیاہی میں دریائے سوات کو عبور کر کے سیدو میں حاضر ہو گئے۔ چنانچہ صبح سویرے کڑاکڑ کے راستے نیک پی خیل کے لشکر کو بھی بونیر بھیج دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے تیس اردلیوں کو بگلہ دے کر کوہ الم کے راستے روانہ کر دیا۔ تاکہ الم کی چوٹیوں سے بگلیں بجا بجا کر علاقہ سالارزئی کے لوگوں کو خوفزدہ کیا جائے۔ دوسری طرف سے علاقہ نیک پی خیل کے لشکر نے تیزی کے ساتھ پہنچ کر سالار زئی کے باغی لشکر کو شکست دے دی۔ ان کی شورش اور بغاوت کا خاتمہ کرا دیا۔ اور سابقہ امدادی لشکر کو بھی محاصرے سے اسی نیک پی خیل کے لشکر نے نکال کر پھر یہ متحدہ لشکر چملہ میں مقیم لشکر کی امداد کے لیے چملہ پہنچ گیا۔

چملہ میں مقیم لشکر کو میری ہدایات

چملہ کے مقام پہ ہماری فوج مقیم تھی، وزیر نے مجھے لکھا کہ کل ہم دوبارہ سورہا کے مقام پہ مخالف لشکر پہ حملہ کریں گے۔ لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ نہیں لکھا کہ اندریں بارہ آپ کا حکم کیا ہے۔ اس زمانے میں ٹیلیفون کا سلسلہ تو نہیں تھا۔ پیغام رسانی میں خواہ مخواہ کچھ تو دیر لگتی تھی۔ میں نے وزیر کو لکھا کہ جس مقام پر لڑ کر تم لوگ ایک دفعہ شکست کھا چکے ہو، اب دوبارہ اسی مقام پہ لڑنا فوجی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ تم لوگ اس طریقے سے کامیاب نہیں ہو گے۔ لہٰذا بہتر صورت یہی ہے کہ اپنے لشکر کو ایسے مقام پر لے آؤ کہ مخالف لشکر کے عقب میں آپ کا لشکر مقیم ہو جائے۔ اس صورت میں پھر دشمن پہل کرنے پہ مجبور ہو گا۔ جب مخالف لشکر پہلے حملہ کر دے تو پھر اس کا مقابلہ کرو

انشاء اللہ فتح آپ کی ہوگی۔ اب خدا کی قدرت دیکھیئے کہ تین چار مرتبہ وزیر نے میری ہدایات کے برعکس اسی "سورہا" کے مقام پر لڑنے کا ارادہ کیا۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے پھر ان کا ارادہ بدل جاتا۔ آخرکار انہوں نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے لشکر کو گھما کر ایسے مقام پر لے آئے کہ مخالف لشکر کے عقب میں مقیم ہوگئے۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی کہ اسی راستے سے وادی چملہ میں مقیم دشمن لشکر کو راشن پہنچتا تھا۔ لہٰذا مخالف لشکر نے مجبور ہوکر ہمارے لشکر پر حملہ کر دیا۔ لڑائی شروع ہو گئی، تو نواب امب کے لشکر کو ایسی شکست دی گئی کہ وادیٔ چملہ اور خدوخیل کا تمام علاقہ چھوڑ کر نوابی لشکر واپس بھاگ گیا۔ وادی چملہ اور خدوخیل کے علاقوں میں قلعے اور تحصیل بنوائے گئے۔ پھر قلعوں میں ملازمین اور تحصیلوں میں تحصیلدار اور عملہ مقرر کیا گیا۔ جب یہ سارے انتظامات مکمل ہو گئے تو ہمارا فاتح لشکر بونیر سے واپس سوات آگیا۔ بونیر کی طرف سے حملہ کرنے کی جرأت نواب امب کی پھر نہ ہوسکی۔ اس لڑائی میں نواب کے لشکر کو ایسی شکست دی گئی کہ عبدالجبار شاہ کی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ بعد میں اگرچہ خفیہ شرارتیں کرتا رہا۔ لیکن اعلانیہ جرأت نہ کر سکا۔

کانا اور چکیسر کی تسخیر

علاقہ بونیر سے ہمارا لشکر واپس آ گیا۔ تو ہمیں اطلاع ملی کہ کانا اور چکیسر کے لوگوں نے نواب امب کے ساتھ پارٹی بنائی ہے۔ اور ہر وقت ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کو بہت سمجھایا کہ شرارت اور فساد سے باز آئیں۔ لیکن وہ ماننے والے کہاں تھے۔ کانا اور چکیسر کے علاقے میں صرف دو مقتدر اشخاص امیر خان اور پیر داد خان اور ان کے متعلقین ہمارے دوست تھے۔ چنانچہ مجبوراً ہم نے لشکر کشی کا ارادہ کر لیا۔ پیر داد خان سیدو میں موجود تھا۔ اس نے ہمیں یہ صلاح دی کہ کانا کے علاقے میں قلعہ جات ہیں اور تسخیر میں کٹھن ہے۔ اس کے برعکس چکیسر اگرچہ مضبوط طاقت ہے لیکن تسخیر میں آسان ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ غورباند کے راستے پہلے چکیسر پر قبضہ کیا جائے۔ چکیسر کی طاقت اگر زیادہ ہے تو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے بھی صلاح دوست پر عمل کرتے ہوئے تسخیر کانا کا نام لے کر لشکر روانہ کر دیا۔ تاکہ لوگ اس مغالطے میں رہیں کہ ہمارا لشکر گویا بطرف کانا جا رہا ہے غورباند کے راستے سے ہوتا ہوا ہمارا لشکر چکیسر میں نمودار ہو گیا۔ تو وہ لوگ حیران رہ گئے۔ انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ لہٰذا چکیسر جیسے اہم مقام کو ہمارے

لشکر نے ذرا" فتح کر لیا۔ چکیسر میں قلعے بنوا کر ہمارا لشکر کانا کی طرف بڑھ گیا۔ پھر "کانا" کا علاقہ بھی فتح ہو گیا۔ چکیسر کے مقابلے میں اگرچہ "کانا" کو فتح کرنے میں دیر لگی، لیکن پھر بھی خلاف توقع جلد فتح ہو گیا۔ کانا کا علاقہ کوہستان ابا سیند سے قریب ہے اور کوہستان ابا سیند کا علاقہ اس زمانے میں ایک مضبوط طاقت تھی۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ علاقہ کانا کا انتظام اس طریقے سے کیا جائے کہ کوہستان ابا سیند کے سرکش لوگوں کے شر سے بھی محفوظ رہے۔ اس کے لیے میں نے یہ تدبیر کی کہ امیر خان کے بیٹے کو علاقہ کانا میں علاقہ پیر خانہ کے لیے تحصیلدار اور صوبے دار مقرر کر دیا۔ ایک سو سپاہی اس نے بھرتی کر لیے۔ اس طرح کانا کے علاقے کے لیے پیر داد خان کو تحصیلدار اور اس کے بیٹے کو صوبیدار بنا کر مذکورہ علاقے کا نظم و نسق ان کے سپرد کر دیا۔ یہ انتظام تسلی بخش تھا۔ کیونکہ کوہستانی علاقے میں بھی ان لوگوں کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ میں خود ستائی یا اپنی تعریف آپ کرنے کو بہت بُرا سمجھتا ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زمانے میں ان لڑائیوں کے ساتھ ساتھ میری کامیاب سیاست ہی ہماری کامیابی کا باعث رہی ہے۔ ہر علاقے میں اس قسم کے مقتدر افراد کے ساتھ تعلقات دوستانہ قائم کرتا تھا۔ کہ ان کے ذریعے کام نکل سکتا تھا۔ میرے خیال میں افراد کا صحیح انتخاب اور پھر ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے کام لینا یہ بھی ایک کامیاب سیاست ہے۔ حکمران کے لیئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اپنے گرد و پیش اور اپنے حلقہ تعلقات میں صحیح قسم کے وفادار بھی عموماً بد اندیش اور عیاش ہم نشینوں کے اثر میں آ کر اکثر بہک جاتے ہیں اس لیے ابتدا ہی سے میری کوشش یہ رہی ہے کہ ہر علاقے میں اپنے دوستانہ تعلقات کے لیے ایسے افراد کو منتخب کرتا رہا۔ جن کے متعلق مجھے یہ بھروسہ ہوتا کہ وہ مخلص اور اعتدال پسند ذہنیت کے لیے وفادار ہیں کہ اپنی ذات

کی بھلائی اور مفاد کے ساتھ ساتھ دوسروں یعنی عامۃ الناس کی بھلائی اور مفاد پر بھی خفا نہیں ہوتے، اس قسم کے مخلص اور باشعور احباب اور افراد کی مخلصانہ رائے کا میں نے ہمیشہ احترام کیا ہے۔ اور اگر کبھی ایسا موقعہ بھی پیش آیا ہے، کہ ان کی صلاح یا رائے مفید ثابت ہونے والی نہیں ہوتی تھی۔ تو میں نے ہمیشہ ان کو نرمی کے ساتھ تمام نیچ اونچ سے آگاہ کیا ہے اور استدلال سے قائل کیا ہے۔ اس صورت میں وہ لوگ بھی نہایت خندہ پیشانی اور خلوص دل سے قائل ہو جاتے حقیقت یہ ہے کہ اپنے مخلص اور وفادار ورکروں اور دوستوں کا احترام نہ کرنا، یا ان کی خوشی کو ملحوظ نہ رکھا۔ نہ تو آئین حکمرانی کا تقاضہ ہوتا ہے۔ اور نہ ہی آئین انسانیت کا۔ مختلف محاذوں اور مختلف علاقوں میں ہماری کامیابی کی ایک وجہ دوسرے تمام وجوہات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتی تھی۔ کہ ہر علاقے میں ایک یا دو صاحب اقتدار مخلص دوست بھی میرے ہوا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سچے اور وفادار دوستوں کی موجودگی ایک سرمایۂ عظیم ہے۔

ملکی انتظامات

مواصلات، شاہراہیں، سڑکیں وغیرہ

جنگی مہمات سے جب بھی ہمیں فرصت ملتی تھی تو ریاست کے نظم و نسق اور انتظامات کی طرف توجہ دینا ہی میرا اولین کام تھا۔ میں بتلا چکا ہوں کہ سوات میں سڑکیں تو کجا راستے ہی نہیں تھے

> سب سے اول تو اندرون ریاست تمام علاقوں میں ہم نے باربرداری کے لیے راستے اور شاہراہیں بنوائیں۔ اسی طریقے سے ایک گاؤں کو دوسرے گاؤں سے ملا دیا۔ اور پھر ہر علاقے کے دیہات کو اس علاقے کے مرکزی قصبے کے ساتھ ملا دیا اور شاہراہوں کے ذریعے ملحق کیا گیا۔ سوات میں پہلی بار لوگوں نے راستوں پر چلنا شروع کیا۔ خچروں اور گھوڑوں کی باربرداری میں آسانیاں پیدا ہو گئیں جابجا سڑکیں بنوائیں۔ سیدو سے مالاکنڈ تک ایک جرنیلی سڑک ہم نے بنوائی۔ تاکہ ریاست میں موٹر لاریوں کی آمد و رفت شروع ہو۔

سڑکوں اور شاہراہوں کے مکمل ہونے کے بعد ٹیلی فون لائن کا سلسلہ شروع کیا۔ تو ریاست کے طول و عرض میں ہر تلعے اور ہر تحصیل تک ٹیلی فون لائن پہنچائی گئی۔ اور یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس عرصہ میں تمام ریاستی علاقوں میں تقریباً ہر علاقے

میں ایک تحصیل اور ہر اہم گاؤں یا ہر قصبے میں ایک ایک قلعہ بنوا چکے تھے۔ ہر ایک قلعے میں سپاہی ہوتے تھے۔ ان کا کمانڈر ایک صوبیدار ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر تحصیل میں ایک تحصیل دار مع سٹاف ہوتا تھا۔ قلعہ جات کے صوبیداروں کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ

> علاقہ میں امن و امان قائم رکھیں۔ اس ماحول میں ان قلعوں کی مثال وہی تھی جو کہ انگریزی علاقوں میں پولیس سٹیشنوں کی تھی۔ البتہ اس قبائلی اور جنگی ماحول میں یہ "قلعے" ملکی ڈیفنس کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی ان کی اہمیت زیادہ تھی۔ مرکز سیدو شریف کے ساتھ ٹیلی فون لائن کے ذریعے ہر قصبے ہر گاؤں اور تمام قلعوں اور تحصیلوں کو ملحق کیا گیا۔ اب ہر علاقے کے حالات سے ہم فوراً واقف ہو سکتے تھے۔ امن و امان کی طرف میری توجہ زیادہ مبذول رہی۔

میرے خیال میں کسی بھی ریاست کے شہریوں کے لیے اولین ضرورت امن کی ہوتی ہے۔ اور وہی حکومت اچھی ہے کہ جو اپنے شہریوں کو پرامن زندگی گذارنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ تاکہ کوئی بھی شخص جرائم پیشہ افراد کے بہیمانہ کارناموں سے محفوظ رہے۔ کسی ریاست کی ترقی کے لیے اندرونی امن و امان از حد ضروری ہوتا ہے۔ جب کوئی حکمران یا حکومت اپنے شہریوں کے مال و جان کی حفاظت ہی نہ کر سکے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ حکمران حکومت کے اہم بنیادی فرائض کو صحیح طریقے سے بجا لانے میں غفلت سے کام لے رہا ہے۔ انسان کا انسان کو قتل کرنا انتہائی سنگین جرم ہے۔ اور میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ریاست میں مکمل امن و امان رہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے عہد حکومت میں میں اس فرض کی بجا آوری سے ایک

لمحہ بھی غافل نہیں رہا ہوں۔

کوہستان ایک مضبوط طاقت

ریاست سوات کے مشرق میں شمالاً جنوباً بلند و بالا پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے ان پہاڑوں کے درمیان دروں، وادیوں اور پہاڑوں میں ایک جفاکش قوم آباد ہے۔ جن کی زبان تہذیب پٹھانوں سے جداگانہ ہے۔ عرصہ قدیم سے یہ لوگ ان کوہستانوں میں آباد چلے آرہے ہیں۔ ان کی زبان چترال کی کھوداری زبان سے ملتی جلتی ہے کوہستانی بہ نسبت سواتیوں کے زیادہ قوی ہیکل اور جفاکش ہوتے ہیں۔ کوہستان کا علاقہ اگرچہ خود مختار علاقہ تھا۔ اور اس زمانے میں کوہستان کی حیثیت ایک مضبوط طاقت کی تھی۔ میرے خیال میں بدھ کے زمانے سے پیشتر ممکن ہے کہ کوہستان کا مذکورہ علاقہ بھی کسی حکومت میں شامل رہا ہو۔ لیکن زمانہ بدھ سے لے کر ریاست سوات کے قیام تک مسلسل کوہستان کا علاقہ آزاد چلا آرہا ہے۔ باوجود آزاد اور خود مختار علاقہ ہونے کے بھی کوہستانی لوگ باقاعدہ ایک منظم اور متحد قسم کی زندگی ایک پنچائتی نظام کے تحت گذارتے تھے۔ کوہستان میں "پٹن" ایک قصبہ ہے اسی پٹن کو صدر مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی پٹن میں کوہستانی پنچایت کے اعلےٰ اراکین رہتے تھے۔ اور اسی پنچایت اعلےٰ کے احکام سارے کوہستان میں نافذ ہوا کرتے تھے۔ یہ ایک خاص قسم کی جمہوری تنظیم بھی کہلائی جاسکتی تھی۔ اس پنچایت کی سپریم کمان کے تحت کوہستان کی بارہ ہزار فوج تھی۔ میں کہہ چکا ہوں کہ کوہستانی سخت قسم کے جفاکش لوگ ہیں اس لیے کوہستان کی تسخیر اگر ناممکن نہیں تھی تو مشکل ضرور تھی۔ کوہستانی طاقت سے ہماری نوزائیدہ ریاست کو خطرے کا احتمال ہر وقت تھا۔ لیکن کوہستانیوں کی دلجوئی کے لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ علاقہ قدکانا جو کہ کوہستان سے ملحق اور نزدیکی علاقہ ہے اسی

علاقہ کانا کے اکابرین کے ذریعے کوہستانی لوگوں کو یہ تسلی دلاتا رہا کہ حکومت سوات سے انہیں کسی قسم کا خطرہ یا خوف نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہر قسم کے خدشات انہیں دلوں سے نکالنے چاہئیں کیونکہ ہم نے یہ تہیہ کیا ہوا ہے کہ جب تک کوہستان کے لوگ خود رضاکارانہ طریقے سے حکومت سوات میں شامل ہونے کے لیے درخواست نہ کریں۔ اور یا کوہستانی لشکر ہماری حدود میں مجرمانہ مداخلت نہ کرے۔ اس وقت تک کوہستان کے ساتھ ہم کسی قسم کا تعرض نہیں کریں گے۔ لہذا کوہستان کے لوگوں کو ریاست سوات سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیئے۔

چنانچہ اس پالیسی سے ہم کوہستانی طاقت کی شر سے اپنے آپ کو بچاتے رہے اگرچہ ہم جانتے تھے کہ کوہستانی کچھ ایسے اُجڈ لوگ ہیں کہ دوسروں کے بہکانے سے فوراً بہک جاتے تھے۔ اور کوہستانی طاقت ایک خطرے کی صورت میں ہر وقت ہمارے سروں پر منڈلاتی رہے گی۔ بایں ہمہ فی الحال کوہستانی لشکر سے الجھنے کے لیے ہم بھی تیار نہیں تھے۔ لہذا اسی طرح سلسلہ چلتا رہا

"دریبش" مستقل دوامی تقسیم اراضی کا منصوبہ

اور اُسے نافذ العمل کرانا، ۱۹۲۵ء

چودھویں صدی میں جب یوسف زئی پٹھان علاقہ سوات پر قابض ہوئے تو اُس وقت کے مدبر شیخ ملی نے تقسیم اراضی کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ جو کہ قلم بند ہو کر دفتر شیخ ملی کے نام سے مشہور ہے۔ چنانچہ اسی منصوبے کے مطابق سوات کے مختلف علاقوں میں تقسیم اراضی ہوتی رہی۔ چکیسر اور بونیر میں بھی یہی منصوبہ نافذ العمل رہا۔ چنانچہ چودھویں صدی سے لے کر ۱۹۲۴ء تک سوات میں تقسیم اراضی کا یہی منصوبہ جاری رہا۔ اس منصوبے کے تحت تقسیم کا عجیب طریقہ تھا۔ جو کہ عارضی قسم کا تھا۔ اس میں مستقل حقوق ملکیت کسی کو حاصل نہیں ہوتے۔ دستور یہ تھا کہ مثلاً

> شہر مینگورہ معہ اراضیات و پہاڑوں کے دس سال کے لیے یوسف زئی قبیلے کی شاخ بابوزئی کی ایک شاخ کے قبضے میں ہوتا تھا۔ تو دس سال کے بعد دوبارہ تقسیم کے لیے قرعہ اندازی ہوتی تھی۔ پھر جس شاخ کے نام قرعہ نکلتا وہی قابض ہو جاتے۔ اور سابقہ قابضین دوسرے علاقے میں آباد ہو جاتے تھے۔ اس طرح سوات کے مختلف علاقوں میں عارضی تقسیم کا یہ

سلسلہ جاری تھا۔ تقسیم کی میعاد اگر کسی علاقے میں دس سال تھی تو کسی میں سات اور کسی علاقے میں پانچ سال تھی۔

واضح رہے کہ یہ تقسیم مختلف خطوں میں آباد مختلف شاخوں میں ان کی ذیلی شاخوں کے مابین ہوا کرتی تھی۔ مثلاً علاقہ بابوزئی کے دیہات میں آباد بابوزئی کی مختلف شاخوں میں خاندانی برادریوں کے مابین یہ تقسیم بذریعہ قرعہ اندازی ہوا کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ چودھویں صدی میں جب کہ یوسف زئی کابل چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور پھر یوسف زئی کے ہاتھوں سواتی پٹھان سوات سے بے دخل ہوئے۔ اس عہد کے ہنگامی حالات کے مطابق تو یہ شیخ ملی کا منصوبہ مفید تھا۔ لیکن بعد میں یوسف زئی قبیلے کی سوات میں دوامی آبادکاری کے بعد پھر کوئی صاحب دماغ مجتہد اس قسم کا پیدا نہ ہو سکا۔ جو کہ اس تکلیف دہ اور خانہ بدوشانہ منصوبے کو بدلا کر مستقل ملکیت کا کوئی منصوبہ نافذ کراتا۔

چنانچہ چودھویں صدی سے ۱۹۲۶ء تک سوات کے یوسف زئی پٹھان یہ خانہ بدوشی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس عارضی تقسیم اور خانہ بدوش عسر میں شہروں اور دیہاتوں کی وسعت یا رنگینی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ زندگی کی نعمتوں سے محروم تھے۔ یہی عارضی تقسیم کا سلسلہ اس دیس کی زراعت، تجارت، دستکاری اور دوسری ترقیوں کی راہ میں ایک ایسی رکاوٹ تھی کہ جس کا علاج کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ جن کے ہاں کچھ نہ کچھ دولت تھی وہ بھی مجبور تھے کہ ٹوٹے پھوٹے کچے مکانوں میں زندگی بسر کریں۔ اچھے مکانات محض اس خوف سے نہیں بنوا سکتے تھے کہ شاید دس یا پانچ سال کے بعد اگلی تقسیم میں انہیں یہ گاؤں چھوڑنا پڑے کہ جس میں وہ رہتے ہیں۔ جب کسی مکان یا زمین کے متعلق ملکیت کا تصور ہی معدوم ہو۔

تو اسے ترقی اور خوبصورتی کس دل سے دی جائے۔ زراعت کمزور تھی تو تجارت برائے نام تھی۔ غرضیکہ اس عارضی تقسیم کی وجہ سے ان لوگوں کی زندگی ایک دردناک عذاب کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ میرے دل میں تقسیم کا یہ عارضی اور فرسودہ تکلیف بخش سلسلہ اس وطن میں ایک کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا۔ اور میں سوچتا تھا کہ ان لوگوں کو جن کی مثال ذہنی اور شعوری لحاظ سے ایک نافہم بچے کی طرح ہے۔ اس عذاب سے نجات دلانا از بس ضروری ہے۔ اور شاید ان کی مجرمانہ اور وحشیانہ ذہنیت کا باعث بھی یہی عارضی تقسیم کا فرسودہ طریقہ ہے۔ یہاں پر ایک اور حقیقت بھی بیان کروں گا۔ سوات کا علاقہ بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان ایک مخصوص علاقہ ہے۔ مالاکنڈ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر جب کوئی اجنبی مسافر جوں جوں نیچے کی طرف آتا ہے غالباً یہی محسوس کرے گا کہ وہ بھی کوئی کولمبس ہے۔ جو ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہا ہے ہو سکتا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں جب کہ رسل و رسائل اور آمد و رفت کے ایسے ذرائع موجود ہیں کہ گھنٹوں میں گھنٹوں میں کوئی شخص راولپنڈی یا پشاور سے سوات کے آخری سرحدی قصبہ بحرین تک پہنچ سکتا ہے۔ اور سوات کیلئے سیاحوں کی آمد و رفت بہت زیادہ ہے۔ اور پھر پاکستان بننے کے بعد ہم میں ایک خاص قسم کی اپنائیت کے جذبات بھی بیدار ہو چکے ہیں۔ کوئی اجنبی خود کو کولمبس نہ سمجھے۔ لیکن آج سے چالیس سال پیشتر تو یہی حالت تھی کہ سوات کا یہ محدود خطہ باقی دنیا سے کٹا ہوا اور لاتعلق تھا۔ لہٰذا اس کٹے ہوئے لاتعلق ماحول میں بسنے والوں کی ذہنیت بھی ایک جداگانہ ذہنیت اختیار کر چکی تھی۔ ان لوگوں کے رسم و رواج۔ ان کی عادات، ان کی تہذیب نے دوسرے پٹھان قبائل سے بھی مختلف صورت اختیار کر گئی تھی۔ اس لیے کہ پٹھان قبائل کے ساتھ ان لوگوں کے میل جول اور قومی تعلقات کا سلسلہ صدیوں سے ختم ہو چکا ہے۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ دوسری قوموں کے افراد کا تو ذکر چھوڑیئے۔ اسی پٹھان قوم کے دوسرے قبائل مثلاً "خٹک، شنواری، بنوچی یا افریدی" قبیلوں کے صاحب شعور افراد بھی سوات میں جب سوات کے یوسف زئی قبیلے کے پٹھانوں کو اخلاقی تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے مختلف پاتے تو اظہار تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے جب مختلف قبیلوں کے افراد کے مابین میل جول زیادہ ہو۔ آزادانہ آمد و رفت آپس میں زیادہ ہو تو تب اس قوم کے قبیلوں کی تہذیب مشترک قسم کی یک رنگی اختیار کرتی ہے۔ اور ان کے درمیان محبت اور یگانگت بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن پہاڑوں کے درمیان ایک محصور اور کٹے ہوئے ماحول میں رہنے کی وجہ سے ان لوگوں کی ذہنیت اور تہذیب ایک مختلف قسم کی جداگانہ شکل اختیار کر گئی۔ اسی طرح پھر سوات کے اندر بونیر اور غور بند کے محصور علاقوں میں بسنے والے پٹھان جو اسی یوسف زئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن وادیٔ سوات میں بسنے والے پٹھانوں سے خود کو علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ اور سوات والے بھی ان کو غیر ہی سمجھتے تھے۔ اس جداگانہ ذہنیت اور جداگانہ وحشی مزاج ہونے کا سلسلہ تو اب تک موجود ہے۔

اگرچہ آج سے چالیس سال پیشتر بہت زیادہ تھا۔ صدیوں کی بنی ہوئی ذہنیت کو بدلتے بدلتے بھی کچھ عرصہ تو لگے گا۔ لہٰذا ایسے حالات میں حکمران سوات کی ذمہ داریاں اس ماحول میں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ جس کا مجھے احساس ہمیشہ رہا ہے۔ جنگی معاملات سے جب مجھے فرصت ملی تو میں نے فوراً عارضی تقسیم کے تکلیف دہ سلسلے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا اور مستقل دوامی تقسیم اراضیات کا منصوبہ ناقذ کر دیا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل کام تھا۔ اس لیے کہ میرے پاس نہ تو ماہرین کا کوئی عملہ تھا اور نہ ہی کوئی دوسرے ذرائع تھے۔ بہرصورت جو کچھ بھی تھا مختلف علاقوں میں براہ راست میری ذاتی نگرانی اور ہدایات کے تحت تقسیم کا کام شروع ہو گیا۔ اب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی ایسے

خطۂ زمین میں جہاں پہلے سے مالیات اور اراضیات کی تقسیم کے لیے نہ تو خاص طریقہ رائج ہو اور نہ ہی اس کے ماہرین موجود ہوں۔ مستقل تقسیم اراضی کے عظیم منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا کام کس قدر دشوار ہوگا۔ جب کہ ماحول بھی ایسا ہو کہ جس میں ایک "مرلہ" زمین پر بھی نوبت خون خرابے تک پہنچ جاتی ہے اس قسم کے ماحول میں منصفانہ طریقے سے اراضیات کو مطمئن کرنا کہ کسی بھی فرد کے حصے میں نہ تو ساری زرخیز زمین آئے اور نہ ساری خراب زمین آئے بلکہ سب کچھ اسے بحصۂ مساوی ملے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے نہ تو میرے پاس پٹواری تھے اور نہ پٹوار خانے تھے۔ اور نہ کوئی خاص محکمۂ مال تھا بس یہاں تو یہ سب ذمہ داریاں میرے ہی ذہن و فکر پر تھیں۔ اور ان سب فرائض کو بطریق احسن انجام دینے کے لیے تنہا میرے دل و دماغ ذمہ دار تھے۔ پیمائش کے لیے ہمارے پاس خاص آلات بھی نہیں تھے۔ چنانچہ یہ کہنا حقیقت کا اظہار ہے کہ ریاست سوات کے ہر علاقے میں تقسیم اراضیات میں ہم نے اپنی ذہانت اور صلاحیتوں سے ہی کام لیا ہے۔ اس سلسلے میں بذات خود مجھے زیادہ صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ پیدل منزلیں۔ رات کو بغیر بستر کے پتھریلی زمین پر سونا۔ لوگوں کو سمجھانا اور مسلسل تقریریں اور جرگہ بازیاں دوامی تقسیم کے فوائد سے ان لوگوں کو آگاہ کرنا اور خوشگوار روشن مستقبل کی توقعات دلانا۔ اس غرض کے لیے ہر علاقے میں گاؤں گاؤں پیدل دورے کرنا۔ اس ضمن میں لوگوں کی شکایات سننا اور ان کا ازالہ کرنا یہ سب میرے فرائض تھے۔ جن کی بجا آوری کے لیے میں دن اور رات ایک کیے ہوئے ہر علاقے میں پیدل دورے کرتا تھا۔

پانچ سال کے عرصے میں ہم نے مختلف علاقوں میں تقسیم اراضی کے دوامی منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ اس میں شک نہیں کہ دوامی تقسیم کا منصوبہ حکومت سوات کے قیام کے بعد جنگی مہمات سے بھی زیادہ دشوار منصوبہ تھا۔ اس لیے کہ اس میں دلوں کی رنجش اور ناراضگی بھی مدنظر ہوتی تھی۔ لیکن خداوند پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے

کہ ہم اس عظیم اور دشوار منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گئے ہم نے خلوص دل سے ان لوگوں اور اس دیس کی ترقی کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا تھا جو کہ آخر کار صدہا صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ حکومت نوزائیدہ تھی انگریزوں کے ساتھ خاص مراسم نہیں تھے۔ رعیت کے لوگوں کو ہر حالت میں خوش رکھنا ضروری تھا۔ رعیت کے افراد کی مثال تو بچوں جیسی ہوتی ہے۔ کہ والدین تو ان کی بھلائی اور بہبودی چاہتے ہیں لیکن انہیں پھر بھی بعض پابندیاں شاق گذرتی ہیں لیکن ان تمام امورات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے سمات بونیر، چکیسر وغیرہ علاقوں میں لوگوں کو خانہ بدوشی سے نجات دلا کر زندگی کی سہولتوں اور جدوجہد کے لطف سے ہمکنار کروا کر ہی دم لیا۔ اس کے بعد تعمیرات، زراعت، تجارت اور گھریلو دست کاریوں کی ترقی کے دروازے کھل گئے۔

انگریزوں کے ساتھ تعلقات

اب تک انگریزوں نے ہماری ریاست اور میری حکومت تسلیم نہیں کی تھی وجہ یہ تھی کہ انگریز لوگ ہمیں خاندانی دشمن سمجھتے تھے۔ لہذا ہمارے دشمنوں کی حمایت کرتے تھے۔ انہیں ہر قسم کی امداد بھی دیتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم اسلحہ بارود وغیرہ کے لیے لائسنس مانگتے تھے تو ہمیں نہیں دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے

ہمیں کافی مشکلات اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ ریاست سوات کے مفاد اور استحکام کا تقاضا یہی ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے انگریزوں کے ساتھ تعلقات استوار کیے جائیں۔ میں نے جدوجہد شروع کی۔ انگریز افسروں کو شیر اور شکار کے لیے مدعو کرنا شروع کیا۔ جب بھی ہندوستان کی برطانوی حکومت کے افسر سیر و شکار کے لیے ریاست میں آئے تو ہمارے اغراض و مقاصد اور تعمیری منصوبوں سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ رابطہ قائم کرنے کا کام اگرچہ مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ لہٰذا میں کوشش کرتا رہا۔ میرے "دادا" صاحب سوات اور میرے والد اور خود میں نے کم عمری میں انگریزوں کے برخلاف جہادوں میں حصہ لیا تھا۔ لہٰذا انگریز لوگ ہمارے متعلق ہر وقت شاکی رہتے تھے۔ مسلسل جدوجہد اور کوششوں کے بعد اگر تعلقات کچھ خوشگوار صورت اختیار کرنے کے قریب بھی ہو جاتے تو ہمارا کوئی دشمن پھر انگریزوں کو ہمارے برخلاف بھڑکا لیتا۔ کہ یہ لوگ تو آپ کے خاندانی دشمن ہیں۔ ان پر بھروسہ نہ کیجئے۔ اس طرح خاندانی دشمن کا یہ ایک فقرا ہی ہمارے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا۔ تاہم ان سب واقعات اور مشکلات کے باوجود میں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اور آخرکار اپنے مضبوط عزائم اور خدائی امداد کے طفیل میں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گیا۔ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اور وہ لوگ ہمارے مصلحانہ عزائم اور تعمیری پروگرام سے واقف ہو گئے انہیں اس حقیقت سے آگاہی ہو گئی کہ سوات میں ہماری جدوجہد صرف ریاست سوات اور ریاستی عوام کے خوشگوار مستقبل کے لیے ہے۔ کسی کے برخلاف بھی ہم مخالفانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اپنی اصلاح اور اپنی ترقی کے لیے کر رہے ہیں۔ اور ہماری انتہائی خواہش یہی ہے کہ ہماری ریاست امن اور

سکون کا ایک گہوارہ بن جائے۔

ہم نے انگریزوں پر واضح کر دیا کہ ہم شر کو ہرگز پسند نہیں کرتے اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ شر کا نتیجہ شر ہے۔ اگر دوسرے ہمیں نہ چھیڑیں تو ہم قطعاً کسی کے ساتھ الجھنا نہیں چاہتے ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بس اپنی حالت سنواریں۔ اور ترقی کریں۔ پُر امن زندگی گزاریں۔ ہم زندگی کے بلند نصب العین اور اعلےٰ مقاصد کو آپس میں کشت و خون اور جنگ و جدل کے ہنگاموں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ اپنی حدود کے اندر آزادانہ اور پرسکون زندگی بسر کرنا ہی ہمارا مطمح نظر ہے۔ چنانچہ انگریز بھی ہمارے ان عزائم اور خواہشات سے واقف ہو گئے۔

انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرتے ہوئے ہم نے قطعاً ایسا رویہ بھی اختیار نہیں کیا کہ جس سے ہمارا قومی وقار اور خاندانی ناموس مجروح ہو۔ البتہ ان کو اس طرح اپنا دوست بنایا کہ باہمی میل جول اور تعلقات کے دوران میں وہ لوگ خود ہی ہمارے خلوص اور اخلاق کے قائل ہوتے گئے۔ انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہماری پوزیشن دوسرے راجوں اور نوابوں سے مختلف ہے۔ تاہم ابھی تک باقاعدہ قانونی طور سے ریاست سوات کو تسلیم کرنے کا اعلان انگریزی حکومت کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔

ولی عہد کا تقرر

میں ۱۹۲۴ء میں اور اس سے پہلے بالکل تنہا کام کرتا تھا۔ میرا بھائی شہید ہو چکا تھا۔ میرے بھائی کا بیٹا بھی کمسن تھا خود میرے بیٹے بھی کمسن تھے۔

اکثر مقدمات اور دوسرے معاملات کے فیصلوں کے سلسلے میں میں مرکز سے باہر رہا کرتا تھا۔ اور پیدل سفر کرتا تھا۔ دشوار گذار پہاڑی علاقوں کا سفر بھی مجھے پیدل

ہی کرنا پڑتا تھا۔ اندرون ریاست ابھی مکمل امن و امان قائم بھی نہیں ہوا تھا۔ ریاست سے باہر کئی جابر قوتیں میری دشمن تھیں۔ ریاست کے اندر بھی کچھ لوگ دشمن تھے۔ میرے خلاف جرگے ہوتے تھے۔ بعض لوگ اعلانیہ میرے دشمن افراد سے مجھے قتل کرنے کا معاوضہ ہزاروں روپیہ طلب کرتے تھے۔ ان حالات میں قدم قدم پر زندگی خطرے میں تھی لیکن بایں ہمہ محض موت کے خوف سے میں کبھی اپنے فرائض اور ارادوں کی تکمیل سے غافل نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس قدر تفکر کہ میرے ساتھ فکر ہوتا تھا۔ وجہ یہ تھی اندرون ریاست اس ماحول میں لوگ قابل اعتماد نہیں تھے۔ دوست اور دشمن میں امتیاز کرنا اس ماحول میں بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

لہٰذا خطرات تھے میرے بڑے بیٹے "جہان زیب" کی عمر ۱۹۲۴ء میں پندرہ سال کی تھی۔ اور پندرہ سال کی عمر میں ہی اس نے میٹرک پاس کر لیا۔ دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد میں نے جہان زیب کو ہی اپنا ولی عہد مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ریاست کے عمائدین اور نمائندہ سرکردہ افراد کا میں نے ایک اجلاس طلب کیا اور اسی اجلاس میں ہی میں نے جہان زیب کو ولی عہد مقرر کرنے کی تجویز پیش کی۔ جسے تمام عمائدین اجلاس نے متفقہ طور سے تسلیم کی۔ چنانچہ اسی اجلاس میں ہی جہان زیب کو ولی عہد تسلیم کر لیا گیا۔ اور ولی عہدی کی رسم دستار بندی بھی ساتھ ادا ہوئی۔

انگریزوں نے چونکہ ابھی تک اعلانیہ قانونی طور سے میری حکومت تسلیم نہیں کی تھی لہٰذا ولی عہدی کے تسلیم کرنے کا سوال بھی پیدا نہ ہوا۔

اس کے بعد جب کہ میں نے اپنا ولی عہد بھی مقرر کر لیا تو زیادہ دل جمعی سے کام کرتا رہا۔ کیوں کہ اب مجھے یہ تسلی ہو گئی کہ میرا پروگرام انشاء اللہ ادھورا نہیں رہے گا۔

۱۹۲۶ء میں انگریزی حکومت کا

ریاست سوات کو تسلیم کرنا

مارچ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ریاست سوات کو تسلیم کر کے مجھے حکمران سوات تسلیم کیا۔ ۳ مئی ۱۹۲۶ء کو چیف کمشنر صوبہ سرحد مسٹر کین نے سوات آکر سیدو شریف میں ایک عام دربار منعقد کر کے حکومت ہند کا وہ قانونی فرمان پڑھ کر سنایا کہ جس کی رو سے مجھے فرمانروائے سوات تسلیم کیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ولی عہد کو بھی تسلیم کیا گیا۔ دشمن ٹھنڈے پڑ گئے۔

تسخیر کوہستان

وقت آگیا کہ اب کوہستان کی گوشمالی کی جائے۔ کوہستان ایک مضبوط طاقت تھی۔ لیکن کوہستان کے لوگ شرارتی تھے۔ کوہستانی علاقوں سے اتر کر ریاستی علاقوں میں ڈاکے ڈالتے تھے۔ ہمارے دشمنوں کو کوہستانی علاقوں میں پناہ دیتے تھے۔ نیز ہمارے بیرونی دشمنوں کے ساتھ بھی ساز باز رکھتے تھے۔ ہم نے کوہستانیوں کو بہت سمجھایا اور ان شرارتوں سے منع کیا۔ لیکن وہ لوگ باز نہ آئے۔ اس دوران میں کوہستان کے درۂ بشام اور درۂ کڑ تنگ، دونوں دروں کے لوگ ہمارے پاس آئے اور اپنے علاقوں کو حکومت سوات میں شامل کرانے کی استدعا کی۔ یہ دونوں درے علاقہ

"کانا" کے متصل ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان کی درخواست منظور کی۔ اس پر تمام کوہستان کے لوگ مخالفت پر اتر آئے۔ اس لیے ہمیں فوجی کاروائی کرنی پڑی۔ اس لشکر کشی میں اگرچہ ہمیں کافی نقصان اٹھانا پڑا لیکن آخر کار ہم نے درۂ بشام اور درۂ کڑمنگ کو ریاست سوات میں شامل کر دیا۔ جن دنوں ہمارا لشکر سپہ سالار کی سرکردگی میں کوہستانی علاقے میں مقیم تھا تو صورت حال یہ تھی کہ بالمقابل ہی مخالف کوہستانی لشکر پڑا ہوا تھا۔ لیکن یہ دونوں لشکر بے کار پڑے تھے۔ لڑائی شروع نہیں کرتے تھے۔ میں نے اپنے سپہ سالار کو خط لکھا کہ

"میں تمہیں حکم نہیں دیتا۔ البتہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ لوگ کوہستانی لشکر کو باتوں میں لگا کر اپنی جانب سے غافل کرا دیں۔ اور پھر بے خبری میں ایک ناگہانی حملہ ان پر کر دیں۔ تو کام بن جائے گا۔"

سپہ سالار نے جواباً لکھا کہ

"اس تجویز پر عمل کرنا ناممکن ہے کیونکہ کوہستان کا محاذ دوسرے محاذوں سے مختلف ہے۔ یہاں بڑے بڑے اونچے پہاڑ ہیں۔ لہٰذا مشکلات کا سامنا ہوگا۔"

لیکن میرے لکھے ہوئے خط کو جب کچھ دن گذر گئے تو ہمارے لشکر والے بے کار پڑے ہوئے تنگ آ گئے۔ چنانچہ انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو کہ میں نے انہیں لکھا تھا۔

دراصل قصہ یہ تھا کہ ابتدا میں سپہ سالار اپنی اہمیت جتلانے کے لیے مجھے لکھ چکا تھا کہ آپ کی صلاح ناقابل عمل ہے۔ وہ اس فتح کو اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کا نتیجہ قرار دینے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ بعد میں میری تجویز پر عمل

کرتے ہوئے لڑائی شروع کی میں نے دوبارہ اپنے سپہ سالار کو لکھا کہ
"مفتوحہ علاقے میں کوہستانیوں کے دو چار گاؤں جلا دو۔ مگر
اس طریقے سے کہ کسی ذی روح کو نقصان نہ پہنچے۔ تاکہ
کوہستانی لوگ پھر کچھ عرصہ آبادکاری میں مصروف رہیں اور
ہمیں استحکام کا موقعہ مل جائے۔"

چنانچہ لشکر والوں نے ایسا ہی کیا۔ مفتوحہ علاقے میں دو چار گاؤں جلا دیئے۔ اس لڑائی میں اگرچہ ہمیں بھی کافی نقصان پہنچا۔ لیکن کوہستانیوں کو بھی کافی سے زیادہ نقصان اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار ہم کامیاب ہو گئے۔ اور کوہستان میں تین اہم مقامات کڑمنگ۔ بشام۔ لاہور میں ہم نے قلعے بنوا دیے۔

ایک مہینے کے بعد کوہستانی لشکر نے پھر لاہور کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ ہمارا لشکر فوراً روانہ ہو کر لاہور پہنچ گیا۔ کوہستانی لشکر کو شکست دے کر منتشر کر دیا۔ اب کچھ عرصہ تو وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ لیکن باوجود خاموش رہنے کے مجھے ان کے متعلق اطمینان حاصل نہیں تھا میرے ساتھ ہر وقت یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کوہستان ایک مضبوط طاقت ہے کوہستانی شرارت پسند لوگ ہیں۔ لہذا جب بھی انہیں ہمارا کوئی دشمن ابھارے گا۔ تو پھر یہ بغاوت پر آئیں گے۔ کوہستان کے دو دروں یعنی کڑمنگ، بشام، پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔

۱۹۳۱ء، وائسرائے ہند لارڈ ارون کی آمد سوات میں

انگریزوں کو اب ہمارے متعلق تسلی ہو چکی تھی اور ان کے شکوک بھی رفع ہو چکے تھے۔ میری حکومت باقاعدہ تسلیم ہو چکی تھی۔ ریاست سوات قائم ہونے کی وجہ سے انگریزی علاقوں کو بھی فائدہ پہنچا تھا۔ لہذا سرکار انگریزی کی طرف سے مجھے کے، بی، ای، (K.B.E) کا خطاب بھی ملا۔ اگرچہ مجھے خطابات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن ریاست سوات کے مفاد اور بھلائی کی خاطر انکار بھی نہ کر سکا۔ چنانچہ اس تقریب کے لیے لارڈ اروِن وائسرائے ہند سوات آئے اور سیدو شریف میں دربار منعقد کیا۔ یہ دربار ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوا۔ اور اس دربار میں صوبہ سرحد کے چیف کمشنر کے علاوہ سرحد کے دوسرے اعلےٰ افسر اور عمائدین نیز مالاکنڈ ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ اور دیر ایجنسی کے اکابرین بھی شریک تھے۔ لارڈ اروِن نے ریاست سوات کے حسن کار اور امن و امان کے متعلق خوشنودی کا اظہار کیا۔ پھر جب خطاب کا ذکر آیا۔ تو میں نے کہہ دیا کہ

مجھے قوم کی طرف سے بادشاہ کا خطاب ملا ہے۔
لہٰذا انگریزی خطاب بھی مجھے وہی منظور ہوگا۔ جو کہ
اس قومی خطاب کے وقار اور احترام سے متصادم نہ ہو۔

چنانچہ اس مناسبت کی وجہ سے انگریزی حکومت کی طرف سے حسکمران کا خطاب تجویز ہوا۔ جسے میں نے منظور کر لیا۔ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اس سلسلے میں ہم نے کبھی کسی موقع پر بھی اپنے خاندانی وقار اور اپنی روایات اور دینی غیرت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ ہم نے ان پر ثابت کر دیا کہ ہم اگر دشمن بھی ہوتے تو پھر شجاع اور فیاض دشمن ہیں۔ ہماری دوستی بھی دوستوں کے لیے ہمیشہ سود مند ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ دشمنی میں گھاٹا اور دوستی میں فائدہ ہوتا ہے۔ ہم نے انہیں دکھلا دیا کہ ہم بغیر کسی تقلید اور نقالی کے بھی ایک کامیاب حکومت بنا سکتے ہیں۔

حکمرانی کے اصول اور قوانین وضع کرنا صرف اہل مغرب ہی کا حصہ نہیں۔ بلکہ یہ مادہ ہم میں بھی موجود ہے۔ حکومت بننے سے قبل سوات کا علاقہ بدامنی اور جرائم کیلئے مشہور تھا۔ صوبہ سرحد کے جرائم پیشہ قسم کے مفرور اور ڈاکو لوگ ہمیشہ سوات میں ہی سکونت اختیار کر کے پھر انگریزی علاقوں میں یعنی ضلع مردان اور ضلع پشاور

کے علاقوں میں جاکر دہاندلی مچاتے تھے۔ ڈاکے ڈالتے تھے۔ اور لوگوں کو قتل کرتے تھے۔ سوات کے جرائم پیشہ بھی ان کے معاون ہوتے علاقہ سرکار میں بدامنی پھیلاتے تھے۔ اور اس طرح انگریزی حکومت کے لیے باعث پریشانی بنتے تھے۔ لیکن جب میں نے سوات میں حکومت بنائی تو باوجود اندرونی مشکلات اور مصروفیتوں کے اس طرف خاص توجہ کی۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنی ہی ریاست میں امن وامان قائم کیا بلکہ اس امر کا بھی سختی کے ساتھ سدباب کیا کہ سوات میں پناہ لینے والے مفرور وغیرہ انگریزی علاقوں میں جاکر جرائم یا لوٹ مار نہیں کریں گے۔ میں نے اس قسم کے افراد کو یہ ذہن نشین کرایا کہ ہم افغانی روایات کے مطابق آپ لوگوں کو پناہ دیں گے۔ لیکن پناہ دینے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہمارا وطن جرائم پیشہ اور بدکردار لوگوں کا مسکن بنے بلکہ پناہ اس شرط پر دی جائے گی کہ مجرم اپنے سابقہ مجرمانہ کردار پر نادم ہوکر بقیہ زندگی ایک شریف شہری کی حیثیت سے گزارے۔

چنانچہ سوات میں میری حکومت کے استحکام سے انگریزی سرکار کو بھی یہ فائدہ ہوا۔ سوات کی چھوٹی سی ریاست نے ہر لحاظ سے حکومت ہند کے ایک سرحدی فیاض اور شریف ہمسائے کی صورت اختیار کرلی تھی۔ یہ سب کچھ ہم نے اس وقت کیا جب کہ انگریز لوگ ہمیں اپنا خاندانی دشمن سمجھتے تھے ہماری حکومت اور ریاست کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ ہمارے دشمنوں کی طرفداری اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

ہم نے ان پر یہ ثابت کردیا کہ ہم انگریزی حکومت کے ساتھ بے شک دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ہماری پوزیشن ہندوستان کے دوسرے راجوں اور مہاراجوں سے مختلف ہے۔ اور وہ

یہ کہ دوستانہ تعلقات کے سلسلے میں ہم اپنی غیرت اور خودداری کو ہرگز ہرگز مجروح ہونے نہیں دیں گے۔ انہیں ہمارے شجاعانہ کردار اور صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ ہم نے ان پر ثابت کر دیا کہ ہماری حکومت کا قیام ہمارے علاقائی اور قومی ترقی کے لیے ہمارے پاکیزہ نصب العین۔ بلند عزائم اور نیک خواہشات کا ثبوت ہے۔ ہم اپنی ریاست کو امن و امان فراغت و سکون کا ایک گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ اور ہم قطعاً یہ نہیں چاہتے کہ غیر متعلق اور ناممکن معاملات میں اُلجھ کر اپنی ترقی اور تعمیر کے موقع ضائع کریں۔ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ریاست سوات کے علاقوں سے جرائم پیشہ لوگ جا کر انگریزی علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیں۔ اور انگریزی حکام کو پریشان کریں۔ ہم اس قسم کے ذلیل افعال کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ہم نے ہندوستان۔ کی انگریزی حکومت پر ثابت کر دیا کہ شمال مغربی سرحد پر ابھری ہوئی یہ نوزائیدہ ریاست ان کی ایک پُرامن پڑوسی ریاست ہے۔ چنانچہ یہی واقعات تھے کہ آخر کار انگریزوں نے ہماری حکومت تسلیم کی اور اس کے متعلق خوشنودی کا اظہار کیا۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۱ء تک کا عرصہ یعنی مسلسل پندرہ سال کا زمانہ تکالیف اور صعوبتوں کا زمانہ تھا۔ بیرونی دشمنوں کے ساتھ لڑائیاں۔ ریاست کی مدافعت اور ڈیفنس کو مضبوط کرنا۔ اندرون ریاست جابر سرکش اور عوام دشمن قوتوں کا مقابلہ ملکی نظم و نسق۔ قوانین کا نفاذ۔ دوامی تقسیم اراضی کا کام۔ اسلحہ کی فراہمی اور فوجی تنظیم مواصلات سڑکوں وغیرہ کی تعمیر۔ حکومت کی تشکیل اور نوزائیدہ ریاست کے خزانے کو ذاتی اثر و رسوخ سے روپیہ پیدا کر کے اور ذاتی سرمائے کے صرف کا خیال نہ کرتے ہوئے کامیاب کرانا دشمنوں کے شیطانی منصوبوں سے خبردار رہنا

غرضیکہ مسلسل پندرہ سال کا یہ عرصہ ایسا تھا کہ اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی میرے لیے آرام و فراغت کا خیال حرام تھا۔ زندگی ہر وقت خطرے میں تھی۔ سوات کے لوگوں کی وفاداری مشکوک تھی۔ انہیں اپنے مستقبل سے کوئی لگاؤ نہیں تھا پیدل مسافتیں رات کو پتھریلی زمینوں پر سونا۔ بھوک اور پیاس کی صعوبتیں غرضیکہ جسمانی مصیبت اور صعوبت میں برداشت کرتا رہا۔ ہزاروں دشواریاں حائل تھیں راستے کٹھن اور خطرناک تھے۔ لیکن ہمارے ارادے مضبوط تھے۔ ریاست سوات اور اس دیس میں بسنے والے عوام گویا ایک قافلہ تھا۔ اور اس قافلے کا مہار مضبوطی سے تھامے ہوئے بالآخر شاہراہ حیات کے اس موڑ پر پہنچانے میں بفضل یزدی کامیاب ہوگیا۔ جہاں سے ایک شاندار اور تابناک مستقبل کی منزل اب صاف نظر آرہی تھی۔

ہم کٹھن اور تاریک راہوں سے دشوار گذار پہاڑی دروں سے نکل آئے اب ہم صاف میدانی علاقے میں گویا داخل ہو چکے تھے۔ ایک خوبصورت شاہراہ پر لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان ہمارا مختصر سا قافلہ میری رہنمائی میں منزل مقصود کی طرف تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ یہ تو ۱۹۳۱ء کا زمانہ تھا۔

ہندوستان میں سیاسی تحریکوں کی جدوجہد جاری تھی۔ انگریزی حکومت کی بنیادیں یوں ہلنے لگی تھیں جیسے کسی زلزلے کے وقت ایک مضبوط اور شاندار عمارت کی بنیادیں ہلتی ہیں۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں وائسرائے ہند لارڈ اروِن جب سیدو شریف میں دربار منعقد کرنے آیا۔ تو ریاست سوات کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں

ملکی انتظامات اور طریق کار

مسلسل جنگی مہمات سے قدرے فراغت ملی تو میں نے ملکی انتظامات کیلئے

طریقے مقرر کیے:-

۱- ریاست سوات کے مختلف علاقوں کے خوانین اور معززین کیلئے میں نے انکی حیثیت کے مطابق مواجب مقرر کیے تاکہ یہ لوگ حکومت سے راضی رہیں اور وفادار بھی رہیں۔

۲- میں نے یہ طریقہ بھی اختیار کیا کہ جب کسی علاقے میں کوئی مجرم جرمانے کی سزا پالیتا تو رقم جرمانے کا ۱/۳ حصہ اس علاقے کے خان یا ملک کو دیا جاتا۔ تاکہ مجرموں کو حوالہ قانون کرنے میں خان یا ملک مجرم کی ناجائز پشت پناہی نہ کریں۔ لہٰذا مجرم کو حوالہ قانون کرنے کے ساتھ اُن کے ذاتی مفاد کو ہم نے وابستہ کر دیا۔

۳- ریاست کے مختلف علاقوں میں بزرگ خاندانوں کے افراد سید اور میانگان وغیرہ کے لیے بھی میں نے مواجب مقرر کیے تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ حکومت سوات ان کے خاندانی تقدس اور عظمت کا احترام کرتی ہے۔

۴- علمائے کرام، علمار یاست میں دو قسم کے تھے ایک تو وہ تھے جو کہ مسجدوں میں درس پڑھاتے تھے لہذا اس قسم کے مدرس علما کی میں نے تنخواہیں مقرر کیں۔ تاکہ وہ لوگ درس و تدریس کا کام زیادہ دل چسپی اور دل جمعی سے کریں۔ دوسرے وہ علما تھے جو کہ درس کا کام نہیں کرتے تھے۔ لہذا ان کو محکمہ قضا میں بھرتی کر کے ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔

محکمۂ قضا کی تنظیم

محکمہ قضا کی تنظیم ریاست سوات میں ہم نے یوں کی کہ

۱ ہر گاؤں میں ایک قاضی تنخواہ دار مقرر کیا۔ تاکہ لوگوں کو آسانی ہو۔ اور

ہر قسم کے معاملات شرعی طریقے سے اپنے گاؤں میں فیصلہ کر سکیں اور حصول انصاف کی خاطر تحصیلوں وغیرہ کی آمدورفت کی زحمت سے بچے رہیں۔ نیز عوام میں اپنی زندگی شریعت محمدیہ کے تابع بسر کرنے کا احساس بھی پیدا ہو۔

۲۔ گاؤں کے قاضی کے بعد ہر تحصیل میں ایک قاضی مقرر کیا۔ تاکہ تحصیل میں بھی اگر کوئی چاہے تو شرعی طریقے سے اپنا فیصلہ کرا سکے اور یا گاؤں کے قاضی کے فیصلے کے خلاف قاضیٔ تحصیل کی عدالت میں اپیل کر سکے۔

۳۔ ہر ضلعی صدر مقام یعنی دو تین تحصیلوں کے انچارج حاکم کے ساتھ بھی ایک قاضی مقرر کیا گیا۔ تاکہ وہاں بھی شرعی فیصلوں میں رکاوٹ نہ ہو۔ اور نیز قاضیٔ تحصیل کے برخلاف اپیل کی بھی سماعت ہو سکے۔

۴۔ صدر مقام یعنی سیدو شریف میں دارالقضا یعنی اعلےٰ شرعی عدالت قائم کی۔ شرعی عدالت کے اراکین دو فاضل علما اور ایک امیر شریعت ہوتے تھے جہاں کہ سنگین قسم کے مقدمات کے فیصلوں کے علاوہ علاقائی شرعی عدالتوں کے فیصلوں کے برخلاف اپیل بھی کی جاتی تھی۔

ہمارے قوانین

میں بتلا چکا ہوں کہ ہر علاقے کے لیے قوانین اس علاقے کے لوگوں کے منشا اور مرضی کے مطابق بنائے جاتے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ علاقہ کے لوگوں کا ایک جنرل اجلاس طلب کیا جاتا۔ پھر وہ لوگ متفقہ طور سے اپنے لیے قوانین منظور کر لیتے۔ اس قسم کے قوانین کی تحریری کاپی ہر علاقے کی تحصیل میں موجود ہوتی تھی۔ لوگوں کو اختیار تھا کہ اپنے فیصلے قانون

کے مطابق کرائیں۔ یا شریعت کے ذریعے کریں۔

عوام کے منشا کے مطابق بنائے ہوئے قوانین کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ خود ان لوگوں میں قانون کی پابند زندگی گزارنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ اس قسم کے قوانین ایک مضبوط عہد نامے کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اس معاہدے کی پابندی ریاستی لوگ بھی شوق سے کرتے تھے۔

درخواستوں کے فارم تمسکات کورٹ فیس وغیرہ

ریاست سوات کے عوام کو کورٹ فیس وغیرہ کے دھندوں سے آزاد قرار دیا گیا۔ عدالتوں میں درخواستوں اور استغاثوں کے لیے باقاعدہ چھپے ہوئے اپنے خاص فارم ہر تحصیل اور ہر عدالت کو مہیا کیے جاتے تھے۔ صدر مقام سیدو شریف کے خزانے سے یہ فارم اور تمسکات دیے جاتے تھے

ان فارموں اور تمسکات کے لیے ہم نے بطور مہر عوامی، قلعہ کی تصویر ہی نشان قرار دیا۔

اور نیز محکمے کو ریاستی نشان (جھنڈا) بھی قرار دیا گیا۔ واضح رہے کہ ریاست میں مروجہ فارموں اور تمسکات کے یہ نمونے میں نے خود ہی تجویز کیے ہیں، ہمارے سامنے انگریزی حکومت ہند کے مروجہ تمسکات کے نمونے بھی تھے لیکن ہم نے اپنے لیے یہی سادہ نمونہ پسند کیا۔ ایک آنے کے مروجہ فارم پر ہر عدالت اور ہر تحصیل میں مستغیث اپنی شکایات لکھوا کر پیش کر سکتا تھا۔ ایک سرکاری محرر بطور عرائض نویس

ہر تحصیل اور ہر عدالت میں مقرر کیا گیا تاکہ لوگوں
کی عرضیاں مفت لکھیں

ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ ریاست سوات کے عوام کو حصول انصاف یاداد رسی کے لیے کسی قسم کی مالی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور نیز عدالتی طریق کار میں بھی یہ کوشش کی کہ عوام کا وقت تاریخوں اور پیشیوں میں ضائع بھی نہ ہو۔ اور انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوں۔ ہمارے عوام غریب تھے۔ لہٰذا ہر معاملے میں عوام کی غربت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ہماری فضا اور جنگی ماحول میں قلعہ ابتدا ہی سے ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ ریاست کے بچاؤ اور استحکام میں اہم پارٹ اس قلعے نے ہی ادا کیا ہے۔ لہٰذا اس چوبرجی قلعے کو ہم نے ریاستی نشان قرار دیا۔

کچھ تعمیری کارگذاریاں

جب انگریزوں نے ہماری حکومت تسلیم کی تو ہمیں کافی اسانیاں حاصل ہوگئیں۔ لہٰذا سب سے اول تو ریاست کے مختلف علاقوں کو سڑکوں کے ذریعے ملا دیا گیا۔ واضح رہے کہ اس سے پیشتر اگر ہم سڑکوں کا ذکر کر چکے ہیں تو اس سے مراد بار برداری کی شاہراہیں تھیں۔ ہم نے قبل ازیں ریاست کے طول و عرض میں جو سڑکیں بنوائی تھیں وہ بار برداری یعنی خچروں اور گدھوں کے استعمال کے لیے تھیں۔ البتہ سیدو اور مینگورہ سے مالاکنڈ تک ایک سڑک موٹر لاریوں کے لیے بھی مخصوص بنوائی تھی۔ اب مندرجہ ذیل سڑکیں بعد میں بنیں۔

۱۔ مینگورہ سے مدین تک ایک سڑک پہنچائی۔

۲۔ مینگورہ سے پیر بابا علاقہ بونیر تک سڑک پہنچائی۔ کوہ کڑاکڑ کو کاٹ کر

بونیر تک سڑک پہنچانے کا کام اگرچہ بہت مشکل تھا لیکن خدا کے فضل و کرم سے ہم کامیاب ہو گئے

۳۔ ریاستی حدود میں پیر بابا سے مردان جانے والی سڑک بنوا کر علاقہ بونیر کو ضلع مردان سے ملا دیا۔

۴۔ تمام سڑکوں کی تعمیر کے سلسلے میں جا بجا پل بھی بنوائے گئے جن میں قابل ذکر مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مینگورہ سے ۲ میل کے فاصلے پر دریائے سوات پر لکڑی کا ایک عظیم پل بنوا کر شمالی علاقوں کو جنوبی علاقوں کے ساتھ ملا دیا گیا۔ لکڑی کا یہ عظیم الشان پل پٹھان انجینئرنگ کے اصولوں کا ایک نمونہ ہے۔ پچاس من لوڈ کے ساتھ ہر لاری اس پل پر سے گزر سکتی ہے۔

(۲) پل ڈھیری کے مقام پر دریائے سوات پر ایک پختہ آہنی پل بنوایا جس کے ذریعے شامیزئی وغیرہ علاقے پار کے علاقوں سے ملحق ہو گئے۔

(۳) اپنے عہد حکومت کے آخری ایام میں مدین کے پاس دریائے سوات پر ایک آہنی پل ہم نے بنوایا ہے۔

ان مذکورہ بالا سڑکوں اور پلوں کے علاوہ ریاست میں جو سڑکیں اور پل بنے ہیں وہ میرے جانشین فرزند جہاں زیب کی یادگار ہیں کہ اس کے عہد حکومت میں بنی ہیں۔ یہاں پر ہم نے ان برانچ لائنوں یعنی چھوٹی سڑکوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس قسم کی سڑکیں بھی ہر علاقے میں ہم نے بنوائی ہیں

کوہستان کے تین دوسرے دروں کی تسخیر

میں بتلا چکا ہوں کہ کوہستان کے معززین اور عمائدین کو وقتاً فوقتاً اپنے ہاں بلاتا تھا۔ پھر ان کی

خاطر مدارات اور مہمانی کرتا۔ انعامات اور خلعتیں ان کو دے کر رخصت کرتا۔ اس طریقے سے میں نے کوہستان میں ایک مضبوط پارٹی بنوائی جب میری پارٹی بن گئی تو لازماً ایک مخالف پارٹی بھی معرض وجود میں آگئی۔ اب اس مخالف پارٹی کے اراکین ہر وقت اس سوچ میں رہنے لگے کہ اگر کوہستان کا علاقہ ریاست میں شامل ہو گیا تو پھر حکومت میں ان کی کوئی وقعت نہیں رہے گی لہٰذا میری حلیف پارٹی کے عمائدین سیدو میں میرے پاس آئے۔ اور یہ درخواست کی کہ اُن کے علاقے کو ریاست سوات میں شامل کیا جائے۔ کیونکہ ریاست میں شمولیت ہی میں اُن کے علاقے اور عوام کا فائدہ ہے۔ میں نے فوراً طرفدار پارٹی کے افراد کو بھی طلب کر لیا۔ پھر دونوں پارٹیوں نے متحد ہو کر یہی مطالبہ کیا کہ ہمارے ساتھ لشکر کوکوہستان بھیجا جائے۔ چنانچہ ایک لشکر ان کے ساتھ ہم نے روانہ کر دیا۔ کوہستان کے تین دروں "دوبیر، رالڑ لیا" بن گٹ پر ہمارے لشکر نے قبضہ کر لیا۔ پھر ان تینوں دروں میں قلعے بنوا دیے تحصیلوں میں تحصیل دار مقرر کیے گئے۔ یہ تینوں درے ہم نے ریاست میں شامل کر دیے جن کی شمولیت کے لیے خود ان علاقوں کے عمائدین نے درخواست کی تھی لیکن کوہستان کا گڑھ پٹن ابھی آزاد تھا۔

پٹن کوہستانی تنظیم کا مرکز

کوہستان ایاسندھ کا علاقہ اب تک حکومت میں شامل نہیں ہوا تھا۔ نیز پٹن کوہستانی تنظیم اور قوت کا مرکز تھا۔ اسے بھی ہم نے فتح نہیں کیا تھا۔ اور پٹن کو فتح کیے بغیر کوہستان کی تسخیر بے فائدہ تھی۔ پٹن میں کوہستانیوں کی جمہوری قسم کی پنچایتی تنظیم بدستور موجود تھی۔ اور ان کے احکام باقاعدہ نافذ العمل تھے۔ پٹن کے علاقے میں میرے دوست بہت کم تھے۔ اگر ان دوستوں میں سے

کوئی فرد میری ملاقات کو آتا تو پٹن کے پنچائتی اراکین اسے سخت سزا دیتے تھے۔ اور طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے۔ تاکہ برائے آئندہ کوئی شخص ہم سے ملاقات کرنے نہ آئے اس کے علاوہ پٹن والے نواب امب کے ساتھ بدستور ساز باز رکھتے تھے در پردہ ہمارے خلاف شرارتوں میں مصروف رہتے تھے۔ ہم نے سوچا کہ پٹن کو فتح کیے بغیر اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ علاقہ پٹن کے صرف چند افراد جو میرے دوست تھے سیدو میں میرے پاس آئے میں نے لشکر تسخیر پٹن کے لیے روانہ کر دیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ تسخیر پٹن کے اس سفر میں جو کہ پیدل تھا۔ سوات کے لشکر نے جس عدیم المثال چستی اور ہمت کا مظاہرہ کیا۔ وہ قابل صد تعریف ہے کہ سیدو شریف سے پٹن تک ایک سو پچاس میل کا طویل دشوار گذار اور پہاڑی فاصلہ ہمارے لشکر والوں نے تین دن میں طے کر لیا۔ سیدھی کسی پیادہ لشکر نے ایک سو پچاس میل کا راستہ اس قدر قلیل وقفے میں طے کیا ہو اور پھر راستہ بھی وہ جو کہ کوہستان کے دشوار گزار اور بلند و بالا برف پوش پہاڑوں پر سے گذرنے کا راستہ ہو۔ لیکن ریاست سوات کے لشکری جوانوں نے جنہیں اب اپنی حکومت کی ترقی اور فواید کا احساس تھا۔ تیسرے روز پٹن پہنچ کر فی الفور ہی پٹن پر حملہ بھی کر دیا۔ لڑائی شروع ہوئی بہت تیزی کے ساتھ ہمارے لشکر نے پٹن کو فتح کر لیا۔

پٹن کی فتح ہونے کے بعد کوہستانی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ آخری لڑائی تھی کہ جس کے بعد کوہستان ریاست سوات کا حصہ بن گیا۔ پٹن میں قلعوں کی تعمیر بھی شروع ہوئی تو اس کے ساتھ علاقہ پٹن سے سوات تک بار برداری کے لیے سڑک کی تعمیر بھی شروع ہوئی۔ اس لیے کہ اب تک تو پٹن سے سوات کیلئے بار برداری یعنی گھوڑوں اور خچروں کی آمدورفت کے لیے بھی کوئی راستہ نہیں تھا جب پٹن

کے علاقے میں قلعہ جات کی تعمیر ختم ہوئی۔ تو اس کے ساتھ ہی بار برداری کی یہ سڑک بھی تیار ہو کر مکمل ہو چکی تھی۔

جب علاقہ پٹن سے ہمارا فاتح لشکر سوات واپس آیا تھا تو ان کا سامان اسی سڑک پر خچروں اور گھوڑوں پر لاد کر ساتھ آگیا۔ پٹن سے سوات تک سڑک کی تیاری اس قدر قلیل وقفے میں یہ ہمارے بہادر فوجیوں کا دوسرا عظیم کارنامہ تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ریاست کے فوجیوں کو اب اپنے خوشگوار مستقبل اور ترقی، نیز حکومت کے بے پناہ فوائد کا احساس تھا۔ اس لیے انہوں نے پٹن کی اس آخری جنگ میں خوب شجاعت ظاہر کی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ریاستی فوج اب کافی حد تک تربیت یافتہ اور پابند ڈسپلن بھی ہو چکی تھی۔

علاقہ کوہستان میں انتظام حکومت

کوہستانی علاقوں کے انتظام کے لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہاں قلعے بنوائے اور ان قلعوں کے لیے ملازمین پھر علاقہ کا نٹڑا سے بھرتی کیے۔ اپنے دوست کوہستانی افراد کو مختلف عہدوں پر مقرر کیا۔ علاقہ کانا کے دوست محمد خان کو ان کا کمان افسر مقرر کیا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ قاعدہ تھا، کوہستانی معززین کے لیے مواجب مقرر کیے۔ اس علاقے کے علماء اور قاضیوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ اس طرح ان کی دلجوئی کر کے انہیں حکومت کے فوائد سے آشنا کیا۔ پٹن کوہستانی تنظیم کا مرکزی شہر تھا۔

لہٰذا پٹن کے فتح ہونے کے بعد اب بقیہ کوہستان کے علاقوں کے لوگ رضاکارانہ طور سے حکومت میں شامل ہونے لگے۔ سب سے اول "بیلو" کا علاقہ شامل ہو گیا۔ پھر "کندیا" کے لوگ سیدو آئے اور اپنے علاقے کو حکومت

میں شامل کرنے کی استدعا کی اب تو یہ حالت تھی کہ ہم سے زیادہ وہ لوگ خود حکومت میں شامل ہونے اور حکومت کے فوائد سے مستفیض ہونے کے مشتاق تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ جس روز ہم نے سیدو سے کندیا کے لیے لشکر روانہ کر دیا اسی روز ہی خفتن کے وقت ہم نے کندیا کے ٹیلی فون پر بات چیت کی۔ وجوہات یہ تھیں کہ ٹیلی فون لائن کی تکمیل میں وہاں کے لوگوں نے نہایت شوق سے حصہ لیا۔ اور خود ہی اپنے علاقے تک لائن پہنچائی۔ اس اشتیاق کی وجہ یہ تھی کہ ہماری پالیسی یہ تھی کہ

"جس علاقے کو ہم فتح کر لیتے تھے تو اس علاقے کے لوگوں کے ساتھ نہایت مشفقانہ برتاؤ کرتے۔ چنانچہ ہم ان لوگوں کے دل محبت اور پیہم مہربانیوں سے جیت لیتے۔ جب دوسرے علاقے کے لوگ یہ حالت دیکھتے تو وہ خود بخود حکومت میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو جاتے۔ جب ہم نے کندیا کا علاقہ حکومت سوات میں شامل کر دیا تو پھر دریائے سندھ کے پار علاقہ "الائی" اور درۂ "تانگیر" کے لوگوں نے بھی درخواست کی کہ ہمارے علاقوں کو بھی ریاست سوات میں شامل کیا جائے"

لیکن ہندوستان کی انگریزی حکومت نے مجھے منع کر دیا کہ ان علاقوں میں آپ دخل نہ کریں۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا جیسا کہ یہ ذکر ہو چکا ہے کہ میری حکومت میں رضا کارانہ طور سے لوگوں کی شمولیت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم ہمیشہ مفتوحہ علاقوں کے عوام کے ساتھ نیک سلوک ہی کرتے تھے۔ ان علاقوں کے معززین

کے مواجب اور علما کی تنخواہیں مقرر کرتے۔ چنانچہ ان لوگوں کو بہت جلد حکومت کے فواید کا احساس ہو جاتا۔ اور اس حقیقت سے واقف ہو جاتے کہ خود سرانہ اور غیر منظم زندگی ان کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے۔ بغیر کسی ضابطے اور قانون کے اور نیز کسی علاقے میں قوت حاکمہ کے نہ ہونے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ آپس میں لڑتے ہیں۔ اور ان میں ہر کمزور طاقتور کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ جیسا کہ حکومت بننے سے پیشتر ان علاقوں کی حالت تھی۔ چنانچہ یہی وجوہات تھیں کہ جب حکومت میں شامل ایک علاقے کی بدلتی ہوئی حالت دوسرے آزاد علاقے کے لوگ دیکھتے تو وہ لوگ فوراً اپنے علاقے کو ریاست میں شامل کرنے کی جدوجہد شروع کر لیتے۔ تاوقتیکہ ان کا علاقہ حکومت کے زیر اثر آجاتا۔

چنانچہ ریاست سوات میں زیادہ علاقے اس طرح رضاکارانہ طور سے شامل ہو چکے ہیں۔ ہر علاقے میں چونکہ اکثریت عوام کی ہوتی ہے لہذا عوام ہی زیادہ تر حکومت میں شامل ہونے کے لیے بیتاب ہوتے تھے تاکہ خواص کے ظالمانہ دستبرد سے انہیں نجات ملے۔

"خوابوں کی دنیا، اور میرے خواب"

حکومت کے ابتدائی دنوں میں جبکہ جنگی مہمات کا سلسلہ زور شور سے جاری تھا۔ اور اکثر حالات بظاہر مایوس کن اور نامساعد نظر آتے تھے، تو حالت خواب میں اکثر ایسے خواب میں دیکھا کرتا تھا کہ جن کو ایک قسم کی بشارت سمجھ کر میرے حوصلے مضبوط ہو جاتے تھے۔ اب یہاں پر مثالاً میں اپنے چند خواب بیان کرتا ہوں۔ کہ جنہوں نے پھر آگے چل کر حقیقت کا روپ دھار لیا۔

میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کروں گا کہ ان خوابوں کو ایک قسم کی تائید ایزدی سمجھ کر خدائی امداد پر میرا عقیدہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ خوابوں کے متعلق بعض لوگوں کا نظریہ کچھ اور ہو۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اکثر انسان کے روزمرہ کے خیالات اور تصورات رات کو عالم خواب میں خوابوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اور یا بعض قسم کے خواب فتور معدہ کے نتائج ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ کچھ ایسے خواب ہوتے ہیں کہ ان دونوں مذکورہ امورات سے بے تعلق ہوتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ماہرین نفسیات نے بھی علم نفسیات کی کتابوں میں خوابوں کے متعلق جا بجا بحث کی ہے لیکن ہمارا تعلق ان باتوں سے نہیں ہمارے سیدھے سادھے ماحول میں ان ایام میں جبکہ ہم اس خطہ ارضی کی ترقی اور یہاں بسنے والے لاکھوں عوام کی بہبودی کو مدنظر رکھتے ہوئے جدوجہد میں مصروف تھے۔ تو اس قسم کے خواب ہمارے ارادوں کے لیے باعث تقویت ہوا کرتے تھے اور ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھے کہ قدرت کی تائید ہمیں حاصل ہے۔ اس قسم کے خوابوں کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ گویا اپنی ذات کے متعلق کچھ غلط فہمی پھیلاؤں۔ اور یا اپنی پاکیزگی نفس کے ڈھنڈورے پیٹنا چاہتا ہوں۔ وہ تو جو کچھ ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا اس کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ ان خوابوں کا تعلق چونکہ ریاست سوات کی تاریخ اور ہماری جدوجہد سے ہے لہٰذا اسی سلسلے میں لامحالہ یہ ذکر بھی آگیا۔ خواب تو بہرصورت خواب ہی ہیں نظر آتے ہیں۔ لیکن جب وہ حقیقت بن کر سامنے آجاتے ہیں تو پھر زندگی کے ساتھ ان کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ ہمارے خواب بھی کچھ ایسے

ہی ہیں جو کہ حکومت کے ابتدائی ایام سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱

جن دنوں کوہستان کے قلعہ "لاہور" پر لڑائی ہو رہی تھی تو ہم سخت پریشانی کے عالم تھے نواب دیر کی طرف سے بھی ہر وقت حملے کا خطرہ تھا۔ اک دن صبح سویرے اٹھ کر میں نے نماز پڑھی۔ اور کلام پاک کی تلاوت کی۔ تو اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ

> عالم خواب میں ایک شخص آیا اور مجھے فارسی زبان کا یہ جملہ سنا کر گیا کہ "غم بباد رفت" جب میں جاگ پڑا تو میں نے طورو کے مولوی جمیل صاحب کو یہ کہا کہ میرے خیال میں کوہستان میں ہمارے لشکر کو فتح حاصل ہو گئی۔ بعد میں جب ہمیں اطلاع ملی تو معلوم ہوا کہ عین اسی وقت جبکہ مجھے خواب میں مذکورہ مژدہ سنایا گیا تو اسی وقت ہی کوہستان میں ہمارے لشکر نے فتح حاصل کی تھی۔

واضح رہے کہ اس زمانے میں کوہستان کا علاقہ مواصلات کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے ہم سے کافی دور دراز کا علاقہ تصور ہوتا تھا۔ اگر پیدل آدمی بھی پیغام رسانی کے لیے وہاں سے روانہ ہوتا تو بمشکل چار پانچ دن کے بعد پہنچتا

۲

علاقہ ادین زئی کی آخری سخت لڑائی جاری تھی۔ ہم پر وہ وقت بھی بہت

سے رہے۔ اور حکومت کے مقرر کردہ قوانین اسلحہ کے تحت رہے لیکن ریاست سوات میں ہمارے لیے یہ مشکلات حائل تھیں کہ عوام تو بہر صورت ہموار ہو جائیں گے۔ لیکن خوانین اور معتبرات کو اس کے لیے تیار کرانا۔ ایک دشوار مسئلہ تھا۔ جسے بہر صورت ہم نے حل کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ لیکن اس دوران میں جبکہ ہم ریاستی عوام کو غیر مسلح کرنے کے پروگرام پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ اکثر شیطان اور بدخواہ قسم کے افراد میرے پاس آتے تھے۔ اور پھر خود ہی مجھے ترغیب دیتے تھے کہ آپ ان لوگوں کو غیر مسلح کیوں نہیں کرتے۔ عوام کے پاس اسلحہ رہے تو ہر وقت خطرات کا احتمال ہوتا ہے۔ دراصل اس قسم کے بدطینت افراد کو ریاست کے مفاد و استحکام اور ریاستی عوام کو غیر مسلح کرنے کے منصوبے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ان کا مطلب یہی تھا کہ میں نے فی الفور اُن کے کہنے میں آکر لوگوں سے جبراً اسلحہ داخل کرنا شروع کر دوں۔ تو عام لوگوں میں ناراضگی پھیل جائے گی۔ اور پھر ان کو مشتعل کرنا اور بغاوت پر آمادہ کرنا ان بدطینت لوگوں کے لیے آسان ہو جائے گا۔ اور اس طرح ان مفسدوں کو ایک بار پھر فساد کرنے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن اس قسم کے افراد کے کہنے میں آکر اب دوبارہ فسادیوں کو فساد برپا کرنے کا موقع دینے کے لیے میں تیار نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے لیے فی الحقیقت یہ بھی ضروری تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے میں ریاستی عوام کو غیر مسلح کر دوں۔ چنانچہ میں نے اپنے بہی خواہ دوستوں کو جمع کر کے ان سے کہا کہ اب یہ ضروری ہے کہ عام لوگوں سے اسلحہ لے کر داخل کیا جائے کیونکہ حکومت اب مضبوط ہو چکی ہے۔ اور اس قابل ہے کہ ریاستی عوام کے مال و جان کی حفاظت کر سکتی ہے۔ نیز فوج اور پولیس بھی کافی تعداد میں موجود ہے۔ اور ان دونوں محکموں میں اس ریاست کے

افراد ہی ملازم ہیں۔ اب مثالی امن قائم کرنے کے لیے یہ از حد ضروری ہے کہ یہ لوگ اسلحہ خود بخود ہی داخل کر دیں۔ لیکن ان لوگوں کو رضا کارانہ طور سے اسلحہ داخل کرنے کے لیے آمادہ کرنا اب ضروری ہے۔ جس کے لیے میں نے یہ تجویز سوچی ہے کہ آپ لوگ جو میرے قریبی دوست ہیں دوسروں کو ترغیب دلانے کے لیے جب بھی میں اسلحہ داخل کرنے کے احکام صادر کروں سب سے اول اپنا اسلحہ داخل کر دیں۔ اپنے دوستوں کو سمجھانے کے بعد میں نے ریاست کے سرکردہ افراد و خوانین کا ایک اجلاس طلب کیا اور پھر عام اجلاس میں میں نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ ریاست سوات کے استحکام اور اعلیٰ مفاد کے پیش نظر آپ لوگ اسلحہ حکومت کے پاس جمع کر دیں۔ چنانچہ سب سے اول ہی میرے دوستوں نے اسلحہ داخل کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی اسلحہ داخل کرنا شروع کیا۔ تو ریاست کے عام لوگوں نے بھی اسلحہ داخل کرنا شروع کیا۔ اس طریقے سے بہت جلد ہم نے ریاست کے عام لوگوں کو غیر مسلح کرنے کے اس دشوار منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر ہی دم لیا۔

زندگی کا عظیم کارنامہ بقول سر گرفتھ

گورنر سرحد

ایک دفعہ جب کہ متحدہ ہندوستان میں انگریزی حکومت تھی صوبہ سرحد کے ایک انگریز گورنر "سر گرفتھ ریاست سوات آئے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ ایک ہی موٹر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم علاقہ بونیر کی طرف سے غالباً "سیدو شریف آ رہے تھے تو گورنر مذکور نے مجھ سے پوچھا کہ بادشاہ صاحب آپ کی زندگی کا عظیم کارنامہ آپ کے خیال میں جو ہو مجھے بیان کریں۔ میں نے فوراً جواباً یہ کہا کہ میں تو اپنی زندگی کا عظیم کارنامہ یہی سمجھتا ہوں کہ

"میں انگریزی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انگریزی حکومت کے ساتھ یہ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کو ہی اپنی زندگی کا ایک عظیم کارنامہ سمجھتا ہوں"

جواباً سر گرفتھ نے کہا کہ نہیں یہ تو کوئی خاص عظیم کارنامہ نہیں ہے۔ انگریزی حکومت کے خیال میں اور نیز میرے اپنے خیال میں آپ کی زندگی کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ

آپ نے کمال دانشمندی اور تدبر کے ساتھ اس

قبائلی ریاست کے عوام کو غیر مسلح کر کے ریاست میں امن قائم کر دیا اور اسلحہ بھی آپ نے ایسے طریقے سے داخل کرایا ہے کہ ان لوگوں نے رضا کارانہ طور سے خود اپنا اسلحہ داخل کرنے کو پیش کر دیا۔ کسی پٹھان کو اور بالخصوص قبائلی پٹھان کو رائفل داخل کرنے کے لیے امادہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ قبائلی پٹھانوں کی زندگی میں رائفل سے زیادہ اہم اور پیاری چیز دوسری کوئی نہیں ہے۔ رائفل تو ہر قبائلی پٹھان کی معشوق ہے۔ کسی بھی عاشق کو بغیر کسی جبر اور تشدد کے رضا کارانہ طور سے اپنی معشوق سے دستبردار کرانا۔ کسی حکمران کی انتہائی دانشمندی۔ کامیاب سیاست اور حکمت عملی کا ایک واضح ثبوت ہے۔

مسٹر گرفتھ نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ پٹھانوں یعنی ریاستی عوام کو غیر مسلح کرنے کا منصوبہ اور اسے عملی جامہ پہنانا یہ ایک دشوار اور نازک کام تھا جسے خاموشی کے ساتھ انجام دہی کے سلسلے میں آپ کی ذہانت قابل تعریف ہے میں نے دوبارہ انگریز گورنر سے یہ کہا کہ

"غیر مسلح تو یہ لوگ اب بھی نہیں ہیں یہ تو ہماری قومی حکومت ہے۔ ان لوگوں کے کہنے پر یہ حکومت ہم نے بنوائی ہے۔ لہذا اپنی ہی بنائی ہوئی حکومت کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرانا تو کوئی خاص کارنامہ نہیں ہے۔"

صورت حال یہ ہے کہ اگر حکومت سے قبل کسی خان یا ملک کے پاس

سخت تھا چاروں طرف سے خطرات اور مصیبتیں تھیں۔ انہی ایام میں میں اپر سوات میں مقیم تھا۔ اور قلعہ "نل" میں میری رہائش تھی۔ کہ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ

"میں "پل ڈھیری" کے پاس ایک چٹان پر کھڑا ہوں۔ میرے سر پر اوپر ایک مہیب پتھر لٹک رہا ہے۔ اور میرے پاؤں کے نیچے وہ چٹان جس پر کہ میں کھڑا تھا رفتہ رفتہ ہو کر پگھلتا جا رہا ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ اگر چٹان پگھل جائے تو نیچے گر جاؤں گا۔ اور اگر اوپر سے یہ لٹکتا ہوا پتھر گر پڑے تو اس کے نیچے آ کر دب جاؤں گا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مہیب پتھر آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے نیچے آنے لگا۔ جب میری کمر کے برابر آگیا تو میں نے اپنی پشت کے ساتھ ٹیک لگا کر اسے چٹان کے ساتھ پیوست تھام لیا۔ میرے پاؤں کے نیچے چٹان کا پگھلنا بھی اب بند ہو گیا لیکن اب حیران ہوں کہ اس عالم سے کیسے نکلوں۔ اوپر کیسے چڑھوں۔ کیوں کہ میں تو چٹان کے بیچ میں کھڑا ہوں۔ آخر کار اسی حالت میں میں نے اپنا داہنا ہاتھ اوپر بلند کر کے مارا تو میرا ہاتھ جم گیا۔ اس کے بعد ایک جست لگا کر اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اوپر چڑھ کر میں نے دیکھا کہ چند آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب ان آدمیوں نے میرے ساتھ لڑنا شروع کیا۔ لیکن میں نے انہیں

مغلوب کر لیا اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

یہ خواب دیکھنے کے بعد باوجود یہ کہ ادین زئی کے محاذ پر ہماری حالت مخدوش تھی۔ لیکن میرا عقیدہ مضبوط ہو گیا۔ کہ آخر کار ہم کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ ادین زئی کی جنگ میں پھر فتح ہمیں حاصل ہوئی۔

۳

جن ایام میں پورن چکیسر وغیرہ علاقوں نے بشمول علاقہ الائی کے لشکر کے علاقہ مخوزئی پر چڑھائی کی تھی اور ہم ان کو نرمی سے سمجھا رہے تھے کہ واپس اپنے علاقوں کو چلے جائیں اور مداخلت بے جا سے باز آئیں۔ لیکن وہ لوگ نہیں مانتے تھے۔ ان دنوں میں بھی میں اپر سوات کے قلعۂ نل میں مقیم تھا۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ

"نل قلعہ سے باہر دہان کے کھیتوں میں ایک جھنڈا نصب ہے۔ جس کا پھریرا ہوا سے لہرا رہا ہے۔ یکایک یہ جھنڈا اکھڑ کر اوپر ہوا میں اڑتا ہوا روانہ ہوا۔ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ جھنڈا ہوا میں اڑتا جا رہا ہے اور سامنے غور بند کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے گزر کر غور بند کے علاقے میں اتر گیا۔" اتنے میں میں جاگ پڑا۔ اور خداوند کریم کا شکریہ ادا کیا۔

اس خواب کو تائید ایزدی سمجھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ مخوزئی کی۔ اس جنگ میں پورن اور غور بند کے علاقے بھی ہمارے تصرف میں آنے والے ہیں۔ اور مذکورہ علاقے کے قلعوں پر عنقریب ہی ہمارا جھنڈا لہرانے والا ہے

میں کہہ چکا ہوں کہ اپنے خوابوں کو بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ گویا میں پراسراریت کا شوقین ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہماری خوابوں کا تعلق بھی حقیقت سے قریبی رہا ہے۔ اس قسم کے خواب ہمارے لیے بشارت تھے۔ چنانچہ ہمارا عقیدہ خدائی امداد پر مضبوط ہو جاتا تھا۔ اور یہ خواب میرے عزائم کے لیے باعث تقویت ہوا کرتے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہمارے عزائم دوسروں کی طرح جارحانہ نہیں ہیں۔ بلکہ مخلصانہ ہیں۔ ہم صرف اپنے وطن اور قوم کی حالت سدھارنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ لہٰذا خداوند کریم ہماری مدد کرے گا۔"

تسخیر کوہستان سے قبل ریاستی عوام کو

غیر مسلح کرنے کا منصوبہ اور اسے عملی جامہ پہنانا

حکومت بننے سے پہلے سوات اور بونیر کے یہ علاقے تو آزاد اور قبائلی علاقے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے بعد کا زمانہ تھا۔ بیسویں صدی شروع ہو چکی تھی۔ اور یہ رائفل کا زمانہ تھا۔ قبائلی ماحول میں رائفل کو جو اہمیت حاصل تھی۔ شاید ہی کسی دوسری چیز کو حاصل ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آزاد قبائلی ماحول تھا۔ خود سرانہ زندگی تھی اور ہر شخص اپنی حفاظت اور مال و جان کا خود ذمہ دار تھا۔ ہر وقت اس جنگی ماحول میں جنگ و جدل کا بازار گرم رہتا۔ کشت و خون کے ہنگامے ہوتے تھے۔ لہٰذا اس دیس کے ہر فرد کے پاس رائفل یا پستول یا ریوالور کا ہونا لازمی تھا۔ ہر فرد مسلح تھا رائفل کے بغیر قبائلی ماحول میں انسان کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی لیکن یہ سب اس دور میں جبکہ ریاست سوات معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ پھر حکومت بننے کے بعد بھی ابتدائی چند سالوں میں تقریباً یہی حالت تھی۔ حکومت کے ابتدائی ایام میں تو یہ مشکل تھا کہ ان لوگوں کو غیر مسلح کیا جاتا۔ لیکن جب حکومت مضبوط ہوئی تو ہم نے سوچا کہ اس ریاست میں مثالی امن قائم کرنے کے لیئے یہ از حد ضروری ہے۔ کہ ان لوگوں کو غیر مسلح کیا جائے۔

ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ کسی ریاست میں رعیت کے لوگوں کے پاس اسلحہ خاص تناسب

بیس رائفل ہوتے تھے۔ تو آج اسی خان یا ملک کا بیٹا یا کوئی عزیز ریاستی فوج میں صوبیدار میجر یا کمان افسر ہوگا اور بجائے بیس رائفلوں کے ایک سو یا اس سے بھی زیادہ سپاہی مسلح ان کی کمان میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ خود اس کے پاس بھی بہترین اسلحہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تقریباً ہر خاندان سے دو یا دو سے زیادہ افراد ریاستی فوج یا پولیس کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے پاس رائفلیں[1] بھی ہوتی ہیں۔ البتہ ہم نے اتنا کیا ہے کہ ان کی اصلاح کی ہے۔ اور ان لوگوں کو رائفل کے استعمال کا صحیح طریقہ بتلا دیا ہے۔ کہ اسلحہ ہمیشہ کے لیے اپنی قومی اور ملکی مفاد کی حفاظت کیلئے استعمال کرنا چاہیئے۔ نہ یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کو مارنے کے لیے اور یا نہتے مسافروں کو لوٹنے کے لیے اس طرح گویا ہم نے ان لوگوں کو رائفل یعنی معشوق کے ساتھ حقیقی اور جائز محبت کرنے سے آشنا کر دیا ہے۔ رائفل تو اب بھی ان کی معشوق ہے۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ اس معشوق کی محبت اب وحشت درندگی اور دیوانگی کی صورت اختیار نہیں کرے گی۔ بلکہ انسانیت کے لباس میں ہی ملبوس رہے گی۔ لہٰذا میں تو پھر بھی یہی کہوں گا کہ میری زندگی کا عظیم کارنامہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا ہے۔ اس کی وجوہات یہ ہیں کہ ہمارے مخالفین اور دشمنوں نے خواہ مخواہ انگریزی حکومت کو ہم سے بدظن کیا ہوا تھا اور انہی کے کہنے پر انگریز ہمیں خاندانی دشمن تصور کرتے تھے۔ لہٰذا ایسے حالات میں مخالفین اور دشمنوں کے ہوتے ہوئے آپ لوگوں کے شکوک اور بدگمانی رفع کرنا۔ اور پھر دوستانہ تعلقات مضبوط کرنا۔ ہم اسے ایک عظیم کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔

سرگرفتھ ایک انگریز گورنر کے اس واقع کو بیان کرنے سے مطلب یہ ہے

---

[1] واضح رہے کہ ریاست میں فوج اور پولیس کی تنظیم ہی کچھ ایسی ہے کہ اسلحہ ان کے پاس ہر وقت ہوتا ہے

کہ انگریزی حکومت کو اس کا احساس تھا اور اراکین حکومت اس سے بخوبی آگاہ تھے۔ کہ قبائلی ماحول میں رائفل کی حیثیت کیا ہے اور ان لوگوں کو غیر مسلح کرنے کے سلسلے میں کس قدر مشکلات اور خطرات حائل تھے۔ واقعی اس ملک میں رعیت کو غیر مسلح کرانا ایک مشکل مسئلہ تھا۔ لیکن مخلصانہ عزائم کی راہ میں کوئی مسئلہ بھی پھر دشوار نہیں رہ سکتا۔ جبکہ ہر دشواری سے نبٹنے کا ارادہ کیا جائے اور یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ فوج اور پولیس ریاستی باشندوں پر مشتمل ہیں۔ اور یہی لوگ ہی ان ملازمتوں سے وابستہ ہیں۔ لہٰذا یہ غیر مسلح اب بھی نہیں کہلا سکتے البتہ استعمال اسلحہ کے جائز اور مناسب طریقوں سے انہیں واقف کرا کر ہم نے ان لوگوں کو قوانین امن کا پابند رہنا ہی صرف سکھلا دیا۔ اس لیے کہ خود اس ریاست اور اس کے باشندوں کی ترقی اور مفاد کے تقاضے ہی یہی تھے۔

ریاستی عوام کو غیر مسلح کرنیکے بعد

جب عام لوگوں سے اسلحہ جمع کرایا گیا تو اس کے بعد ہم نے اسلحہ کے متعلق قوانین نافذ کیے۔ کہ

"ہر وہ شخص جسے حکومت کی طرف سے لائسنس ملے لائسنس میں مقررہ تعداد کے مطابق اسلحہ رکھ سکتا ہے"

چنانچہ بعد میں اسی قانون کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ البتہ قوانین اسلحہ میں اس امر کا ہم نے خاص خیال رکھا کہ اس ضمن میں جیسا کہ انگریزی علاقے میں قاعدہ تھا۔ عوام اور خواص کی تخصیص ہم نے نہیں رکھی۔ بس ریاست کا ہر شہری جو کہ رائفل

یا پستول خریدنے کی توفیق رکھتا ہو۔ درخواست دے کر لائسنس حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ کوہستان کے بعض علاقوں کو فتح کرنے کے بعد وہاں بھی ہم نے یہ قوانین نافذ کر دیے۔ البتہ کوہستان کے بعض علاقوں میں خاص وجوحات کے پیش نظر وہاں کے معززین سے اسلحہ داخل کرا کر ہم نے ان کو قیمت ادا کر دی۔ دکانداران اسلحہ کے لیے قوانین اسلحہ کی پابندی لازمی قرار دی گئی۔

مثالی امن

اب جیسا کہ ہم چاہتے تھے ریاست کے طول و عرض میں مثالی امن قائم ہو گیا۔ شیر اور بکری اب ایک ہی گھاٹ پر پانی پی سکتے تھے۔ مظلوم کا گریبان ظالم کی دستبرد سے محفوظ ہو گیا۔ مسافروں کے لیے اب سڑک پر سفر کرتے ہوئے نہ دن کو خطرہ تھا اور نہ رات کو۔ ریاستی علاقوں میں مشہور و معروف جابر قسم کے جو ڈاکو تھے اور جو ریاست سے باہر بھی ڈاکہ زنی کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں سینکڑوں بے گناہ افراد کے قاتل بھی تھے کوئی توقع نہیں تھی کہ ان کی زندگی سدھر جائے گی۔ سینکڑوں بے گناہ قتل کیے ہوتے اشخاص کی روحیں انتقام کے لیے چلا رہی تھیں۔ لہٰذا اس قسم کے سنگدل اور پیشہ ور قاتلوں کا خاتمہ ہی ضروری سمجھا گیا۔ یہ تو کوڑھ اور جذام کے ایسے مریض تھے کہ بس لاعلاج ہی تھے۔

لہٰذا ان کی موجودگی صرف مذکورہ امراض پھیلانے کا ذریعہ ہی تھی اس صورت میں یہی مناسب تھا کہ خلق خدا کو ان کے بہیمانہ اور سنگدلانہ مظالم سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائی جائے۔

لشکر میں اضافہ

ریاست سوات میں یہ قاعدہ تھا کہ جو لوگ صاحب جائداد تھے وہ اپنے لیے تنخواہ دار نوکر رکھتے تھے قاعدہ یہ تھا کہ فی روپیہ[1] جائداد پر ایک نوکر ہوتا تھا میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا کہ آپ مجھے دو روپیہ جائداد پر ایک نوکر دیجئے تاکہ آپ لوگوں کو مالی بچت ہو۔ اور کام بھی چلے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ مطالبہ تسلیم کیا۔ اس طریقے سے لشکر میں اضافہ بھی ہوا اور اس ماحول میں بعض طاقتور خوانین کی افرادی قوت بھی گھٹ گئی۔ فی روپیہ جائداد سے مراد وہ پیمائشی تخمینہ ہے جو کہ دفتر شیخ ملی کے مطابق اس علاقے میں نافذ تھا۔

---

[1] نوٹ:۔ سوات میں زمین کی پیمائش نہیں ہوئی ہے۔ کنالوں اور جریبوں سے یہ لوگ ناواقف ہیں۔ ان کا اپنا پیمائشی طریقہ یہ ہے کہ فی روپیہ سے لے کر سو روپیہ تک جائداد ہوتی ہے۔

موٹر لاریوں کی آمد اس دیس میں

اور تجارتی ترقی

یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ حکومت بننے کے بعد اس دیس کی حالت بدلتی جا رہی تھی۔ جب انگریزی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے اور ریاست قانونی طور سے تسلیم ہوئی تو پھر ریاست میں موٹر لاریاں بھی آگئیں۔ ہم نے حکومتی کاروبار کے لیے لاریاں خریدیں۔ موٹر لاریوں کی وجہ سے تجارت میں بھی خاصی ترقی ہو گئی۔ سفر میں آسانیاں بھی حاصل ہو گئیں۔ مختلف قصبوں نے بازاری قصبوں کی صورت اختیار کی۔ تجارت کا روبار اب تاجر لوگ دل جمعی سے کرنے کے لگے ؎

خطرہ نہ چور کا نہ اُچکے کا ڈر رہا ،

ریاست سوات کے بازاروں میں اب زندگی کی تمام ضروریات دستیاب ہونے لگیں۔ حالانکہ کسی زمانے میں ریاستی عوام ہر ضرورت زندگی کے لیے مردان اور پشاور کے بازاروں کے محتاج تھے۔ گدھوں اور خچروں پر سامان لاتے تھے اور پیدل مسافتیں ہوتی تھیں۔ اب چالاک قسم کے سوداگر سوات سے نمک کے بدلے گھی اور شہد مساوی تول کر لے جانے کا بیوپار نہیں کر سکتے تھے۔ سوات جو دنیا سے کٹا ہوا بلند و بالا پہاڑوں میں محصور ایک افسانوی دیس تھا۔ اب

دنیا کے ساتھ ملحق ہوگیا۔ اب ہر شخص بلاخوف سوات آسکتا تھا۔
سوات کے تعلقات اضلاع صوبہ سرحد اور پنجاب کے شہروں کے ساتھ قائم ہوگئے اس طریقے سے بتدریج یہ ریاست ترقی کی منازل طے کرنے لگی۔

باغبانی کے متعلق میری اصلاحات

ریاست سوات کے باغبان طبقے کو فن باغبانی سے کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ ان لوگوں کا یہ طریقہ تھا کہ جو زمین کی سبزی و ترکاری کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ اس میں بیک وقت ایک ہی قسم کی سبزی کاشت کرکے بے غم ہو جاتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ اس قسم کی ترکاری ختم ہونے کے بعد پھر بازاروں میں سبزی نہیں ملتی تھی۔ میں نے رسید و مینگورہ۔ اور مضافات کے باغبانوں کو جمع کرکے انہیں سبزیوں سے متعلق کاشت کے جدید طریقے سمجھا دیے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ جو زمین ترکاری کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں تو اس میں بیک وقت ساری قطعۂ زمین ایک ہی قسم کی ترکاری کاشت نہ کیا کریں۔ بلکہ یہ طریقہ ہونا چاہیئے کہ اس قطعۂ اراضی کو آپ لوگ چار حصوں میں تقسیم کریں۔ ایک حصے میں کوئی ترکاری جب بوئی جائے تو بیس پچیس دن گذرنے کے بعد دوسرے حصے میں کوئی دوسری قسم کی ترکاری کاشت کرو۔ پھر بیس پچیس دن مزید گزرنے کے بعد تیسرے حصے میں تیسری قسم کی کاشت کرو۔ اس طرح علی الترتیب چوتھے حصے میں کاشت کرو۔ اس طریقے سے ایک تو آپ لوگ زیادہ فائدہ حاصل کریں گے۔ اس کے علاوہ بازار میں بھی ہر وقت ہر قسم کی سبزی لوگوں کو مل سکے گی۔ چنانچہ سوات کے باغبانوں نے انہی طریقوں پر عمل

شروع کیا۔ چنانچہ انہی اصلاحات کا نتیجہ ہے کہ آج سوات کے بازاروں میں ہر موسم میں موسم کے مطابق ہر قسم کی سبزی دستیاب ہو سکتی ہے۔ بلکہ اب تو ضلع پشاور اور مردان کے لیے بھی سوات سے سبزیاں اور پھل سپلائی ہوتے ہیں سوات میں باغبانی کا سلسلہ عروج پر ہے۔ اب سوات کے باغبان اس ضمن میں کافی ترقی کر چکے ہیں۔

پھلدار باغوں کے لیے ایک فارم

کاٹیلی گاؤں کے قریب ایک زمین پر ہم نے ایک فارم بنا دیا۔ جس میں عمدہ قسم کے پھلدار درختوں مثلاً مالٹا۔ سنگترہ، ناشپاتی وغیرہ کے پودوں کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ سوات کے صاحب جائداد لوگوں کو ہم نے ترغیب دلائی کہ اپنی زمینوں میں پھلدار درختوں کے باغات لگائیں۔ تاکہ وادئ سوات کے زرخیز اور شاداب زمینوں سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو سکے۔ اور ریاست میں بسنے والوں کو اپنے ہی دیس میں ہر قسم کے میوے مل سکیں۔

چنانچہ اسی سلسلے میں ہمارے فارم سے کافی فائدہ حاصل ہو گیا۔ سوات کے مختلف علاقوں میں آج مالٹوں اور سنگتروں کے باغات موجود ہیں۔ یہ تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کہ وادئ سوات کا علاقہ مختلف اقسام کے پھلوں کیلئے مشہور ہے اس فارم کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ایک ماہر ان لوگوں کو پھلدار درختوں کے متعلق مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے طریقے بھی بتلاتا تھا۔ اس طرح ان لوگوں میں پھلدار درختوں کے باغات لگوانے کا شوق بھی پیدا ہوتا تھا۔

جولاہوں کی صنعت اور اس میں اصلاح

سوات کے مختلف قصبات میں جولاہوں کی خاصی تعداد آباد ہے۔ مثلاً بینگورہ۔ سلام پورہ منگلور۔ دیولی۔ دردشں خیلہ وغیرہ ان قصبوں میں یہاں کے جولاہے بس کھدر ہی بنتے تھے۔ لیکن سوات کے جولاہوں کے کھدر میں یہ نقصان تھا کہ ان کے بنائے ہوئے کھدر کا عرض بس آدھ گز ہی ہوتا تھا۔ اور اس کو خاص قسم کا کلف بھی دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے کپڑا مہین نہیں ہوتا تھا۔ نتیجہ یہی تھا کہ بازاروں میں ان کے بنے ہوئے کپڑے کی مانگ ہی نہیں تھی۔

چنانچہ میں نے سوات کے جولاہوں کو طلب کر کے ان کو سمجھایا کہ تم لوگ اپنے پیشے کی طرف خاص توجہ کرو۔ اور اپنے کپڑے کا عرض یعنی چوڑائی زیادہ کرو۔ کپڑا تیار ہو جائے تو پھر اُسے اچھی طرح دھویا کرو۔ تاکہ مہین ہوا کرے چنانچہ ان جولاہوں نے جب میری ہدایات کے مطابق کام شروع کیا۔ تو ان کو کامیابی ہوئی۔

میں نے یہ بھی طریقہ اختیار کیا کہ ان لوگوں کو مختلف قسم کے گرم کمبل اور چادروں کے نمونے مہیا کیے۔ اور ان کو گرم چادروں اور کمبلوں کے ساتھ ساتھ گرم چار خانہ کپڑا کوٹ وغیرہ کے لیے بنوانے کی ترغیب دی۔ اور پھر ان کی حوصلہ افزائی یوں کی کہ خود ہی خریدار بن کر ان کا بنایا ہوا کپڑا خریدتا رہا۔ چنانچہ میری تقلید میں دوسرے لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے لہذا کچھ عرصہ کے بعد سوات کے جولاہوں کی صنعت ترقی کر گئی۔ اب حالت یہ ہے کہ آج سوات کے قصبات میں گرم پٹی، کشمیرے کا کپڑا۔ گرم چادریں۔ اور کمبل بنتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس وطن کی ضروریات کے لیے کافی ہوتی ہیں مختلف

بیرونی علاقوں کو بھی سپلائی ہوتی ہیں۔ سلام پور کے بنے ہوئے پردے تو تقریباً پاکستان کے ہر شہر اور بیرونی ممالک تک پہنچ چکے ہیں۔ اس طرح کھدر۔ بلیشیا۔ اور زنانہ کپڑا بھی تیار ہوتا ہے۔ اب سوسائٹی کی یہ گھریلو صنعت دن بدن ترقی کرتی جا رہی ہے۔

شادی اور غمی کی تقریبات

کی رسومات میں اصلاحات

ریاست سوات کے مختلف علاقوں میں شادی اور غمی کی تقریبات میں بعض بیہودہ رسومات جاری تھے۔ اس قسم کے نقصان دہ اور بیہودہ رسومات کا ہم نے خاتمہ کروادیا۔ اور ان لوگوں کو سمجھایا کہ اسراف سے بچنا چاہیئے جو اقتصادی تباہی کے باعث ہمیشہ کے لیے کفایت شعاری کو اپنا کر معتدل قسم کی زندگی گزارنی چاہیئے۔ اور اس قسم کی تقریبات سے بچنا چاہیئے جو کہ نقصان کا باعث ہوں۔ عورتوں کو بھی شرعی حقوق دلوائے۔ اس طریقے سے تقریباً تمام ایسی بدعات اور بیہودہ رسومات ریاست میں ختم ہوئیں۔ جو کہ ان لوگوں کے لیے معاشرتی اور اخلاقی لحاظ سے نقصان دہ تھیں۔ ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ریاست سوات کی سرزمین ان تمام برائیوں سے بچی رہی جو کہ قوموں کے لیئے تباہ کن ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً قمار بازی اور اس سے متعلق دوسرے تمام اشغال قانوناً ممنوع قرار دیئے گئے کیونکہ اس دلیس کی اقتصادی حالت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ریاست سوات میں تعلیم

میں نے عہد حکومت میں تعلیمی ترقی کے لیے جو جدوجہد کی ہے وہ یہ ہے۔ کہ

ابتدا ہی سے میرا طریقہ یہ تھا کہ جس علاقے کو حکومت میں شامل کر لیتا۔ اس علاقے میں تنخواہ دار مدرس علما مقرر کرتا تاکہ یہ لوگ اپنی مذہبی تعلیم سے آشنا ہوتے جائیں اور ساتھ ہی کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھیں۔ اس کے علاوہ میں نے ولی عہد موجودہ والئی سوات کی ایما پر اور مشورے سے سیدو شریف میں مذہبی تعلیم کے حصول کے لیے ایک دارالعلوم قائم کیا۔ ایک شاخ دارالعلوم کی "چارباغ" میں بھی کھول لی۔ پھر مختلف علاقوں سے فاضل علما کو منتخب کر کے دارالعلوم میں تنخواہ دار مدرسین متعین کیے۔ دارالعلوم کے لیے سرکاری خرچ پر مذہبی کتابیں اور دوسرے لوازمات مہیا کیے۔ چنانچہ اس دارالعلوم سے ریاست سوات کے علاوہ سابق صوبہ سرحد اور افغانستان کے علاقوں کے لوگ بھی مستفیض ہوتے رہے سیدو شریف کا یہ خقانیہ دارالعلوم بتدریج ترقی کرتا جا رہا ہے۔ اسی طرح چارباغ کے اس دارالعلوم نے بھی اچھا کام کیا ہے۔

اس ماحول میں ابتدائی دنوں میں مذہبی تعلیم کی ضرورت زیادہ تھی۔ اس لیے کہ مذہبی تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہی ذہنوں کو انگریزی تعلیم کے لیے ہموار کیا جا سکے بلکہ اس قسم کے حالات پیدا کیے جائیں کہ ان لوگوں میں خود ہی تعلیم کا شوق پیدا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ میرے عہد حکومت کے ابتدائی پندرہ بیس سال تو ریاست کے استحکام اور لڑائیوں میں صرف ہوئے اور دوسرے ضروری امورات بھی تھے۔ لہٰذا جب ذرا سی فرصت ہمیں ملتی تھی تو ہم فوراً سب سے زیادہ ضروری کام کے لیے متوجہ ہو جاتے۔

ریاست سوات میں روشن خیال قسم کے مذہبی عالموں کی ضرورت زیادہ تھی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ

ابتدا میں تو یہ لوگ مسجدوں کے احترام تک سے واقف

نہ تھے۔ اس طرح رسومات قبیحہ اور بدعات اوہام باطلہ کی بیخ کنی اور انسداد کے لیے بھی ابتدائی دنوں میں مذہبی تعلیم کافی مدد ثابت ہوئی۔

سکولوں کا اجرا

سیدو شریف میں ایک ہائی سکول (وودودیہ ہائی سکول) اور بریکوٹ میں ایک مڈل سکول ہم نے کھولے تھے۔ ریاست سوات کے اکثر عمال اور حکام اسی وودودیہ ہائی سکول کے فارغ التحصیل ہیں۔ اسی طرح پرائیویٹ ڈاکٹروں اور سرکاری ملازم ڈاکٹروں کی کافی تعداد جو ریاست کے طول و عرض میں اس وقت مصروف کار ہیں۔ اور یا عام پبلک کے تعلیم یافتہ افراد میں اکثریت انہی کی ہے۔ جنہوں نے وودودیہ ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس ہائی سکول میں سابق صوبہ سرحد اور پنجاب کے بڑے بڑے نامی اور مشہور فاضل طلبا کو پڑھا چکے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ریاست سوات میں تعلیمی ترقی کے شاندار عروج کے سلسلے میں وودودیہ ہائی سکول نے اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ اور اس طرح سوات کی تعمیر نو میں زیادہ حصہ لیا ہے۔

۱۹۵۲ء میں جہاں زیب کالج کے اجرا کے بعد وودودیہ ہائی سکول ختم کر دیا گیا۔ سیدو شریف میں مینگورہ میں اب دو ہائی سکول اور دو مڈل سکول ہیں۔ ریاست سوات میں اب ہائی سکولوں کی تعداد تسلی بخش حد تک زیادہ ہے۔ جو کہ میرے جانشین فرزند موجودہ والیٔ سوات کے عہد حکومت سے متعلق ہیں۔

میڈیکل کارگذاری یعنی شفاخانوں کا اجرا

میں نے اپنے عہد حکومت میں ریاست میں صرف تین بڑے ہسپتال قائم کیے ہیں۔ علاقہ بونیر کے لیے ڈگر کے مقام پر ایک ہسپتال اور سیدو شریف کے دونوں ہسپتال میری حکومت کی یادگاریں ہیں۔ لیکن بعد میں میرے جانشین فرزند جہاں زیب نے ان ہسپتالوں میں توسیع کی ہے اور انہیں "سرجری" کے جدید آلات سے آراستہ کیا ہے۔ مختلف علاقوں میں دیسی دواخانوں کے چلانے والے طبیبوں کو جمع کر کے ان کا امتحان لیا گیا۔ اور اہل حکیموں کو سندیں دی گئیں۔ نااہل قسم کے نیم حکیموں کو منع کیا گیا۔ کہ خواہ مخواہ انسانی زندگی کے ساتھ نہ کھیلیں۔ موجودہ وقت میں ریاست میں سرکاری شفاخانوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ جو کہ موجودہ والئی سوات کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

پشتو زبان کے ساتھ دلچسپی

اور اس کی ترقی کیلئے ہماری جدوجہد

پشتو زبان کے ساتھ دلچسپی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گویا ہمیں دوسری زبانوں کی اہمیت سے انکار ہے۔ لیکن پشتو ہماری مادری اور علاقائی زبان ہے۔ لہذا پشتو کے ساتھ زیادہ دلچسپی اور محبت ایک لازمی امر ہے۔ جب میں نے سوات میں حکومت بنائی تو کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ ریاست سوات کی سرکاری زبان پشتو ہی ہونی چاہیئے۔ لہذا پشتو ہی دفتری اور عدالتی زبان قرار دی گئی۔ دفتروں اور عدالتوں کے لیے پشتو میں ہی رجسٹرات وغیرہ تیار کروائے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لیے پشتو زبان ہی کارآمد ثابت ہوئی۔ میں نے اس

ضمن میں عوام اور دفتروں کے لیے یہ ہدایات جاری کر دیئے کہ سادہ اور عام فہم یعنی روزمرہ کے بول چال کے مطابق تحریر ہونی چاہیئے۔ نیز خوشامدانہ قسم کے طویل القاب وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس ہر درخواست اور عرضی میں مختصر اظہار مطلب کی تحریر ہونی چاہیئے عرائض نویس قسم کے محرروں کو بھی سمجھا دیا گیا۔ کہ عرضیوں اور استغاثوں میں القاب و آداب کے بھرمار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اندرون ریاست پشتو زبان کی طرز تحریر کے لیے ہم نے اردو رسم الخط کو ہی مناسب قرار دیا۔ ریاست سوات کے اندر یوسف زئی پٹھانوں کیلئے اس سے کافی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ پشتو زبان اور پشتو کتابوں سے عام لوگوں کی بیزاری کے متعلق ہم نے سوچا کہ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ پشتو زبان حکومت کی سرپرستی سے محروم ہے۔ دوئم یہ کہ پشتو کی کتابیں طباعت اور ظاہری خوبصورتی یعنی جلد بندی وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل گھٹیا طرز کی ہوتی تھیں۔ پشتو تصانیف کی طباعت کا کوئی معیار ہی نہ تھا۔ تجارتی اغراض کے پیش نظر ہمیشہ ردی قسم کے کاغذ پہ شائع ہوتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزی اور اردو کتابیں زیادہ دلکش اور دیدہ زیب ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہم نے سب سے اول ریاست سوات سے اپنے ذاتی صرفے سے خوبصورت اور معیاری قسم کے پشتو تصانیف پیش کیے جن میں سے مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ قدیم ہندوستان کی مشہور کتاب "پنچ تنتر" جسے فارسی میں "کلیلہ دمنہ" کہتے ہیں۔ کا ترجمہ پشتو زبان میں کرا کر "انوار سہیلی" کے نام سے شائع کرایا ہے۔ یہ کتاب بہترین کتابت، بڑھیا کاغذ پہ ہزاروں کی تعداد میں شائع کرائی ہے۔

۲۔ محمد قاسم فرشتہ کی مشہور ضخیم تاریخ ہندوستان جو کہ عہد اکبری تک ہے کا مکمل ترجمہ پشتو میں دو جلدوں میں کرایا ہے۔ عہد اکبری سے انگریزی عہد تک کے واقعات دوسری تاریخی کتابوں سے ترجمہ کروا کر شامل کیے گئے ہیں۔ دو ضخیم جلدوں میں یہ کتاب ہزاروں تعداد میں نہایت معیاری طرز پر شائع کروائی ہے۔

ریاست میں مذکورہ دونوں کتابیں عام لوگوں میں مفت تقسیم کیں تاکہ پشتو تصانیف اور علم تاریخ کے ساتھ ان لوگوں کی دلچسپی پیدا ہو۔

۳۔ فتاویٰ ودودیہ پشتو زبان میں سوات کی طرف سے ایک مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب بھی دو جلدوں میں معیاری طرز پر ہزاروں کی تعداد میں شائع کروا کر مفت تقسیم کی ہے۔ تاحال تقسیم کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ فتاویٰ ودودیہ بہت ہی مقبول اور کارآمد کتاب ثابت ہوئی ہے۔ اس کتاب کی جلد اول میں فقہ کے عام مذہبی مسائل جن سے واقفیت ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ پشتو زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔

جلد دوم :۔ رہنمائے عدالت ہے جس میں ہر قسم کی شرعی اور رواجی معاملات نہایت عام فہم پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کو اسلامی قانون شہادت بھی کہہ سکتے ہیں۔ جلد اول بڑے سائز کی ساڑھے پانچ سو صفحات کی کتاب ہے۔ اور جلد دوم بھی چھ سو تیس صفحات اور بڑے سائز پر مشتمل کتاب ہے۔

فتاوےٰ ودودیہ جلد دوم اتنی مقبول اور کارآمد کتاب ہے کہ ریاستی ماحول کے ہر قاضی کے لیے ایک رہبر ثابت ہوئی ہے۔ اور اس کی موجودگی میں کسی قاضی کو دوسری فقہی کتاب کی ضرورت شاید ہی پیش آئے۔ یہ

دونوں کتابیں ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم ہو چکی ہیں۔ مذہبی طالبعلموں کے لیے بھی یہ کتابیں نہایت کارآمد ثابت ہوئی ہیں۔

۴۔ میزان الصرف، صرف گردانوں کی ایک کتاب میزان الصرف ہم نے فارسی زبان میں شائع کروائی جو کہ مذہبی دارالعلوم کے طالب علموں کے لیے بالخصوص بہت ہی مفید ثابت ہوئی ہے۔

انتظام حکومت

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس ریاست کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہم نے قوانین خود ان لوگوں کی منشا کے مطابق بنوا کر نافذ کرائے ہیں دفتری اور عدالتی کاروبار کے بنیادی طریق کار کو وضع کرتے ہوئے ہم نے دو امور کو پیش نظر رکھا ہے۔ اول یہ کہ عوام کا وقت آمد و رفت میں ضائع نہ ہو۔ دوئم یہ کہ حصول انصاف کی راہ میں ریاست کے کسی بھی فرد کو مالی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ ہم نے ہدایات جاری کیں کہ

۱۔ مقدمات اور دوسرے معاملات کے فیصلے فوری ہوں۔ تاکہ عوام کا وقت مقدمہ بازی میں ضائع نہ ہو۔ لیکن تعجیل کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انصاف کے تقاضوں کو مجروح کیا جائے۔

۲۔ کورٹ فیس وغیرہ مقرر نہیں کی تاکہ عوام کو آسانی ہو۔

۳۔ تاریخیں دے دے کر فریقین مقدمہ کو پریشان کرنے کے رسم و رواج کو اپنانے کی ضرورت نہیں۔ نہیں۔

حکومت کے ہر شعبے کی تشکیل میں ہم نے ہمیشہ اس خطۂ ارضی کے مخصوص حالات اور ان لوگوں کی ذہنیت کا خاص خیال رکھا ہے۔ ریاست سوات کے ہر دفتری اور عدالتی شعبے کی تشکیل ہماری اپنی ذہانت کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے کسی کی امداد یا تقلید کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہمیشہ کے لیے اکثریت کے مفاد کو ہم نے مقدم سمجھا ہے۔ حکومت کے عملوں، حاکموں اور تحصیلداروں کی کارکردگی کی نگرانی ایسے طریقے سے کی جاتی تھی کہ ان لوگوں کو ظلم اور بے انصافی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نہ ہی رشوت لینے کا حوصلہ کر سکتے تھے لیکن ان کے قانونی اختیارات میں دخل اندازی کا طریقہ بھی رائج نہیں تھا۔ اچھے کام کا اچھا صلہ ہمارا اصول رہا ہے۔ حکام کی عزت ان کے عہدوں کے مطابق کی جاتی تھی۔ لیکن انہیں عوام کی آزادی سلب کرنے یا لوگوں کو ناجائز تنگ کرنے کی آزادی بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ ہم نے انگریزی حکومت کی طرح کوئی خفیہ محکمۂ پولیس کا نہیں بنایا تھا اور نہ ہی اس کی خاص ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ذرائع ایسے تھے کہ ہم اپنے عمال کی حرکات و سکنات سے بھی خبردار رہتے تھے۔ نیز رعایا کے حالات سے بھی باخبر رہتے تھے ہم نے قطعاً ان حکمرانوں کا وطیرہ اختیار نہیں کیا کہ جو اپنی رعایا کو اپنے حکمران کے سپرد کر کے خود لہو و لعب میں مصروف ہو جاتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ حکومت کی گدی پر سنبھل کر بیٹھنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن میں خداوند کریم کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اسے بھی خدائی امداد ہی تصور کرتا ہوں کہ اس راہ پر چلتے ہوئے ثابت قدم رہا۔ اور میرے قدم بھی نہیں ڈگمگائے۔

جب دولت کے ساتھ ساتھ حکومت بھی ہو تو دنیا دی لذتیں مختلف شکلوں

ہیں ایسے انسان کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہیں۔ پھر کمزور فطرت انسانوں کو ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن مزاج میں استقلال ہو تو انسان بچ سکتا ہے۔

قدیمی تنازعات کے فیصلے

ریاست سے متعلقہ بعض علاقوں میں ایسے معاملات تھے جو کہ خیل در خیل ایک سو اسی سال سے متنازعہ فیہ چلے آرہے تھے۔ ریاست سوات میں آباد یوسف زئی قبیلے کی بعض شاخوں کے درمیان یہ قدیمی تنازعے کئی بار کشت و خوں اور جنگ و جدال کے ہنگامے گرم کرنے کا باعث بھی بنے۔ چنانچہ اس قسم کے دیرینہ تنازعات سینکڑوں دلوں کی رنجش اور کدورت کے موجب تھے ہم نے ختم کروا دیے جن میں سے چند ایک کا مختصر ذکر کرتا ہوں۔

۱

جس طرح کہ وادی سوات میں "بابوزئی" اور "ازی خیل" کی یہ دونوں شاخیں آباد ہیں۔ اس طرح یوسف زئی قبیلے کی یہ دونوں شاخیں پورن اور چکیسر کے علاقوں میں بھی آباد ہیں۔ اس علاقے میں چکیسر کی جائداد پر ان دونوں شاخوں کے مابین تنازعہ تھا۔ اور یہ تنازعہ ایک سو اسی سال سے مسلسل چلا آرہا تھا۔ اور پسماندگان کو اس کی دشمنی میراث میں ملتی رہی۔ اس طویل مدت میں ان کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اور نہ ہی کسی مرد خدا یعنی کسی خان یا عالم دین کی یہ توفیق ہوئی کہ ان دونوں شاخوں کے سینکڑوں افراد کے مابین صلح اور

صفائی کرائے۔ جب مذکورہ علاقوں پر ہماری حکومت قائم ہوگئی تو ہم نے نہایت آسانی کے ساتھ دونوں فریقوں کے درمیان مصالحت کرائی۔ اس تنازعے کا فیصلہ یوں ہوا کہ علاقہ کانا میں آزی خیل کی جائداد تھی۔ وہی جائداد آزی خیل شاخ سے بابوزئی کو دلوادی۔ اور بابوزئی نے چکیسر کی متنازعہ فیہہ جائداد آزی خیل کی ملکیت قرار دی۔ اس طریقے سے ہم نے ہزاروں افراد کے مابین دو صدیوں کے قدیمی تنازعے کا فیصلہ کردیا۔ جو کہ ہر سال باہمی جنگ و جدل کا ذریعہ بن چکا تھا۔ بظاہر یہ معمولی واقعہ شاید معلوم ہو۔ لیکن جن لوگوں کو اس پہاڑی ماحول میں آباد قبائلی پٹھانوں کی ذہنیت اور ضدی طبیعتوں کا علم ہے۔ وہی لوگ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس قسم کے قدیمی تنازعے کی صورت میں ان لوگوں کو کسی منصفانہ سمجھوتے کے لیے تیار اور متفق کرانے کیلئے کس قدر جگر کاہی اور جدوجہد کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہ بسا اوقات جب ان لوگوں کے درمیان کسی معاملے پر ٹھن جاتی تو پھر بقول ؎

جو بات دل میں ٹھن گئی بس وہ ٹھنی رہے

فریقین اپنے مطالبات پر اڑ جاتے۔ اور اپنے مطالبات سے ذرہ بھر ہٹنے یا دستبردار ہونے کو افغانوں کے شجاعانہ قومی روایات کی خلاف ورزی تصور کرتے تھے۔ خواہ اس سلسلے میں بھاری نقصانات اور قتل مقاتلوں تک ہی نوبت کیوں نہ پہنچے۔ چنانچہ یہی وجوہات تھیں کہ بعض قدیمی تنازعات قومی اور قبیلوی فرائض کی موروثی فضل اختیار کر گئے تھے۔

۲

اسی تنازعے سے پیوست علاقہ لیونئے کے میانگان قوم کی دو پارٹیوں

کا ایک جائداد پر تنازعہ تھا۔ ایک فریق کا دعوے تھا کہ ساری جائداد ہماری ہے۔ دوسرے فریق کا یہ دعوے تھا کہ اس میں نصف حصہ ہمارا بھی ہے۔ چنانچہ ہم نے جب فریقین کے مابین مصالحت کی کوشش کی تو بعد مشکل فریق اول کو ½ حصہ جائداد سے دستبردار ہونے پر تیار کیا۔ اور فریق دوم کو بجائے نصف کے ⅓ حصہ جائداد لینے پر آمادہ کیا۔ ایک سو اسی سال سے یہ تنازعہ بھی مسلسل فریقین کے مابین موجب بغض و عناد چلا آرہا تھا۔ فیصلہ ہونے کے بعد دونوں فریق سے متعلق سینکڑوں افراد کے درمیان صلح و صفائی ہوگئی۔

۳

اسی وادئ مذکور میں دانیال اور کروڑہ کے میانگان کا "مرین" کے علاقے پر ایک سو اسی سال سے مسلسل تنازعہ تھا۔ چنانچہ نصف نصف پر فریقین کو راضی کر کے ان کے درمیان دشمنی کو ختم کرا دیا۔ واضح رہے کہ ان ہر سہ مذکورہ بالا قدیمی تنازعات کو فیصلہ کرنے کے لیے مختلف تاریخوں کے موقعوں پر فریقین کے سینکڑوں افراد جب سیدو شریف آتے تو مہمان بھی میرے ہاں ہوتے تھے۔

۴

ایک واقعہ مقدمے کی صورت میں

انسانی بربریت کی ایک مثال

پٹھان قوم کے مختلف علاقوں میں ایسا ہوتا تھا کہ بعض سنگدل اور حریص قسم کے لوگ محض جائداد کی خاطر بیوقوف لاوارث قسم کے عزیزوں کو ہلاک

کر دیتے تھے۔ اور پھر ان کی جائداد پر قابض ہو جاتے۔ چنانچہ حکومت کے ابتدائی ایام میں اور حکومت سے پہلے علاقہ سوات میں بھی ایسے گھناؤنے جرائم ہوتے تھے۔ حکومت سوات کے ابتدائی سالوں کا واقعہ ہے کہ تندو ڈاگ ایک گاؤں میں ایک شخص کی ایما پر اس کے عزیزوں نے اپنے دو دوسرے ایسے عزیزوں کو قتل کر دیا کہ جن کی بیویاں تو تھیں مگر اولاد نہیں تھی۔ البتہ ایک مقتول کی بیوی حاملہ رہ گئی دونوں قاتل ریاستی حدود سے بھاگ کر انگریزی مالاکنڈ کے قبضہ تھانہ میں رہنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد مقتول کی حاملہ بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا۔ اب تو وہ ظالم حیران رہ گیا کہ جس نے وارث جائداد بننے کے لیے دو آدمیوں کو قتل کروایا تھا۔ جائداد کا حقیقی وارث بھی پیدا ہو گیا چنانچہ اب اس نوزائیدہ معصوم وارث کو بھی ختم کرنے کے لیے اس نے یہ شیطانی منصوبہ بنایا کہ تھانہ قصبے میں اپنے ایک دوست کو ہمراز بنا کر سمجھایا کہ کوئی ایسا آدمی پیدا کرو کہ جو اپنی بیوی سمیت سوات آ کر بادشاہ صاحب کے حضور میں یہ دعوےٰ کرے کہ تندو ڈاگ میں مقتول کی بیوی کا جو بچہ پیدا ہو گیا ہے وہ دراصل اس کا اپنا بچہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ بچہ ہمارا ہے۔ مذکورہ عورت محض جائداد کا وارث پیدا کرنے کے لیے ہمارا معصوم بچہ چرا کر لائی ہے۔ اب سوچیے کہ محض دنیاوی لالچ کے لیے اس قسم کے سفاکانہ منصوبے بنائے جاتے تھے۔ اگر وہ ظالم اپنے منصوبوں میں کامیاب ہو جاتا۔ تو یقیناً اس نوزائیدہ معصوم کا بھی گلہ گھونٹ دیتا۔ اس سکیم کے مطابق تھانے میں اس کے دوست نے ایک جوڑے یعنی میاں بیوی کو لالچ دے کر اور یہی پٹی پڑھا کر سوات بھیج دیا۔ سیدو میں ایک دن جبکہ میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک چرب زبان قسم کی عورت راہ میں کھڑی اور سینہ کوبی میں مصروف

شور فریاد کرتی ہے کہ

اے لوگو میں لٹ گئی، میں تباہ ہو گئی ظالموں نے مجھ
سے میرا نوزائیدہ بچہ چرا لیا ہے۔

میں نے اس عورت سے ماجرا پوچھا تو اس نے وہی پڑھائی ہوئی پٹی بیان کی۔ کہ تندوڈاگ میں فلاں مقتول کی بیوہ میرا بچہ اغوا کر کے لائی ہے۔ اب اسے اپنا بچہ ظاہر کرتی ہے تاکہ مقتولین کی جائداد کا وارث بن جائے۔

میں نے اس عورت سے کہا کہ صبر کرو کہ میں خود اس معاملے میں تحقیقات کروں گا۔ میں نے سوچا کہ نوزائیدہ بچے کو چرانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس بیوہ عورت کے باپ کو طلب کیا جو کہ ایک پارسا اور سچا آدمی تھا اس سے تنہائی میں میں نے پوچھا کہ تمہاری بیٹی کا جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ اس کا حقیقی بچہ ہے، یا نہیں۔ جواباً اس نے کہا کہ

اس میں شک نہیں کہ میری بیٹی حاملہ تھی یہ اس کا
اپنا ہی بچہ پیدا ہوا ہے۔ ویسے آپ کو اختیار ہے۔
کہ جو بھی فیصلہ کریں ہمیں منظور ہوگا۔ لیکن درحقیقت
ہمیں جائداد کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

چنانچہ شک تو مجھے پہلے بھی ہوا تھا کہ مدعیہ عورت جھوٹی معلوم ہوتی ہے اب اس تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر ہم پہنچ گئے کہ مسافر عورت کا دعوے غلط ہے۔ چنانچہ دوسرے روز جب پھر نماز کے لیے مسجد جا رہا تھا تو وہی عورت راستے میں کھڑی اور گریہ زاری میں مصروف تھی۔ میں نے دوبارہ جب اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو مجھے اس کے چہرے پر حقیقی درد اور غم کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

چنانچہ میں نے بھی اس سے لاپرواہی برتی۔ میں نے یہی سوچا کہ اگر یہ جھوٹی ہے تو چلی جائے گی۔ اور اگر سچی ہے تو مامتا کی تڑپ اسے جانے نہیں دے گی۔ لیکن تیسرے دن معلوم ہوا کہ وہ جھوٹی تھی خود ہی چلی گئی۔ حکومت کے ابتدائی ایام میں یا اس سے پہلے اس ماحول میں بعض لوگوں کی جو ذہنیت تھی اس واقعے سے اس کا اندازہ بخوبی لگ سکتا ہے۔ کہ وہ کیسی سفاکانہ اور مجرمانہ تھی۔

۵

لین دین کا ایک مقدمہ

حکومت سوات کا ایک معزز عہدیدار جو کہ کچھ عرصہ کے لیے اپنے عہدے سے معطل ہو چکا تھا کے ذمے ایک غریب نوجوان کا چار سو روپے قرضہ تھا۔ نوجوان قرضخواہ کے پاس تحریری رسید بھی موجود تھی۔ کاتب رسید ایک معزز تاجر تھا۔ دوسرا گواہ بھی معقول شخص تھا۔ نوجوان نے معطل شدہ افسر کے خلاف میری عدالت میں دعوے کیا کہ باوجود تحریری ثبوت اور صاحب حیثیت ہونے کے مذکورہ افسر میرا قرضہ ادا نہیں کرتا۔ جب میں نے مقروض کو طلب کر کے پوچھا تو وہ انکاری ہو گیا۔ میں نے گواہوں کو طلب کیا تو وہ بھی مکر گئے۔ وجہ یہ تھی کہ حکومت کے ایک سرکردہ اور با اختیار رکن نے گواہوں کو منع کیا تھا۔ مقروض یعنی مدعا علیہ کا بیان تھا کہ میرے دشمنوں کے اکسانے پر یہ نوجوان مجھے بدنام کرنے کے لیے دعوے کرتا ہے۔ میں نے نوجوان مدعی کی حالت دیکھی تو وہ بالکل ایک سادہ اور غریب قسم کا آدمی تھا جس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ دوسروں کا آلہ کار بن سکتا

ہے۔ چنانچہ ایک دن کا وقفہ دے کر میں نے دوسری تاریخ پر سب کو طلب کیا۔ جب دوبارہ یہ سب حاضرِ عدالت ہوئے تو میں نے سوچا کہ رسید کا محرر تو خاصہ معقول انسان ہے۔ اس کے باوجود منکر ہے کہ میرے سامنے رقم مدعی نے نہیں دی ہے۔ یہ ضرور کسی دباؤ سے مجبور ہو کر منکر ہے۔ میرے سامنے میز پہ کلام پاک موجود تھا۔ میں نے فوراً کاتب رسید سے کہا کہ اس قرآن کریم پہ ہاتھ رکھ کر کہو کہ تمہارے روبرو مدعی نے روپیہ نہیں دیا ہے۔ اب تو فوراً وہ بول اٹھا۔ کہ نہیں جناب میں حلف اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں ہنس پڑا۔ اور مقدمہ میں نے سپردِ شریعت کر کے محکمہ قضا کو بھیج دیا جہاں کے باقاعدہ باقاعدہ کاروائی کے بعد مدعی کی حق پر سی ہو گئی۔

اس ماحول میں اکثر ایسے مقدمات پیش آتے تھے کہ جن کا فیصلہ کرنے کے لیے عقل و ذہانت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم کوشش کرتے رہے کہ حتے الوسع کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہونے پائے۔

فوج کی تنظیم

ریاست سوات میں میرے عہدِ حکومت کے آخری ایام یعنی دسمبر ۱۹۴۹ء تک ریاستی فوج تیرہ ہزار جوانوں پر مشتمل تھی۔ اس فوج میں مشین گن اور توپ خانے کے دستے بھی شامل تھے۔ اور سوار فوج بھی، یہ فوج ایک سپہ سالار دو نائب سالار۔ اور کمانڈروں کے تحت مختلف کمان افسروں کے کمان میں منظم تھی۔ اس کے علاوہ ریزرو فوج بھی تھی۔ سیدو شریف میں اسلحہ بنانے کی ایک فیکٹری تھی۔ جو کہ اب بھی ہے۔ ریاست کے طول و عرض میں موزوں مقامات پر قلعے موجود تھے۔ جو اب بھی ہیں ریاست کا دفاع مضبوط تھا۔

ملکی انتظام

ریاست سوات و متعلقات کو دس اضلاع اور تینتیس تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر تحصیل کا انچارج تحصیلدار ہوا کرتا تھا۔ اور دو تین تحصیلوں کا انچارج تحصیلدار ہوا کرتا تھا۔ ان حاکموں کا تعلق مرکز سیدو میں وزیروں یا مشیروں سے ہوا کرتا تھا۔ سپہ سالار کے ذمے بھی انتظامی اور عدالتی معاملات ہوا کرتے تھے۔ ملکی انتظام کا سلسلہ اسی طریق کار کے مطابق اب بھی ہے۔

جیل خانے

سیدو شریف یعنی ریاستی صدر مقام میں ایک سنٹرل جیل ہم نے قیدیوں کے لیے بنوایا تھا۔ اب میرے جانشین نے اس میں کچھ اضافہ کر کے سنٹرل جیل نیا تعمیر کروایا ہے۔

تعطیلات

ریاست سوات میں ہم نے جمعرات کو ہفتے میں چھٹی کا دن قرار دیا۔ ان کے علاوہ تمام اسلامی تہواروں کے ایام کو بھی تعطیلی ایام قرار دیا گیا۔ قومی اور مذہبی تہواروں کا احترام کرنا میرے خیال میں قوموں کی نشوونما اور ترقی کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ البتہ اس قسم کے تہواروں کو منانے کے سلسلے میں اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے تہوار عوام کی اخلاقی حالت بگاڑنے یا اقتصادی تباہی کا بھی ایک ذریعہ بننے نہ پائیں۔

چنانچہ اپنے عہد حکومت میں ہم نے ان امورات کا ہمیشہ خیال رکھا ہے

یہی وجوہات تھے کہ ریاست میں قمار بازی۔ بلیڑ بازی یا اس قسم کے دوسرے تباہ کن مشاغل ہم نے قطعاً پنپنے نہ دیے۔

تعمیرات اور بعض قصبوں اور دیہاتوں کے ناموں کی تبدیلی

سیدو شریف کی عظیم الشان جامع مسجد میرے عہد حکومت کی یادگار ہے اس کے علاوہ سیدو کی اکثر آبادی میرے ہی عہد حکومت سے متعلق ہے عقبے کے محلات، عدالتیں، وزیروں اور مشیروں کے بنگلے شاہی مہمان خانہ اور لنگر خانہ، فوجی دفاتر، سیدو کے باغات، ولی عہد ہاؤس۔ یہ سب عمارات میرے عہد حکومت میں بنے ہوئے ہیں۔ صدر مقام یعنی سیدو سے باہر مرغزار کا سفید محل اور مہمان خانہ ایک قابل دید عمارت میرے عہد حکومت میں بنی ہوئی ہے۔ میاندم کے پہاڑ پر بھی ہم نے بنگلے بنوائے تھے۔ جو کہ اب منہدم کرائے گئے ہیں۔

علاقہ بونیر میں امبیلہ ریسٹ ہاؤس حاکم ڈگر کا عالیشان بنگلہ۔ میرے عہد سے متعلق یادگاریں ہیں۔ سوات اور متعلقات میں بعض قصبوں اور دیہاتوں کے نام غیر موزوں تھے۔ جو کہ میں نے تبدیل کرائے ہیں۔

چنانچہ مدین، بحرین، فتح پور، مرغزار، عقبہ وغیرہ یہ سب نئے نام ہیں۔ اس سلسلے میں یہ واضح کردوں کہ خطۂ ارضی کی تاریخی داستان سے متعلق بعض دیہات کے ناموں اور یادگاروں کو ہم نے نہیں چھیڑا ہے۔ اس لیے

کہ یہ رواداری کے خلاف تنگ دلی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ ہر انسان اور ہر دور کی اپنی عظمت ہوتی ہے۔ دوسروں کی یادگار مٹانا اور اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کی ہوس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر مٹانے والے کی یادگاروں کا بھی مٹانے والا پیدا ہو جاتا ہے۔

مصر کے ایک بادشاہ نے سابق فرعون کے سب کتبوں کو تراش کر اس کے ناموں کی بجائے اپنے واقعات کندہ کرائے۔ قرنیں گزر گئیں کہ مغرب کے ایک دانشور ہیرو گلفکس کے اکتشاف پر خوردبین سے پہلے کتبے پڑھے گئے۔ اول بادشاہ کی شہرت دوسرے کی بدنامی از سرِ نو شروع ہو گئی

یہ مسلسل قاعدہ چلا آرہا ہے کہ عالی حوصلہ اور فراخ دل حکمران دوسروں کی یادگار نہیں مٹاتے۔ بلکہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان یادگاروں کے مقابلے میں خود ایسی عظیم الشان یادگار چھوڑ جاتے ہیں کہ

خود بخود ان کی موجودگی میں سابق یادگاروں کی تابندگی ماند پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وادی سوات میں بعض مواضعات مثلاً گلی رام، پنجی گرام، دنگرام، ہوڑی گرام وغیرہ جیسے نام بھی تبدیل نہیں کیے گئے ہیں اور نہ ہی آثار قدیمہ کو چھیڑا گیا ہے۔

لہ اقتباس از انقلاب افغانستان

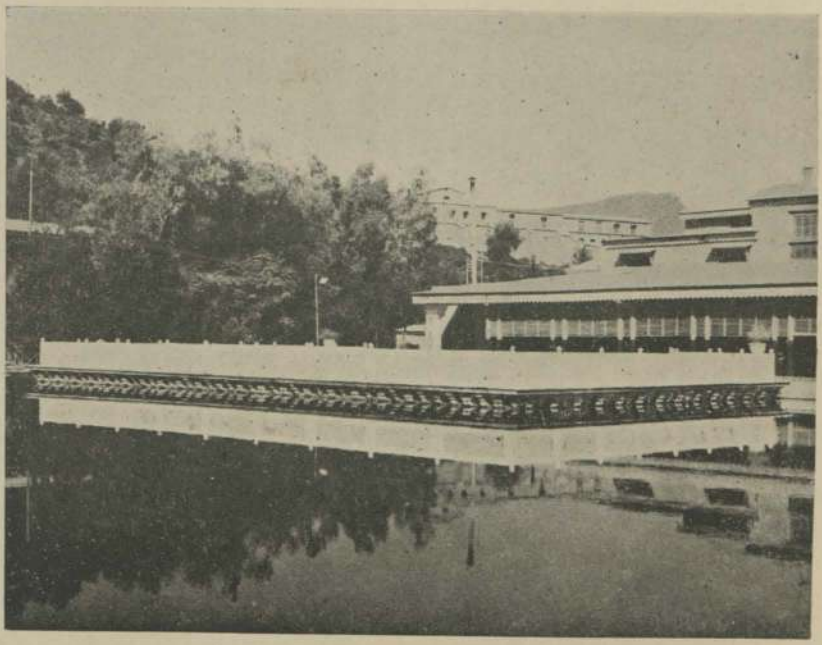

بادشاہ صاحب کا رہائشی محل (عقبہ)

وادیٔ کلام

کلام کی خوبصورت وادی میرے عہدِ حکومت کے آخری ایام ۱۹۴۶ء میں ریاست سوات کے ساتھ ملحق ہوئی ہے۔ وادیٔ کلام کے لوگوں نے رضاکارانہ طور سے حکومت میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی۔

چنانچہ انہی کی درخواست پر ہم نے کلام کو ریاست سوات میں شامل کر دیا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۸ء تک میری حکمرانی کا زمانہ مسلسل مصروفیت کا زمانہ رہا ہے۔ اس مصروف دور میں جس قدر ممکن ہو سکا ہم نے اپنی حکومت کو ایک ترقی پذیر حکومت بنانے کی کوششیں کی ہیں۔ اور حکومت کے ہر شعبے میں اصلاحات بھی کی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ تو مسلسل لڑائیوں اور ریاست سوات کے استحکام اور اندرونی امن وامان قائم کرنے نیز ریاستی حدود کو وسعت دینے کا زمانہ ہے۔ ابتداً یعنی مذکورہ عہد میں ریاستی خزانے کی حالت بھی کمزور تھی۔ بلکہ ابتدائی زمانوں میں قرض لے لے کر کام چلایا گیا ہے۔ اور مسلسل لڑائیوں پر بھی کافی اخراجات ہوتے تھے۔ ان تمام مذکورہ امورات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا مشکل کام تھا۔ جو محض خداوند کریم کے فضل و کرم سے ہم کامیاب ہو گئے۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۸ء تک اس عرصہ میں جب کہ ریاستی خزانے کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تو عوامی بہبود اور رفاہِ عامہ کے کام جس قدر ممکن ہو سکے ہم نے کیے ہیں۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۸ء تک پھر عالمگیر جنگ کی وجہ سے دنیا کو جو مشکلات پیش تھیں ان سے بھی ہم دوچار تھے۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ

اس ماحول میں عوام کو ضروریات زندگی کپڑا غلہ وغیرہ کی تکلیف سے ہم نے حتے الوسع دوچار ہونے نہیں دیا۔ اور نہ ہی اس ماحول میں ہم نے چند مخصوص افراد کو جنگ سے پیدا شدہ حالات سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا ہے ہم نے اپنے عہد حکومت میں ریاستی خزانے کی آمدن زیادہ کرنے کے لیے وہ طریقے کبھی اختیار نہیں کیے کہ جن کی وجہ سے آمدن تو زیادہ ہو۔ لیکن عوام کو تکلف ہو اور خود ریاستی عوام ضروریات زندگی کے کال اور نرخ گرانی سے دوچار ہوں۔

مسلم لیگ کے ساتھ امداد و دلچسپی

اور تعمیر پاکستان کی جدوجہد میں حصّہ

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ آزادی کے سلسلے میں کانگرس اور مسلم لیگ دو بڑی جماعتیں سرگرم عمل تھیں۔ قدرتی طور پر ہم ابتدا ہی سے مسلم لیگ کے ہمنوا تھے۔ ہماری ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ تھیں۔ اس لیے کہ مسلم لیگ مسلمان قوم کے مفاد کے لیے لڑ رہی تھی۔

چنانچہ تعمیر پاکستان سے قبل مختلف موقعوں پر ہم نے مسلم لیگ کے ساتھ امداد کی۔ اس موقعے پر امداد کا ذکر کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ گویا ہم خواہ مخواہ احسان چڑھانا چاہتے ہیں۔ اور یا اپنی امدادی رقوم اور عطیہ جات کا نمائشی مظاہرہ کرنا مقصود ہے۔ ہاں اپنے خلوص اور ملت کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا اظہار ضرور مطلوب ہے۔ اس اظہار کا مطلب یہ بھی ہے کہ بحیثیت حکمران سوات اس ریاست کے چھ لاکھ مسلمانوں کی رہبری مسلم لیگ اور تعمیر پاکستان کی طرف کر کے میں نے صحیح فرائض ادا کیے ہیں۔ ملت اسلامیہ کی جدوجہد سے ہم الگ کیسے رہ سکتے تھے۔ تعمیر پاکستان یعنی ایک اسلامی مملکت کے معرض وجود میں لانے کے لیئے برعظیم مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہم نے بھی حصہ لیا ہے۔ اس ضمن میں ہماری خدمات کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ ریفرنڈم کے موقعے پر ہم نے مختلف علاقوں مثلاً کوہاٹ، ضلع بنوں، اور صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں میں اپنے خاص نمائندے بھیج کر مذکورہ اضلاع اور وزیرستان وغیرہ علاقوں کے عوام کو یہ ہدایات کیں کہ وہ لوگ اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں استعمال کریں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ صاحب سوات کے سجادہ نشین کی حیثیت سے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں کے عوام میں میرا اثر و رسوخ اب تک قائم ہے۔

۲۔ صوبہ سرحد ریفرنڈم کے موقعے پر جب مسلم لیگ کے لیڈروں نے مالی امداد کی ضرورت ظاہر کی۔ تو ہم نے ایک لاکھ دس ہزار روپیہ نقد مسلم لیگ پارٹی کو امداداً دیا۔

۳۔ پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی پاکستانی ریاستوں میں سب سے اوّل میں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا۔

۴۔ قائداعظم "ریلیف فنڈ" میں ہم نے دو لاکھ روپیہ دیا۔

۵۔ پاکستان سے متعلق مختلف فنڈوں میں ہم نے آٹھ لاکھ روپیہ کی نقد امداد دی ہے۔

۶۔ ریاست سوات کو انگریزی حکومت کی طرف سے جو امدادی الاؤنس ملتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اگرچہ ہم قانوناً حقدار تھے لیکن میں نے اس امدادی الاؤنس سے بھی فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ تاکہ مذکورہ رقم بھی استحکام حکومت پر صرف ہو۔

۷۔ پاکستان بننے کے بعد محترم سکندر مرزا صاحب نے جو اس وقت پاکستان کے ڈیفنس سیکرٹری تھے میرے ولی عہد جہان زیب کے ذریعے کہلا بھیجا کہ آپ پاکستان کے لیے ایک لڑاکا ہوائی جہاز

خریدیں۔ چنانچہ ایک لاکھ پچیس ہزار کے صرف سے ایک لڑاکا ہوائی جہاز ہم نے پاکستان کے لیئے خریدا۔ اور اپنے ولی عہد جہاں زیب کے نام منسوب کیا۔

کشمیر کے محاذ پر

جب کشمیر کے لیے جہاد شروع ہوا تو ہم نے جہاد میں بھی نہایت والہانہ طور سے حصہ لیا۔ ایجنسی مالاکنڈ کے تھانہ کے کپتان عبدالرشید جو کہ محاذ کشمیر پر مجاہدوں کے ایک افسر مقرر تھے۔ میرے پاس آئے اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ "بارہ مولا" کے محاذ پر ہم شکست کھا چکے ہیں اگر امداد نہ ملی تو تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

چنانچہ یہ سننے کے بعد میں نے فوراً آٹھ سو جوانوں کی ایک افسری (پلٹن) ریاستی فوج سے محاذ کشمیر کے لیے روانہ کی۔ جنہوں نے وہاں پہنچتے ہی باغ ایک مقام کو فتح کر لیا۔ اگر ہمارے جوانوں کو اپنی منشا سے مطابق لڑنے دیا جاتا۔ تو یقیناً پونچھ بھی فتح ہو جاتا۔ اس کے بعد جب تک کہ کشمیر کی لڑائی جاری رہی تو ہم ہر مہینے ایک افسری کشمیر کے محاذ پر بھیجتے رہے۔

چنانچہ ان مجاہدوں کو ہم اپنی ہی لاریوں میں محاذ پر پہنچاتے رہے۔ یہاں پر میں بصد مسرت اس حقیقت کا بھی اظہار کروں گا کہ پاکستان کے ساتھ یہ تمام امداد میں نے غیر مشروط کی ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری خدمات بے لوث تھیں۔ ہم نے پاکستان سے اپنے لیئے کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے۔ جو کچھ بھی کیا محض اس لیے کہ پاکستان کے ساتھ میری اتنی ہی محبت ہے جتنی کے خود اپنے

ساتھ ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ :-

پاکستان کی سلامتی ہی ہماری سلامتی ہے۔ پاکستان کا استحکام ہمارا استحکام ہے اس لیے پاکستان سے اپنے مطالبات وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہم نے مسلم لیگ اور تعمیر پاکستان سے متعلق ہر جدوجہد میں حصہ انہی جذبات کے تحت لیا ہے۔ مسلم لیگی رہنماؤں کی اس ضمن میں یعنی قیام پاکستان کے سلسلے میں ہر آواز ہمارے جذبات سے آہنگ ہوتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قائد اعظم علیہ الرحمت کی مساعیٔ جمیلہ سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے۔ پاکستان سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے۔ اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ملت اسلامیہ کے حیات ثانیہ کے سلسلے میں پاکستان اہم پارٹ ادا کرے گا۔ ہمیں :-

ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ قوموں کی ترقی کا انحصار یقین محکم، اتحاد اور تنظیم پر ہے۔

بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء

حکومت سے رضاکارانہ دستبرداری

اپنے ولی عہد کے حق میں

۱۹۱۵ء میں جب کہ یورپ میں جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی قدرت کی طرف سے ریاست سوات اور متعلقات کی حکمرانی اور پانچ لاکھ انسانوں کی کشتیٔ حیات کی ناخدائی کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈالا گیا۔ طوفانوں سے لڑتے ہوئے اور چٹانوں سے بچتے ہوئے سمندر حیات میں ہم اپنا سفر طے کرتے رہے۔ فضل ایزدی شامل حال تھی۔ جس کا ہر لمحہ ہمیں احساس رہا ہے آخر کار ہم اس کو ساحل تک صحیح سلامت پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ جن نامساعد حالات میں عنان حکومت میں نے سنبھالی تھی اس کے متعلق ذکر کر چکا ہوں کہ

> عہد حکومت یعنی زمانہ حکمرانی میں ہم سے جو کچھ ہو سکا ریاست سوات اور عوام کی ترقی کے لیے خلوص دل سے کرتے رہے۔ ہم نے ہمیشہ فرد یا مخصوص افراد کے مقابلے میں لاکھوں افراد کے مفاد اور آرام کو مقدم جانا ہے۔ اور ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے

کہ کسی طرح بھی ذاتی تعلقات اور ذاتی مفاد میرے حکمرانی
کے فرائض سے متصادم نہ ہوں اور اگر اتفاق سے کبھی
اس قسم کا معاملہ پیش بھی آیا ہے تو ہم نے بلا جھجک
اپنے صحیح فرائض ادا کرنے کو فوقیت دی ہے۔

اس لیے اگر میرے حکومتی عہد میں اگر شاذ و نادر کہیں ناخوشگوار واقعات پیش آئے ہیں۔ تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ بحیثیت حکمران عوام کی بھلائی اور انصاف کے تقاضے بھی پیش نظر تھے۔ منصب حکمرانی کی عظیم ذمہ داریوں کے تقاضے بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

سوات ایک مکمل ریاست ہے اب بھی سینکڑوں آدمی ایسے موجود ہیں جنہوں نے ۱۹۱۵ء سے پہلے کا سوات اور پھر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۱ء تک کا سوات بچشم خود دیکھا ہے۔ ان لوگوں نے سوات کی ناگفتہ بہ حالت بھی دیکھی ہے اور پھر بعد کی یا آج کی ترقی یافتہ حالت بھی دیکھ رہے ہیں۔

لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اچھا ہوا ہے۔ ہماری جدوجہد کے خوشگوار اور افادی نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اچھا ہوا ہے۔ ہم نے اس ریاست کی تعمیر میں مالی قربانیوں کے علاوہ قدم قدم پر ابتدائی ایام میں زندگی کی بھی قربانی دی ہے۔ ہزاروں مصیبتیں اور تکالیف برداشت کی ہیں۔ لیکن ہمیں خوشی ہے کہ ہماری جدوجہد بالآخر رنگ لائی۔

ریاست سوات اور اس کے عوام کا تابناک مستقبل صاف نظر آرہا ہے۔ میری نیک دعائیں اب بھی ملت اسلامیہ کے ساتھ ساتھ ریاست سوات اور ریاستی عوام کی سلامتی اور خوشحالی کے لیئے وقف ہیں۔ میرے خیال میں

مسلمانوں کی بھلائی اور حیات ثانیہ کا راز اسی میں مضمر ہے۔ کہ مسلمان صدق دل سے اسلامی کردار کو اپنائیں اپنے ظاہر و باطن دونوں کو صحیح اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھالیں۔ سادگی اور جفاکشی وہ عظیم اسلامی اوصاف ہیں کہ انہی میں قوموں کے عروج و ترقی کا راز مضمر ہے۔ اسلام ہمیں مستقل قدم پر خلوص، اتحاد اور سپاہیانہ اوصاف کو اپنانے کا سبق دیتا ہے مسلمان کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ خود غرض نہ ہو۔ بلکہ ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگراند

کو اپنا نصب العین بنانا چاہیئے۔

رضاکارانہ طور سے حکومت سے دستبرداری کی وجوہات یہ تھیں کہ ایک تو میری یہ خواہش تھی کہ حکومت کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر میں تعلیم حاصل کروں۔ بالخصوص کلام پاک اور احادیث شریفہ سے صحیح طور سے واقف ہونا میری خاص آرزو تھی۔

دوئم یہ کہ میرا ارادہ تھا کہ حکومت سے دستبردار ہونے کے بعد میں ان لوگوں یعنی ریاست سوات کے عوام کی اخلاقی اصلاح اور ان کے کردار کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے عملی کام کروں گا۔ میری آرزو تھی کہ سوات کی ریاست صحیح معنوں میں اسلامی ریاست اور ریاست کے پانچ لاکھ افراد حقیقی مسلمان کہلانے کے حقدار بن جائیں۔

اس کے لیے میں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ روشن خیال اور باشعور علمائے کرام کی ایک جماعت میرے ساتھ ہوگی۔ اور ہم ریاست سوات و متعلقات کے علاقوں میں گاؤں گاؤں جا کر ان لوگوں کی اخلاقی اور مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے کام کریں گے۔ اور اس ضمن میں تمام مالی اخراجات بھی میں نے خود

برداشت کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

لیکن حکومت سے دستبردار ہونے کے بعد میری توقعات اور امیدوں کے بالکل برعکس کچھ ایسے حالات پیش آئے۔ کہ میں اپنی زندگی کے اس آخری اصلاحی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور غالباً اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے ایک اصلاحی ارادے کی کامیابی کے سلسلے میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ تحصیل علم کے متعلق میری خواہش پوری ہوئی۔

میں نے ترپسٹھ سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ دونوں آنکھوں کا آپریشن کرا چکا ہوں۔ لیکن آنکھوں کی سخت درد کے عالم میں بھی میں نے تحصیل علم کے سلسلے کو ادھورا چھوڑنے نہیں دیا مختلف مذہبی کتابوں کے علاوہ تفسیر جلالین پڑھ چکا ہوں مشکوٰۃ شریف کا اردو ترجمہ بھی پڑھ چکا ہوں۔ میں نے تہتر سال کی عمر میں اردو تعلیم شروع کی۔ چنانچہ اب مڈل تک پرائیویٹ تعلیم بھی حاصل کر چکا ہوں۔ اس وقت میری عمر اگرچہ چھہتر سال ہے۔ لیکن میرے تعلیمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میری خاص دلچسپی کلام پاک کے ساتھ ہے۔ تعلیم کے بعد دوسرے نمبر پہ پھر میں شکار کا شوق رکھتا ہوں۔ زندگی میں فرصت کے اکثر لمحات میں نے شکار میں صرف کیے ہیں اور یہ سلسلہ

ہنوز جاری ہے۔

مذکورہ وجوہات کے پیش نظر ہی میں نے خود حکومت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہم نے حکومت پاکستان سے خط و کتابت کی۔ بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء کا دن اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا۔ چنانچہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم

"لیاقت علی خان مرحوم بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء کو سوات آئے۔ سیدو شریف میں اسی تاریخ کو دربار منعقد کیا گیا۔ ریاست سوات کے سرکردہ افراد اور عمائدین موجود تھے۔ کہ میں نے اسی دربار میں ریاست سوات کی حکمرانی سے دستبرداری کا اپنے ولی عہد کے حق میں اعلان کیا۔ چنانچہ اسی منعقدہ دربار میں لیاقت علی خان مرحوم کے ہاتھوں میرے جانشین کی رسم دستار بندی بھی ادا ہوئی۔ اس طرح بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء کا دن تھا جب کہ میں نے ریاست سوات یعنی اس قافلے کی مہار جو کہ چونتیس ۳۴ سال پیشتر ۱۹۱۵ء میں "کبل" کے پُر فضا سبزہ زار میں اسی طرح ایک عام منعقدہ دربار میں میں نے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ اپنے ولی عہد جہان زیب کے حوالے کر دیا۔ جو یقیناً میرے خیال میں اس منصب کے اہل تھے۔"

چونتیس سال پیشتر جبکہ میں اس قافلے کی مہار تھام رہا تھا تو سوات کے آسمان پر اور اس دیس کے بلند و بالا پہاڑوں کی اوٹ سے چاروں طرف مصائب مشکلات اور حوادث کی گھٹائیں امڈ امڈ کر منڈلا رہی تھیں۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں بارہ دسمبر کے روز جب یہ مہار میں اپنے جانشین کے ہاتھوں میں دے رہا تھا۔ تو میں نے خداوند کریم کا شکر ادا کیا۔ کہ ریاست سوات کی حدود میں چاروں طرف سے مطلع صاف تھا۔ تابناک مستقبل کا سورج اپنی روشن کرنیں وادی سوات کے خوشگوار ماحول پر نچھاور کر رہا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت یعنی پاکستان قائم ہو چکا تھا۔ اور میرے جانشین کی رسم دستار بندی بجائے کسی انگریز گورنر جنرل کے ہمارے اپنے مسلمان بھائی مملکت کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے ہاتھوں ادا ہو رہی تھی۔ اب ریاست سوات کی مثال دنیا سے الگ تھلگ کٹے ہوئے جزیرے کی نہیں تھی۔ بلکہ ریاست کے چھ لاکھ مسلمانوں کا یہ قافلہ شاہراہ حیات پر ملت اسلامیہ کے عظیم قافلے کے ساتھ کاروان پاکستان کے توسط سے وابستہ اور ملحق ہو چکا تھا۔ چنانچہ حکمرانی کی عظیم ذمہ داریوں سے میں نے خود کو فارغ کر دیا۔ بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء کے بعد اب میرے فرزند رشید جہاں زیب ہی ریاست سوات و متعلقات کے حکمران ہیں۔ اور اس کا بڑا بیٹا اورنگ زیب ولی عہد ریاست ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ انہیں ملت اسلامیہ اور اپنے ملک اور عوام کی خدمت مزید توفیق عطا کرتا رہے۔ آمین، ثم آمین

سلطان العلوم میجر جنرل محمد عبدالحق
جہاں زیب خان والئے سوات

حکمرانی کے بعد

حکمرانی سے دستبردار ہونے کے بعد اب میرے تعلیمی مشاغل جاری ہیں۔ جہاں تک میرے کردار اور سیرت کا سوال ہے اس کے متعلق میں خود کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ ایک چیز ہے جس کے متعلق میں خود یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے باقاعدگی کے ساتھ نماز کی ادائیگی والد بزرگوار کی وفات کے بعد دس سال تو میں خلوت نشین رہا۔ چار سال سجادہ نشینی کے دوران میں میں نے نماز قضا نہیں کی ہے۔ لیکن اس کے بعد چچازاد بھائیوں کے ساتھ مخالفت کا سلسلہ جب شروع ہوا تو سجادہ نشینی چھوڑ کر ہم نے مسلح نوکر اپنے لیے بھرتی کر لیئے تاکہ ہماری قوت زیادہ ہو تو ان نوکروں اور ہم نشین صلاح کاروں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جنکی صحبت کی وجہ سے میری نماز کی باقاعدگی بھی ختم ہو گئی۔ پابندی سختی کے ساتھ جاری نہ رہ سکی۔ چودہ سال کی عمر سے بائیس سال کی عمر تک نوجوانی میں گویا آٹھ سال یہی سلسلہ جاری رہا۔ لیکن بائیس سال کی عمر میں ایک دفعہ مجھے جب تپ محرقہ کی بیماری ہو گئی۔ تو یہ بیماری میرے لیئے ایک تنبیہہ ثابت ہو گئی۔ تپ محرقہ سے صحت یاب ہونے کے بعد میری اصلاح ہو چکی تھی۔ اور خیالات بدل چکے تھے جب امیر بادشاہ فوت ہو گیا تو میں نے نماز پابندی کے ساتھ ادا کرنی شروع کی۔ چنانچہ چوبیس سال کی عمر سے لے کر اس وقت تک جب کہ میری عمر چھہتر (۷۶) سال ہے۔ پھر مجھ سے کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ نہ تو سفر میں اور نہ ہی وطن میں

دس سال ایام جوانی میں صرف میں نے پابندی کے ساتھ نماز نہیں پڑھی۔ گویا قضا ہوتی رہی۔ لہٰذا ان قضا شدہ نمازوں کی تلافی اپنی جانب سے میں نے یوں کی کہ مسلسل گیارہ سال میں ہر نماز کے ساتھ اس کے بعد اسی وقت کی قضا نماز بھی ادا کرتا رہا اب اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کی یہ سچی کہانی یعنی تعمیر ریاست اور اس سے قبل و بعد کی یہ داستان جو کہ میرے عہد حکومت اور جدوجہد سے متعلق ہے ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے متعلق اکثر بیرونی علاقوں کے سیاح قسم کے لوگ۔ یا شائقین تاریخ، اخباری دنیا سے تعلق رکھنے والے ذی شعور قسم کے سوالات کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنی طرف سے ہم انہیں کیا کہہ سکتے ہیں۔ بجز اس کے کہ کتابی صورت میں اپنی جدوجہد کی یہ ساری کہانی انہیں پیش کر دیں۔ جسے ریاست سوات کی تاریخ بھی بجا طور سے کہا جا سکتا ہے۔ چند منٹ ملاقات کے مختصر وقفے میں یہ حالات۔ بیان نہیں ہو سکتے۔ پھر حالات بھی کس کس کو سنائے جائیں۔ میری خواہش یہی ہے کہ بقیہ زندگی کے لمحات اب قرآن کریم کی تلاوت میں ہی بسر ہو جائیں واضح رہے۔ کہ سابق حکمران سوات اور بانیٔ ریاست ہونے کی حیثیت سے حکومت سے دستبردار ہوتے وقت میں نے اپنے لیے کسی پنشن یا مشاہرے کا مطالبہ خود نہیں کیا۔ کیونکہ خود اپنے لیے اپنے منہ آپ قسم کا مطالبہ میں نے مناسب نہیں سمجھا اب میں ذاتی جائداد سے اپنے اخراجات پورے کرتا ہوں۔ ذاتی جائداد ہی میری تمام ضروریات کی کفیل ہے۔ اب بھی ان تمام ذمہ داریوں سے میں غافل نہیں ہوں۔ جو کہ بحیثیت بانیٔ ریاست سوات اور سابق اول حکمران ریاست کے ہم پر واجب ہیں۔ اپنے دیرینہ رفیقوں، میدان کارزار کے ساتھیوں کو ہم کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔ ریاستی عمائدین بیرونی مہمانوں کی خاطر تواضع حتے المقدور ہم اب بھی اسی اہتمام سے کرتے جا رہے ہیں۔ کہ جیسے کہ حکمرانی کے عہد میں ہم کرتے تھے۔ مہمان نوازی اور مہمانوں کا احترام تو ہمارا قومی اور اسلامی فریضہ ہے۔ میرا مطلب صرف شاہی میزبانی

اور عام میزبانی کے امتیاز سے ہے جو کہ اب بھی نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ریاستی عوام اب باشعور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری جد وجہد اور قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں اور بالآخر نوع انسانی کے ایک حصے کے لیے مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ ہمارے لیے یہ احساس بھی کافی ہے اور بس،

قیام پاکستان سے بعد ایک پرفضا مقام کی حیثیت سے بھی سوات کی شہرت اور نیک نامی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ حقیقت میں اس خطۂ ارضی کی ترقی اور لاکھوں افراد کی بھلائی اور خوشحالی ہی اپنی مصروفیت پیہم کا مدعا تھی۔ اب رہی یہ بات کہ خود ہمارے لیے یہ نہیں ہوا وہ نہیں ہوا تو اس کا چنداں غم نہیں ہے۔ عمر کے زیادہ دن بیت چکے ہیں۔ کچھ تھوڑے جو بقایا ہیں بہرکیف وہ بھی گذر ہی جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا فانی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ لیکن اس عہد میں ایک احساس ہمارے لیے اذیت ناک ہے کہ ۱۹۳۹ء میں جنگ عالمگیر کے بعد عام اشیا اور ضروریات زندگی کے نرخ بدستور بس چڑھتے جا رہے ہیں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ عوام کی قوت خرید بے بس ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ مسلمان تاجروں اور سوداگروں میں ناجائز منافع خوری اور ظالمانہ کمائی کی خواہشات نے ایک وحشت ناک جنون کی شکل اختیار کی ہے۔ اور یہ کچھ ایسے اثرات ہیں کہ دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم نے ریاست میں امن و امان قائم کر کے عوام کو ان رہزنوں اور ڈاکوؤں سے نجات تو دلا دی جو کہ کھلم کھلا مسلح ہو کر جبر و تشدد سے لوگوں کو لوٹتے تھے۔ لیکن یہ نئے قسم کے جیب تراش اور اچکے جو کہ تاجرانہ لبادے اوڑھ کر لوٹ مچا رہے ہیں ان کا علاج مشکل نظر آتا ہے۔ اسلئے کہ یہ اثرات صرف ہمارے ہی ماحول کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ ہم پر تو تھوپے گئے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست اور دنیا کی عظیم قوتوں کی باہمی رقابت کے یہ اثرات ہیں۔ کہ یہ قومیں پن چکی کے دو پاٹ بن کر درمیان میں دانوں کی طرح کمزور ملکوں کو

پیستے جارہے ہیں۔ جو کچھ بھی ہے ہماری دعا تو یہ ہے کہ دنیا میں امن وامان رہے اور اقوام عالم سکھ اور شانتی سے ارتقائی فاصلے طے کرتے جائیں۔ ہمارا عقیدہ تو اسلامی تعلیمات پر بھی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے کہ جب تک قدرت کو منظور رہے گا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ انسان کی بدنصیبی یہ ہے کہ یہ دن بدن اپنے خالق حقیقی سے باغی ہوتا جارہا ہے ایک سرکش اور نافہم بچے کی طرح بس اپنے ہی بنائے ہوئے کھلونوں پر اس قدر اترا تا ہے کہ معبود حقیقی کو بھی بالکل فراموش کر بیٹھا ہے۔ حالانکہ خالق کائنات کی طرف سے زلزلے کے ایک سیکنڈ کے ایک جھٹکے کے ساتھ ہی لرز اٹھتا ہے۔ خواہ یہ زلزلے آتش فشاں کے پھٹنے کا نتیجہ ہوں۔ یکسی بہر صورت احکام قدرت کے تابع تو ضرور ہیں موت کے سامنے ہم سب بے بس ہیں انسان جب تک اپنے خالق حقیقی کی طرف صدق دل سے رجوع نہیں کرے گا مشکلات کی ان دلدلوں میں پھنسا رہے گا۔ دنیا میں رہتے ہوئے صرف ایک ہی چیز انسان کو برائی سے باز رکھ سکتی ہے۔ اور وہ ہے خدائی خوف اور یہ خوف اسی دل میں ہی رہ سکتا ہے جو کہ صدق دل سے اپنے خالق حقیقی پر ایمان رکھتا ہو۔ اب میں اخیر میں ۱۹۳۰ء سے پہلے ہمارے بچپن کے عہد ۱۸۹۰ء تک زمانے کی ضروریات زندگی کے نرخ اور ان بادشاہوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو کہ ہمارے متعلق ممالک میں اسی مذکورہ دور میں گذرے ہیں۔ اور نیز اپنے ہمسایہ ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کا بھی مختصر تذکرہ کروں گا۔ اپنے ہمسایوں کو ہم اپنی جدوجہد کے تذکرے میں کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔ ؎

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بہ یاد ار حریفان بادہ پیمارا

اسکے بعد ہماری جدوجہد اور ریاست سوات کی تاریخی ارتقائی سرگزشت مکمل ہو جائیگی

درماں ز درد ساز اگر چہ خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی (اقبال)

ذرا عہدِ رفتہ کو آواز دینا

حصّہ سوم

عہدِ رفتہ کی یادیں

بیانیہ از بادشاہ صاحب

تصنیف

محمد آصف خان

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو
(اقبال)

ہمارے بچپن اور جوانی کے عہد میں ضروریاتِ زندگی کے نرخ

۱۸۹۲ء میں یعنی انیسویں صدی کے آخری عہد میں سے ۱۹۳۸ء تک کا یہ زمانہ اس لحاظ سے فراغت کا خوشگوار زمانہ تھا۔ کہ اس دور میں ضروریاتِ زندگی کے کمیابی کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ اشیائے صرف کے نرخ بہت اچھے تھے ۱۸۹۲ء سے قبل تو نرخ جو کچھ بھی تھے ۱۸۹۲ء میں جبکہ میری عمر صرف دس سال کی تھی۔ تو وادیٔ سوات اور متعلقہ علاقوں میں ضروریاتِ زندگی کے نرخ بہت ہی امذاں تھے اب میں مثالاً کچھ اشیاء کے نرخ بیان کرتا ہوں کہ جس سے عام ہر چیز کے سستے کا اندازہ لگ سکے گا۔ ہمارے دیس میں اس زمانے میں مرغ کی قیمت دو آنے فی مرغ تھی۔ بالکل نئے اذان دینے والے مرغ ایک روپیہ آٹھ آنے میں مل جاتے تھے۔ اور پختہ قسم کے موٹے مرغ فی روپیہ چار یعنی چار آنے کو ایک مرغ مل جاتا۔ اس طرح "بیل" اور گائے کی قیمت فی راس دس بارہ روپیہ نہ تھی۔ گائے کا چمڑا ایک روپیہ، اور بیل کا چمڑا دو روپیہ، بھینس کا چمڑا (کھال) پانچ یا چھ روپیہ کو فروخت کرتے تھے۔ اسی طرح ہمارے وطن میں ذبح کی جانے والی قصابی کی بھینس ۲۰، اور ۲۵، روپیہ کے درمیان ملتی تھی۔ پالتو یعنی دودھ دینے والی بھینس

روپیہ کو مل جاتی۔ بہت اعلےٰ قسم کی اچھی نسل کی بھینس کی قیمت بھی بس اسّی (۸۰/-) اور نوّے (۹۰/-) روپیہ کے درمیان ہوتی تھی۔ چنانچہ دودھ دینے والی متوسط قسم کی گائے بیس (۲۰/-) اور پچیس (۲۵/-) روپیہ کے مابین ملتی تھی۔ جبکہ دودھ دینے والی بکری چار پانچ روپیہ کو مل جاتی۔ گوشتدار بچہ کی قیمت بھی پانچ روپیہ سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ لڑاکا گوشتدار سات روپیہ سے دس بارہ روپیہ تک بکتا تھا۔ بازار کی دوسری چیزیں بھی سستی تھیں۔ مثلاً بہترین کوالٹی کا اعلیٰ ململ نرخ چار گز فی روپیہ اور دستاری ململ آٹھ گز فی روپیہ تھا۔ اس طرح لٹھا سفید اور دوسرے کپڑے کا نرخ بھی سستا تھا۔ اس علاقے میں خالص گھی پونے دو سیر پختہ فی روپیہ تھا۔ شہد ساڑھے تین سیر فی روپیہ بکتا تھا۔ چینی بھی تین سیر فی روپیہ مل جاتی۔ غلہ انتہائی سستا تھا۔ جوار (مکئی) ایک روپیہ فی من نرخ تھا۔ گندم کا نرخ فی من دو ڈھائی روپیہ ہوتا تھا۔ جبکہ چاول ڈھائی تین روپیہ فی من نرخ فروخت کرتے تھے۔ لکڑی سو خفتی دو آنے فی من کے حساب سے دیتے تھے۔ مزدوروں کی یومیہ مزدوری اس زمانے میں دو آنے تھی۔ لیکن ضروریات زندگی کے مذکورہ نرخنامے سے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ دو آنے بھی اسے بخوبی کافی ہو جاتے تھے۔ ایک آنے میں ڈیڑھ سیر گندم یا ڈھائی سیر جوار خرید لیتا۔ اور ایک آنے میں دوسری ضروریات بھی مل جاتے۔ لیکن آج کا مزدور ایک روپیہ سے ڈیڑھ روپیہ تک یومیہ کماتا ہے۔ مگر پونے دو روپیہ کو ایک سیر گندم اور ڈیڑھ روپیہ کو ایک سیر جوار ملے۔ تو فکر انے کے نقل بھی اداکرتا ہے ؎

"ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا"

۱۹۳۹ء تک تو اشیا کے نرخ کچھ اچھے ہی تھے، لیکن جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ضروریات زندگی اور عام اشیائے زندگی کے نرخ چڑھنے شروع ہوئے۔ بیس سال کا عرصہ گزر گیا صورت حال یہ ہے کہ نرخ متواتر چڑھتے جا رہے ہیں۔ عوام کی قوت

خرید مقابلے کر کر کے اب بے بس اور نڈھال سی ہو چکی ہے۔ دن بدن زخموں کے سلسلے میں حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ آج مارچ ۱۹۵۸ء میں جب کہ مہنگائی ہمارے دیس میں بھی انتہائی عروج پر ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ پالتو بھینس کی قیمت چار سو روپیہ تک پہنچ چکی ہے۔ بازار میں مرغے کی قیمت تین روپیہ ہے۔ جب کہ معمولی چوزہ بھی ڈیڑھ روپیہ سے کم نہیں ملتا بکرے کا گوشت آٹھ آنے پاؤ اور موٹا گوشت چار آنے پاؤ ہے لیکن چار آنے سے کم خریدے تو بیچنے والے قصائی دیتے بھی نہیں۔ اور سینئے چار پانچ کو ملنے والی شریر مگر نوع انسانی کے لیے انتہائی مفید بکری کی قیمت ایک سو بیس تک پہنچ چکی ہے۔ اب تو وہ بھی اترائی پھرتی ہے۔ کہ آخر کار ہمارے بھی دن آ گئے۔ اور "غم نداری بز بخر" کا زمانہ گزر گیا۔ اب تو یہ ایک غم بھی ملے" تو کوئی اپنی قسمت پر ناز کرے۔

بکری کی قیمت ایک سو بیس سے ایک سو پچاس تک پہنچ چکی ہے۔ بکری کے ساتھ بکرا بھی موچھوں پر تاؤ دیتا ہے۔ کہ وہ بھی قیمتی ہو ہی گیا۔ گڑ ایک روپیہ کو سیر ملتا ہے لیکن پاؤ سے کوئی کم خریدے تو شہر کے کسی دوکاندار کا چہرہ اس وقت قابل دید ہوتا ہے۔ اسی طرح چینی کا نرخ اگرچہ کنٹرول ریٹ ایک روپیہ دس آنے ہے۔ لیکن نصف کم گشتہ کا تو ملنا ہی غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ چھ لاکھ کی آبادی کے لیے ڈھائی سو بوری چینی، ماہوار جس کے فی بوری دو من کے حساب سے بیس ہزار سیر ہی بن جاتے ہیں کارخانے بنتے جا رہے ہیں چینی عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب" گھی ساڑھے سات یا آٹھ روپیہ فی سیر ہے۔ جب کہ آٹھ آنے سے کوئی کم خریدے تو دوکاندار یوں شکل بنا لیتا ہے جیسے اسے انفلوئنزا ہو گیا۔ اسی طرح شہد کا آٹھ روپیہ سیر ملنا محال ہو چکا ہے کیا بھلے دن تھے۔ اور کیا خوشگوار زمانہ تھا۔ کراچی والے اپنا حلوہ مرنے سے کھاتے تھے اور ہم کو ہستانوں کے مکین اپنا شہد[1] مزے لے لے کر چاٹتے تھے۔ اسی طرح کپڑے کا نرخ

---

[1] کراچی والے مالدار ہیں، ہمارا شہد آٹھ روپیہ سیر بھی کھا سکتے ہیں۔ لیکن ہم غریب ان کا حلوہ کیسے کھا سکتے ہیں جب کہ تین روپیہ پاؤ بارہ روپیہ سیر

ہے۔ ہمارے اپنے ملک کا بنا ہوا کپڑا نی روپیہ گز ملنا مشکل ہے اگر ملتا ہے تو وہ بھی گیا گزرا کپڑا۔ شرٹنگ کا متوسط قسم کا کپڑا بھی چار روپے نی گز جاؤ ہو تو غنیمت ہے۔ اسی طرح غلہ جیسے تو گندم ستائیس اٹھائیس روپیہ نی من اور جوار (مکئی) پچیس چھبیس روپیہ نی من نرخ برقرار ہے۔ تو الحمد اللہ۔ اور تو چھوڑیئے لکڑی سوختی دو روپیہ نی من اور وہ بھی بالکل گیلی۔ پھر اس کی چرائی کا خرچ علیحدہ۔ غرضیکہ زندگی کی ہر ضرورت، اور بازار کی ہر چیز اس حد تک مہنگی ہو چکی ہے کہ بس دور سے دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اسے خریدنے کا حوصلہ مشکل سے ہی کر سکتے ہیں۔ تو یہ ہے آج کل بازار کی حالت۔ اونچے سرمایہ داروں۔ صاحب جائداد۔ خوانین۔ منافع خور تاجروں اور دکانداروں کے لیے تو کوئی غم نہیں کہ ان کی قوت خرید ہر جگہ مضبوط ہوتی ہے۔ لیکن غریبوں کے لیے دنیا میں رہائش مشکل سے مشکل ہوتی جا رہی ہے اور زیادہ مشکلات یہ بھی ہیں کہ انسان سادگی جیسے بیش بہا وصف سے فرار کرتا جا رہا ہے۔ لہٰذا فیشن پرستی کی لعنت ان سب مصیبتوں پر مستزاد ہے۔ صاحب حیثیت لوگ اپنی ضروریات کا حلقہ دن بدن وسیع کرتے جا رہے ہیں ۱۹۳۸ء سے پہلے بھی ہمارے ماحول اور ہمارے ملک میں صاحب حیثیت افراد کی کمی نہیں تھی لیکن نئی نئی موٹر گاڑیاں خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کچھ اور روز یہ حالت رہی تو کیا ہوگا؟

کچھ دوسرے ممالک اور پڑوسی ریاستوں کے متعلق

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

(غالب)

(۱) ترکی حکومت، سلطنت عثمانیہ

ترکی حکومت اور ترک قوم کے ساتھ ہماری وابستگی تعلقات پرانی ہے۔ اور یہ وابستگی ہماری اسلامی اخوت کی بنیاد پر ہی چلی آرہی ہے۔ ہمارے بچپن کے عہد سے جوانی کے ہنگامہ خیز دور یعنی چھبیس سال کی جب میری عمر تھی تو اس زمانے میں سلطان عبدالحمید ترکی کے سلطان تھے۔ جب سلطان موصوف معزول ہوئے تو ان کے بعد محمد رشاد سلطان تخت نشین ہوگئے۔ سلطان مذکور کے بعد پھر وحید الدین حکمران ترکیہ بن گئے۔ وحید الدین کی معزولی کے بعد سلطان عبدالمجید خلیفہ ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اتاترک نے ترکی جمہوریت قائم کرکے ملوکیت کا خاتمہ کردیا۔ اس دور میں ترکی جمہوریہ مضبوط ہو چکی ہے۔

(۲) افغانستان

افغانستان کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات قدیمی ہیں۔ ہم مذہب ہونے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ افغانستان، افغانوں کا ملک ہے۔ اور ہمارا قریبی پڑوسی ملک بھی ہے ہمارے بچپن کے عہد میں کابل میں امیر عبدالرحمٰن کی سخت گیری اور جابرانہ قسم کی سیاست مشہور تھی۔ ہمارے ماحول میں امیر مرحوم کے کارناموں کے تذکرے اکثر ہوتے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن کے بعد جب کہ میری عمر اکیس سال کی تھی تو حبیب اللہ خاں امیر افغانستان تھے۔ حبیب اللہ خان فوت ہوئے تو پھر امان اللہ خان غازی تخت نشین ہوئے چنانچہ اسی امان اللہ خان نے ہی شاہ شہید محمد نادر خان کی سپہ سالاری میں اپنے لیے شاہ کا خطاب تسلیم کروایا۔ امان اللہ خان کے دورۂ یورپ کے بعد کابل میں بغاوت ہوئی۔ امان اللہ خان تخت کابل سے فرار ہو کر یورپ چلے گئے۔ جو کہ اب بھی زندہ ہیں۔ اور اٹلی میں گمنام زندگی بسر کر رہے ہیں۔ امان اللہ خان کے بعد حبیب اللہ عرف بچہ سقہ جو کہ ایک مشہور ڈاکو تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے بلائے ناگہانی بن کر کابل پر مسلط ہو گیا۔ لیکن جلد ہی شاہ شہید محمد نادر خان نے فرانس سے واپس آکر بچہ سقہ کے برخلاف جدوجہد شروع کی۔ پٹھانوں کے آزاد قبائل کو ساتھ ملا کر شاہ شہید نے افغانستان کو بچہ سقہ کی خونی گرفت سے آزاد کرا دیا۔ چنانچہ افغانستان کا یہی نجات دہندہ الملقب بہ شاہ محمد نادر شاہ افغانستان کے بادشاہ بن گئے جو کہ کچھ عرصہ تو زندہ رہے لیکن اتفاقاً تقریب انعامات کے ایک موقعے پر شہید کر دیے گئے۔ تو ان کے فرزند ولی عہد محمد ظاہر شاہ تخت نشین ہو گئے۔ جو کہ آج کل بھی شاہ افغانستان ہیں۔ افغان حکومتوں میں سب سے زیادہ مضبوط اور مفید حکومت شاہ ظاہر شاہ کی حکومت ہی ثابت ہو چکی ہے۔ گذشتہ ماہ فروری میں شاہ موصوف ہمارے ملک پاکستان کا ایک دوستانہ دورہ بھی کر چکے ہیں۔ شاہ موصوف کے اس

دورے سے یہ توقعات پیدا ہو چلے ہیں کہ پاکستان اور افغانستان دو ہمسایہ ملکوں کے درمیان دوستانہ رشتہ زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ جب کہ قدرتی لحاظ سے بھی یہ رشتہ قائم ہے۔ کیونکہ دونوں ہی اسلامی ملک ہیں۔ افغانستان کے بعض قبائل "پاوندے" غلزئی وغیرہ زمانۂ قدیم سے سردی کے موسم میں سابق صوبہ سرحد کے علاقوں میں آکر مقیم ہو جاتے تھے اور پھر موسم بہار میں ان کے قافلے واپس افغانستان کے شاداب دروں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ یہی وہ قبائل ہیں کہ جو کہ بالکل صحیح افغانی تہذیب کو اب تک ترک نہیں کر چکے ہیں۔ ان کے لباس اور رہن سہن کے وہی طریقے ہیں۔ جو کہ صدیوں پیشتر بھی تھے۔ یہ قبائل آزاد قسم کی خانہ بدوش زندگی ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ افغانستان اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جائیں۔ آمین۔

(۳) برطانیہ عظمیٰ

یادش بخیر، چھ ہزار میل دور سمندر کے پار جزائر برطانیہ میں رہنے والے ان انگریزوں کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ جنہیں دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا شوق ابتدا ہی سے رہا ہے اور جو کہ گیارہ سال پیشتر پاکستان و ہندوستان کے حکمران تھے۔ اور جو کہا کرتے تھے کہ "کہ ہم لوگ چلا جائے گا ٹم لوگ پھر ایک دوسرے کو مارے گا فرام کو یاد کریگا" سو سال کا عرصہ ہو چکا ہے کہ ہندو پاکستان کے لوگوں کا واسطہ تاج برطانیہ سے پڑ گیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کی بادشاہی مسلمانوں سے چھینی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں اس برعظیم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ تاہم دولت مشترکہ کی صورت میں انگریزوں کے ساتھ یہ تعلقات اب بھی قائم ہیں۔ ممالک دولت مشترکہ کے حکومتی دیویوں کے لیے انگلینڈ کی حیثیت میکے سی ہے۔

انگریزوں کی سخت کوشی، آپس میں مضبوط اتحاد، قومی نظم و ضبط ایک حوصلہ مند

اور با اصول قوم ہونے کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے وطن برطانیہ کے ساتھ والہانہ محبت ہے۔ اسی محبت نے تو انہیں مجبور کیا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے اقتصادیات سے متعلق رہیں۔ خواہ جس طریقے سے بھی ہو۔ انگریزوں کا بس چلے تو اب بھی ساری دنیا کی دولت سمٹ کر جزائر برطانیہ کے بنکوں اور خزانوں کو بھر دیں۔ یا اسلامی دنیا میں سے پٹرول کے چشمے اٹھا کر برطانیہ میں ہی جاری کر دیں۔ لیکن وہاں وسیع قسم کے ریگستان نہیں ہیں۔ ورنہ انگریز کے لیے ایسا کرنا بھی مشکل نہیں تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ سے قبل برطانوی حکومت ہی اپنے مقبوضات اور نوآبادیات کے بل بوتے دنیا کی عظیم قوت تھی اور انگریزی حکومت میں سورج کے غروب نہ ہونے کی مثل مشہور تھی۔ لیکن جنگ عالمگیر کے ختم ہوتے ہی حالات بدل گئے۔ باوجود فاتح ہونے کے انگریزوں کی حالت ہارے ہوئے قمار باز جیسی تھی۔ ہٹلر ظالم نے مرتے ہوئے برطانیہ عظمیٰ کی ہیئت اور دبدبے کو بھی مجروح کر دیا

"ہم تو مرتے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے"

کہ جس کی وجہ سے انگریز قوم دنیا کی سیاست اور منڈیوں پر چھائی ہوئی تھی۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب بھی انگریز سلطنت اقوام متحدہ کی پانچ بڑی طاقتوں میں سے ایک ہے۔ اور پھر امریکہ کی قوت کس کی ہے۔ اسے بھی تو انگریز اپنی ہی قوت سمجھتے ہیں۔ سائنس اور صنعت کی ارتقائی رفتار میں انگریز اب بھی برابر کے حصہ دار چلے جا رہے ہیں اور بین الاقوامی سیاسیات میں امریکہ کے ہم خیال اور ہم آواز ہی رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریز قوم میں منصف ضمیر اور حقیقت پسند افراد بھی ہوتے ہیں۔ اور جب کبھی ان کے روایتی انصاف پر حرف آنے کا سوال پیش آتا ہے تو انگریز جج ہمیشہ انصاف کے تقاضوں کا ہی احترام کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی برطانیہ کے لیے انگریز کا قومی کردار قابل تعریف ضرور ہے۔ ان کی سیاست تجارت اور تجارت سیاست ہوتی ہے۔

انگریز تاجدار ہمارے عہد میں

۱۔ ملکہ وکٹوریہ:۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں انگلستان میں قحط ہو گیا۔ عوام جا بجا جلوس نکالتے رہے شاہی محل کے آگے ایک جم غفیر نے مظاہرہ کیا۔ ملکہ نے کسی سے پوچھا یہ کیوں واویلا کرتے ہیں، کسی نے کہا کہ ملک میں آٹا نہیں ملتا۔ ملکہ نے فرمایا تو یہ لوگ کیک اور بسکٹ کیوں نہیں کھاتے۔ میرے جوانی کے عہد میں بھولی بھالی "وکٹوریہ" انگلستان کی ملکہ تھی جو کہ ایک نیک دل اور خدا ترس خاتون بھی مشہور تھی۔

ملکہ موصوفہ کے بعد ان کے ولی عہد شہنشاہِ ایڈورڈ ہفتم تخت نشین ہوئے۔ شاہ ایڈورڈ کے بعد ہی جارج پنجم شہنشاہ انگلستان بن گئے۔ جو کہ بڑے مرنجان و مرنج قسم کے بزرگ کہلاتے تھے۔ جارج پنجم جو بلیاں منا منا کر رخصت ہوئے تو زندہ دل ایڈورڈ ہشتم تخت نشین ہوئے۔ جن کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ مسز سمپسن کی محبت کو تخت و تاج پر ترجیح دے کر سربراہیٔ ملک سے دستبردار ہو گئے۔ شاہان برطانیہ کے صف میں شمار ہونے سے زیادہ اس نے رومیو قیس فرہاد وغیرہ کے "ایسوسی ایشن" کا ممبر بننا پسند کیا۔ ان کے حریف لارڈ بالڈون چل بسے۔ لیکن زندہ دل ایڈورڈ اب بھی زندہ ہیں۔ اور اپنی محبوبہ کے ساتھ "ہنی مون" مناتے جا رہے ہیں ایڈورڈ ہشتم کی دستبرداری کے بعد ان کے بھائی شہنشاہ جارج ششم شاہ انگلستان مقرر ہوئے شاہ موصوف کی چونکہ اولاد نرینہ نہیں تھی اور ان کے بعد ان کی بیٹی ملکہ الزبتھ برطانیہ کی ملکہ بن گئی جو کہ اب بھی ملکہ برطانیہ ہے۔ ہماری زندگی میں یہ دوسری خاتون ملکہ ہیں۔ یہ ہمارے بڑھاپے کا عہد ہے جبکہ برطانوی شہنشاہیت بھی بڑھاپے کی آخری سرحد میں پہنچ چکی ہے

ہمسایہ ریاستیں

(۱) چترال

چترال ہماری ہمسایہ ریاست ہے۔ حکمرانانِ چترال کے ساتھ ہمارے خاندانی تعلقات اس ریاست کے قیام سے بہت پہلے کے ہیں۔ میری والدۂ ماجدہ چترال کے شاہی خاندان سے متعلق تھیں۔ حکمران چترال امین الملک میرے نانا تھے۔ میری عمر اس زمانے میں دس برس سے کم تھی۔ ریاست چترال کا رقبہ چار ہزار مربع میل اور آبادی ڈیڑھ لاکھ سے کچھ اوپر ہی بیان ہوتی ہے۔ سکندر اعظم کے زمانے میں چترال بدھ مذہب کا مشہور مرکز تھا۔ سولھویں صدی میں افغانوں کے ذریعے چترال دین اسلام کی شعاعوں سے منور ہو گیا۔ چترال کے حکمران خاندان کا سلسلہ نسب ایشیا کے مشہور فاتح اعظم امیر تیمور سے ملتا ہے۔ تاتاری نسل کا وہی 'تیمور' جو کہ کبھی کبھی قاہر اعظم بن کر انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنواتا تھا۔ اور جو مغل شہنشاہیت کا جد اعلےٰ تھا۔

۱۸۹۱ء میں میرے نانا امین الملک چترال کے حکمران تھے امین الملک کا بڑا بیٹا نظام الملک تھا جو کہ گل گت میں رہتا تھا جب امین الملک فوت ہو گیا تو اس کے چھوٹے بیٹے نے انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر کے مہتر چترال بن بیٹھا۔ نظام الملک نے گلگت سے آکر حملہ کر دیا۔ لیکن ناکام واپس ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ امین الملک کو بھی زہر دیا گیا تھا۔ امین الملک کا ایک بھائی شیر افضل تھا جو کہ بدخشاں میں مقیم تھا۔ چنانچہ اسی شیر افضل نے

بدخشاں سے آکر قلعے پر حملہ کر دیا کہ جس میں نیا مہتر چترال مقیم تھا۔ شیر افضل نے اسے قتل کر دیا انگریزوں کی شہ پا کر چترال کے لوگوں نے شیر افضل کی مخالفت کی اور اسے کوہستان دیر کی طرف بھگا دیا۔ چنانچہ انگریزوں نے اب نظام الملک کو ہی مستحق سمجھ کر گلگت سے طلب کیا اور اسے مہتر چترال بنا دیا ۱۸۹۵ء میں شجاع الملک جو اس کا بھائی تھا نے شکار کھیلنے کے دوران میں نظام الملک کو قتل کر دیا اور خود ہی مہتر چترال بننے کا اعلان کیا۔ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ اس دوران میں شیر افضل نے باجوڑ کے خان عمرا خان کے ساتھ مل کر چترال پر فوج کشی کر کے ۱۸۹۵ء میں ہی اسے فتح کر لیا۔ اور پھر شجاع الملک ہی چترال کے حکمران رہے۔ اس کے عہد میں ہی انگریزوں نے مہتر چترال کے لیے "ہز ہائی نس" (His Highness) کا موروثی خطاب بخشایا۔ ۱۹۳۶ء میں شجاع الملک کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد ناصر الملک مہتر چترال بن گیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں مظفر مظفر الملک حکمران ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں جب مذکورہ حکمران چترال فوت ہو گیا تو اس کا بیٹا شہزادہ سیف الرحمٰن مہتر چترال بنا۔ یہ نوجوان حکمران ۱۹۵۴ء میں پشاور سے چترال جاتے ہوئے ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تب سے چترال میں ایک کونسل کے ذریعے حکومت قائم ہے۔ ولی عہد ریاست ابھی کمسن ہے

(۲) ریاست دیر و جندول

ریاست دیر ہماری قریبی ہمسایہ ریاست ہے۔ ریاست دیر کے حکمرانوں سے بھی ہمارے تعلقات پرانے ہیں ریاست دیر کا رقبہ تین ہزار مربع میل اور آبادی اور چھ لاکھ سے کچھ اوپر ہی بیان ہوتی ہے۔ یوں تو ریاست دیر کے حکمران خاندان کا سلسلہ نسب ملا الیاس المشہور اخون بابا سے ملتا ہے۔ جس کی اولاد میں غلام خان پہلا شخص تھا جو کہ طاقتور ہو کر دیر کا خان بن گیا پھر رحمت اللہ خان، خان آف دیر بنا۔ چنانچہ رحمت اللہ خان کے بعد شریف خان باپ کی مسند پر بیٹھ گیا۔ یہ ہمارے بچپن کا زمانہ تھا۔ ۱۸۹۰ء میں باجوڑ کے خان عمرا خان نے دیر پر حملہ

کر کے شریف خان کو دیر چھوڑنے اور سوات میں پناہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ۱۸۹۵ء میں جب عمراخان نے چترال پر حملہ کیا تو انگریزوں نے محمد شریف خان کو دیر کا نواب بنادیا۔ حالانکہ اس سے پہلے صورت حال یوں تھی کہ عمراخان انگریزوں کا دوست تھا۔ اور شریف خان کے تعلقات بحیثیت خان دیر حکومت کابل کے ساتھ تھے۔ نواب محمد شریف خان کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب خان نواب دیر ہوگیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء تک یہی نواب صاحب ہی ہمارے میدان کارزار کے حریف تھے۔ ۱۹۲۵ء میں جب نواب صاحب فوت ہوگئے تو ان کے ولی عہد فرزند شاہ جہان نواب دیر بن گئے جو کہ اس وقت بھی دیر کے نواب ہیں۔ محمد شاہ خسرو خان نواب صاحب کے فرزند ولی عہد ریاست ہیں۔ نواب صاحب کے دوسرے فرزند شہاب الدین خان آف جندول ہیں وہ خوشگوار علاقہ کہ جس کا خان عمراخان تھا جو کہ انگریزوں سے شکست کھاکر پھر کابل میں پناہ گزین ہوگئے۔ اس کے بعد علاقہ جندول بھی ریاست دیر کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔

(۳) ریاست امب "تناولی ریاست"

ریاست سوات و متعلقات کے جنوب مشرق کو ہی "امب" کی ریاست ہے ریاست امب میں افغانوں کی تناولی شاخ آباد ہے اس ریاست کا رقبہ دو سو پچیس مربع میل ہے۔ اور آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ ہمارے لڑکپن کے عہد میں جبکہ میری عمر آٹھ برس کی تھی یعنی ۱۸۹۰ء میں محمد اکرام خان امب کا نواب تھا۔ ۱۹۰۷ء میں فوت ہوگیا۔ تو اس کا بیٹا خان زمان حکمران امب ہوا۔ چنانچہ فروری ۱۹۳۶ء تک خان زمان امب کا نواب رہا۔ ۱۹۲۶ء میں نواب خان زمان کے عہد میں ہی امب کی فوج ریاست سوات کے برخلاف وادی چملہ میں صف آرا ہوئی تھی جسے شکست دے کر واپس کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں نواب صاحب فوت ہوئے تو جلاوطن ولی عہد محمد فرید خان

نواب امب بن گئے جو کہ اب بھی زندہ ہیں۔ لیکن ان کے حاکمانہ اختیارات کچھ عرصہ ہوا کہ معطل ہو چکے ہیں۔ یہ سب ریاستیں اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے ساتھ ملحق ہیں۔ چترال کے علاوہ سوات، دیر، امب، کی تینوں ریاستیں پٹھانوں کی ہیں جن کی زبان پشتو ہے البتہ چترال کے لوگ پٹھانوں سے مختلف جیسے ہیں۔ ان کی بولی بھی پشتو نہیں۔

میاں گل عبدالودود بانیٔ ریاست
سوات و سابق اولین حکمران سوات

جہانِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
(اقبال)

بانیٔ ریاست سوات کا کردار اخلاق و عادات

حصّہ چہارم

کردار کا آئینہ

از

محمد آصف خان

بادشاہ صاحب حکمرانی سے فارغ ہونے کے بعد

بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء کو حکمرانی کے فرائض اور سیاسی دھندوں سے فارغ ہو کر اب بادشاہ صاحب کی زندگی بس عبادت اور حصول تعلیم میں ہی بسر ہوتی ہے۔ ریاست سوات کی تعمیر و استحکام کے تاریخی واقعات بیان ہونے کے بعد اب میں اپنی بساط کے مطابق کوشش کروں گا کہ بادشاہ صاحب کے سیرت اور شخصی عظمت کا بالکل ہی حقیقی خاکہ پیش کر سکوں۔ اس ضمن میں کسی مبالغے کے لیے میں قطعاً پابند نہیں ہوں؛ البتہ عرض کروں گا کہ ہمارے ماحول میں سوچنے والے حقیقت پسند لوگ بہت زیادہ نہیں ہیں۔ اس نئے دور میں عام طور سے انسانی ضمیروں کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی ہے۔ جن میں صداقت کا وجود ہی نہیں۔ ہر شخص اپنے مفاد اور اغراض کا کچھ ایسا تابع ہو گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں اتنا مصروف ہو گیا کہ کسی حقیقت کو پرکھنے یا اس کے متعلق سوچنے کی انہیں فرصت ہی نہیں۔ ذہنی لحاظ سے ہمارے ماحول میں اکثریت کی یہ حالت ہے کہ ان کی مثال تو بچوں جیسی ہے اگر کسی اور شئے سے تشبیہہ دوں تو پھر وہ خفا ہو جائیں گے۔ اس لیے یہی کہوں گا کہ یہ بچے ہی تو ہیں جو گھڑی گھڑی بہلتے ہیں۔ بہرکیف جو کچھ بھی ہے میں حتے المقدور کوشش کروں گا کہ جو کچھ حقیقت ہو وہی پیش کروں۔

ایک مستقل مزاج اور با اصول انسان کی حیثیت سے بادشاہ صاحب کی زندگی ایک خاص پروگرام اور ضابطے کے تحت بسر ہوتی ہے۔ اگرچہ بادشاہ صاحب اب سوات کے

حکمران نہیں ہیں تاہم بانیٔ ریاست سوات اور اولین حکمران ریاست اور نیز اس دیس اور عوام کے محسن اعظم کی حیثیت سے اب بھی مصروفیت زیادہ ہے اور بحیثیت حکمران سابق ان کے اخراجات کا سلسلہ بھی حسب دستور چل رہا ہے لیکن چونتیس سال مسلسل حکومت اور خدمت کرنے کے باوجود بادشاہ صاحب کے شاہانہ گزر اوقات کے لیے ریاستی خزانے سے کوئی پنشن وغیرہ نہیں لیتے بادشاہ صاحب کی اپنی جائداد ہے جس کی آمدن ان کے اخراجات کی کفیل ہے۔ صاحب سوات کے سجادہ نشین کی حیثیت سے اب بھی ان کے معتقدین اور بیرونی اور اندرونی علاقوں کے مہمان ملاقات کے لیے آتے جاتے ہیں۔ اگرچہ بادشاہ صاحب کی دلی تمنا اب یہ ہے کہ دنیاوی معاملات اور دنیاوی الجھنوں سے اب بالکل دور رہیں تاکہ زیادہ وقت عبادت اور کلام پاک کی تلاوت میں بسر کریں۔ اس کے باوجود کہ ذاتی جائداد کافی تھی حکمران سوات بھی تھے۔ لیکن شاہراہ حیات پر بادشاہ صاحب کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ موصوف نے دوسرے حکمرانوں یا راجوں اور نوابوں کی طرح اپنی زندگی عیش و عشرت کے ہنگاموں میں ضائع ہونے نہیں دی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ہمیشہ اعتدال سے ہی کام لیتے رہے۔ اور متوازن زندگی بسر کرتے ہیں حکمران سوات کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لیے اپنی عظیم ذمہ داریوں سے غافل نہیں رہے۔ بادشاہ صاحب کے عظمت کردار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انیسویں صدی کے عظیم برگزیدہ انسان صاحب سوات کی عظمت اور تقدس کی حقیقت وارث کی حیثیت سے بادشاہ صاحب کا کردار ہمیشہ شرع محمدی کے تابع رہا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہونے کے بعد بڑے پارسا قسم کے مقتدر حضرات بھی بہک جاتے ہیں اور پھر اپنے ہاں تو خدا کا فضل ہے کہ ہر دور میں ایسے اجارہ داران شریعت بھی بکثرت ملتے ہیں۔ کہ جو حکمرانوں کے لیے شریعت کے اٹل قوانین میں بھی لچک یا نرمی پیدا کرنے میں ذرہ بھی ہچکچاتے نہیں۔ اور حکمران بھی وہ ہوتے ہیں کہ بس تاویلات کا ہی سہارا

لیتے ہیں۔ لیکن بادشاہ صاحب کہ جن کا اپنا ہی کردار مضبوط ہے فولاد کی طرح مضبوط۔ انہوں نے قطعاً اپنے لیے اس قسم کے جواز تلاش نہیں کیے۔ ان کی زندگی صحیح معنوں میں مجاہدانہ سپرٹ سے لبریز مؤمنانہ زندگی ہے۔ حکمران بننے کے بعد بادشاہ صاحب زیادہ نکھر گئے اور اپنے خالق حقیقی کے صدق دل سے شکر گذار ہو گئے۔ کہ قدرت نے انہیں ملت اسلامیہ کے ایک حصے یعنی لاکھوں مسلمانوں کی سربراہی اور حکمرانی کے اعزاز عطا کیے۔ سوات کا حکمران بننا اگرچہ آپ کے لیے کوئی اہم بات نہیں تھی وجوہات یہ تھیں کہ صاحب سوات کے جانشین کی حیثیت سے ان کا روحانی اقتدار پہلے ہی سے پٹھان قوم کے لاکھوں افراد اور ہر قبیلے پر قائم تھی۔ جائداد کافی تھی اور ہر دنیاوی خواہش اگر چاہتے تو پوری ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سوات کے لوگوں نے جب ۱۹۱۵ء سے پہلے آپ کو حکومت بنانے کی دعوت دی تو آپ نے منظور نہ کی۔ اس لیے کہ آپ کو یقین تھا کہ خاندانی اختلاف کے ہوتے ہوئے آپ حکمرانی کے فرائض صحیح طریقے سے ادا نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا محض ذاتی اقتدار کے لیے حکمران بننا آپ نے گوارا نہ کیا ہم دیکھ رہے ہیں کہ اقتدار کے لیے یار لوگ آج کے دور میں کس قدر مجنونانہ بیتابی کے مظاہرے کرتے ہیں۔ اور حصول اقتدار کے لیے کیا سے کیا کر جاتے ہیں۔ بادشاہ صاحب کے مخلصانہ کردار اور عظمت کا تابناک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے حکمرانی کی ذمہ داری تب قبول کی جب اپنے آپ کو اس کے قابل پایا۔ ایک حقیقت پسند اور روشن ضمیر انسان کی حیثیت سے کبھی اپنی قوم کو اندھیرے میں نہیں رکھا۔ بلکہ قوم کو صاف کہہ دیا۔ کہ ہمارے خاندانی اختلافات کے ہوتے ہوئے حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی مشترکہ حکومت ایک حماقت کے سوا اور کچھ نہیں اور ساتھ ہی اپنے بھائیوں سے کہا کہ حکمرانی کے خیالات اپنے دلوں سے نکال دو۔ کہ جب ہم خود متحد نہیں ہیں تو دوسروں سے اتحاد کی توقع کیسے کر سکتے ہیں۔

۲۔ اس کے بعد رضا کارانہ طور سے حکومت سے دستبرداری بادشاہ صاحب کی انتہائی بلند کرداری کا ایک واضح ثبوت ہے۔ تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ کسی حکمران نے

خود بخود رضاکارانہ طور سے اپنے ولی عہد کے لیے حکومت کی گدی خالی کی ہو یہ تو وہ دیوی ہے کہ اس کے وصال کے لیے ہر قسم کے رشتوں کو خیر باد کہا جاتا ہے علاؤالدین نے جلال الدین جیسے شفیق چچا اور خدا ترس حکمران ہند کو ۱۲۹۵ء میں محض تخت حکومت پر بیٹھنے کی خاطر ہلاک کر دیا۔ حالانکہ خود ولی عہد ہی تھا۔ بادشاہت کی دیوی کے فراق کی زحمتیں برداشت کرنے کے لیے تو فولادی دل چاہیئے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اورنگ زیب جیسے متشرع انسان نے اس کے لیے ہی اپنے باپ شاہجہان کو قید میں ڈالا۔ اور بھائیوں کو قتل کیا حتےٰ کہ اپنے داماد سلیمان شکوہ کے خون سے ہاتھ رنگ کر اپنی ہی بیٹی زیب النساء کا سہاگ اجڑ دیا۔ تاریخ عالم اس نوع کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ لیکن یہ چھوٹی سی ریاست سوات ہے۔ کہ اس کے معمار کی مثال ان سب سے مختلف ہے کہ اپنے ولی عہد کے لیے خود ہی حکومت کی گدی چھوڑ کر یاد الٰہی میں مصروف ہو گیا۔ صدیاں گزر چکی ہیں کہ زرتشت کے عہد میں ایرایران اور بلخ کے ایک بادشاہ گشتاسپ اپنے ولی عہد گرامی اسفندیار کو رضاکارانہ طور سے حکومت حوالے کر کے خود اسی طرح ریاضت اور عبادت میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد تاریخ پھر اس قسم کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

۳۔ بادشاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے "شر کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اور نہ ہی پسند کرتا ہوں لیکن اس ماحول میں یہ مصیبت تھی کہ دوسرے لوگ شر کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ میرے چچازاد بھائیوں میں جب سید بادشاہ نے پہل کی تو حکمران سوات بننے کے شوق میں ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ اور اپنے سگے بھائی امیر بادشاہ کو بھی ختم کرنے کی تجویزیں سوچنے لگا۔ اس وقت باوجود کمسن ہونے کے بزرگی کے فرائض میں نے ادا کیے۔ مصالحت اور آشتی کے لیے ہر کوشش کی۔ لیکن سید بادشاہ اپنے خطرناک مجرمانہ ارادوں کو ترک کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ لہذا اپنی جان کی حفاظت کرنا ہر ذی روح کا فرض ہے چنانچہ چاہ کن را چاہ

درپیش کے مصداق پر عمل ہو گیا۔ پھر امیر بادشاہ نے طاقتور ہو کر وہی خواب دیکھنے شروع کیے کہ جنہیں دیکھتے ہوئے سید بادشاہ زندگی کھو بیٹھے۔ اب امیر بادشاہ کو بھی سمجھایا گیا۔ لیکن اسکی بھی یہ حالت تھی کہ ملنے والا نہیں تھا۔ لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر بادشاہ بھی اپنی زندگی سے کھیل چکے اس طرح دوسروں کے ساتھ بھی ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ "شر" سے بچے رہیں۔ لیکن بعض طاقتور افراد کی ذہنیت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ کسی قسم کی مصالحت اور سمجھوتے کے حق میں نہیں ہوتے اور اس کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ کہ شر پسندوں کے شر سے خود کو محفوظ کیا جائے اور یا اپنے آپ کو ان کے مجرمانہ خطرناک ارادوں کے سپرد کیا جائے ظاہر ہے کہ موخرالذکر تو کوئی بھی اپنے حق میں پسند نہیں کر سکتا۔

۴۔ عیش و عشرت کی محفلیں منعقد کرانا تو کجا بادشاہ صاحب شاہانہ لذیذ غذاؤں کے بھی شوقین نہیں ہیں۔ البتہ دوسروں کو کھلاتے ہوئے لطف محسوس کرتے ہیں۔ گذشتہ پندرہ سال سے مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔ البتہ شکار کے ایام میں اور عیدین کی تقریبوں پر آپ کا روزہ نہیں ہوتا۔ یہ حالت پندرہ سال سے بس یونہی چلی آ رہی ہے۔ کہ آپ صرف ایک وقت یعنی شام کو معمولی کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد قہوہ پیتے ہیں۔ قہوہ چائے آپ کو پسند ہے۔ مگر وہ بھی دودھ میں صرف چینی اور الائچی ابال کر جو کہ نہایت مفرح اور خوشگوار ہو جاتی ہے

روزانہ پروگرام

حکمرانی سے دستبردار ہونے کے بعد آپ کی روزمرہ زندگی کس طرح بسر ہوتی ہے۔ اس کے متعلق باقاعدہ پروگرام جو ہے وہ کچھ حسب ذیل ہے۔

۱۔ ہر رات عشاء کی نماز پڑھ کر پندرہ منٹ کے بعد سو جاتے ہیں۔

۲۔ صبح کی نماز سے دو تین گھنٹے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں۔ تہجد کی نماز پڑھتے ہیں اور پھر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں تاکہ وقتیکہ مؤذن صبح کی اذاں دے دیتا ہے۔

۲۔ صبح کی نماز پڑھ کر اس کے بعد ورزش کے لیے نکل جاتے ہیں شاہی محل کے متصل پہاڑ پر پانچ سو فٹ کی بلندی تک چڑھنا آپ کا معمولاً ورزش ہے دس سال پہلے ایک ہزار فٹ کی بلند چوٹی تک جانا معمول تھا لیکن اب یہ ورزش پانچ سو فٹ تک محدود ہے۔ ورزش سے واپس آکر کچھ دیر کے لیے سستا لیتے ہیں۔ اور پھر آٹھ بجے تک کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں

۳۔ آٹھ بجے سے بارہ بجے دوپہر تک بادشاہ صاحب اپنے دفتر میں ہوتے ہیں اسی دفتر میں کہ جسے کبھی ریاست سوات کی عدالت عالیہ کی حیثیت حاصل تھی۔ حکمرانی کے عہد میں میں تو مقدمات کے فیصلے اور دوسرے محکموں کے کام ہوتے تھے لیکن آج کل بھی مصروفیت کا وہی عالم ہے۔ البتہ اب کی مصروفیت کا رنگ مختلف ہے۔ صبح آٹھ بجے جب آپ دفتر میں بیٹھتے ہیں تو بشرطیکہ کوئی ملاقاتی موجود نہ ہو اپنے استاد مولوی صاحب کو طلب کرتے ہیں ان سے کلام پاک یا سیرت النبی پڑھتے ہیں۔ قرآن شریف اگرچہ باترجمہ کئی بار پڑھ چکے ہیں لیکن بادشاہ صاحب دنیا کے اس عظیم جامع اور مقدس کتاب کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کلام پاک کی بے انتہا عظمت سے انہیں والہانہ محبت ہے نو بجے کے بعد ملاقاتیوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بائیے ریاست سوات ملاقاتیوں میں حسب ذیل قسم کے لوگ ہوتے ہیں:۔

۱۔ ریاست سوات کے دیرینہ واقف کار معززین اور خوانین وغیرہ جو کہ سلام یا کسی عرض معروض کے لیے آتے ہیں۔ ملاقات سے مراد صرف نیازمندی اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے

۲۔ معمر قسم کے جانے پہچانے اگلے وقتوں کے سفیدریش سادہ دل افراد میدان کارزار کے رفیق جو سلام کے لیے آتے ہیں۔ اور یا دنیاوی معاملات میں کسی جائز سفارش یا امداد مناسب کے خواہاں ہوتے ہیں۔

۳۔ محتاج اور نادار قسم کے سائل لوگ جو کہ محض اس خیال سے آتے ہیں کہ بادشاہ صاحب ان کی کچھ امداد کریں اس قسم کے افراد میں مستحق افراد کو حتی الوسع محروم نہیں کیا جاتا۔

۴۔ بیمار قسم کے مریض لوگ جو ریاست یا بیرون ریاست کے علاقوں سے دعا کے لیے بادشاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اس قسم کے افراد کو بادشاہ صاحب دعا کے ساتھ دوا کی بھی ہدایت کرتے ہیں۔ اور سرکاری ہسپتال جانے کی تاکید فرماتے ہیں اور اگر ناواقف قسم کا مریض ہو تو اپنا اردلی ساتھ بھیج کر اُسے ہسپتال تک پہنچا دیتے ہیں۔

۵۔ ضلع بنوں، کوہاٹ، وزیرستان، خیبر، پشاور اور دوسرے قبائلی علاقوں سے آئے ہوئے معتقدین کے ساتھ ملاقات اور ان کی دلجوئی اور خاطر تواضع مارچ سے جولائی تک ہر سال اس قسم کے معتقدین لوگ روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں آتے ہیں۔

۶۔ بیرونی ممالک کے سیاح اور معزز لوگ جو ریاست سوات میں سیاحت کے لیے آتے ہیں۔ اور پھر ریاست کو خلاف توقع دلچسپ اور ترقی یافتہ حالت میں دیکھ کر والئے سوات اور بانئے ریاست کے ساتھ ملاقات کے آرزومند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم باشعور اور روشن ضمیر حضرات بادشاہ صاحب سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

۷۔ بیرونی علاقوں کے سیاح یا افسر لوگ، اور نیز پاکستان کے مختلف شہروں کے سیاح اخباری طبقے کے افراد جو کہ سوات آتے ہیں تو بادشاہ صاحب سے ضرور ملتے ہیں۔ بادشاہ صاحب کے ساتھ خندہ پیشانی اور محبت سے ملتے ہیں مہمانوں کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔ اور ان کی خاطر تواضع بھی کرتے ہیں۔ آج سے دس سال پہلے بھی بادشاہ صاحب کا جو رویہ تھا وہی اب بھی ہے اخباری لوگ اپنے کیمروں سے تصویریں لینے پر اصرار کرتے ہیں تو بادشاہ صاحب ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہیں۔

۸۔ ریاست سوات اور بیرون جات کے علمائے کرام بادشاہ صاحب وارثان انبیاء کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ لہٰذا اس طبقے کے افراد کو بھی بادشاہ صاحب کے ساتھ عقیدت ہے ملاقات کے لیے آتے رہتے ہیں۔ بادشاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حکمرانی اور سیاسی دھندوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے سے میرا مطلب تو یہ تھا کہ مجھے عبادت اور تعلیم کیلئے

زیادہ وقت ملے گا لیکن ان ملاقاتیوں کی دل شکنی تو مجھے ہرگز منظور نہیں ؎

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے
(ذوق)

۹۔ ٹھیک بارہ بجے دوپہر دفتر کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ تو کھانے کا وقت ہوتا ہے شاہی محل کے ایک سلامت کوچے میں چار طویل میزوں پر کھانا چن دیا جاتا ہے۔ بادشاہ صاحب کے ذاتی سٹاف کے سب ممبر اور مہمان ایک ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں خود بادشاہ صاحب کا تو روزہ ہوتا ہے۔ البتہ بادشاہ صاحب کی بجائے شہزادہ سلطان روم صاحب کھانے میں شامل ہوتے ہیں۔ جو کہ خصوصی مہمانوں کی خاطر تواضع بھی کرتے ہیں۔

۱۰۔ کھانا ختم ہو جاتا ہے تو پھر مہمانوں کو بادشاہ صاحب قہوہ پلاتے ہیں۔ بارہ بج کر پنتالیس منٹ پر ظہر کی نماز ادا ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ ایک خوبصورت سی مرمریں مسجد محل کے اندر بنائی گئی ہے۔ جمعہ شریف اور عیدین کی نمازیں اسی مسجد میں پڑھی جاتی ہیں باقی نمازیں رہائشی محل کے ایک مخصوص کمرے میں پڑھی جاتی ہیں۔ نمازیں پڑھانے کے لیے حافظان قرآن دو امام مقرر ہیں جنکی ڈیوٹی ہفتہ وار ہوتی ہے ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد بادشاہ صاحب صرف پندرہ منٹ آرام کرتے ہیں۔ پھر احادیث کی کتابیں پڑھتے ہیں۔

۱۱۔ پانچ بجے کے بعد اپنی مخصوص وضع کی بنائی ہوئی لاری میں اپنے مخصوص دو تین احباب اور شہزادہ صاحب سمیت سیر کے لیے جاتے ہیں۔ اور افطار روزہ سے صرف دس منٹ پہلے واپس اپنے محل میں پہنچ جاتے ہیں۔ روزہ کھول کر شام کی نماز باجماعت[1] پڑھتے ہیں نصف گھنٹہ گزرنے کے بعد شام کا کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ شام کے دسترخوان پر بادشاہ صاحب بہ نفس نفیس شامل ہوتے ہیں۔ لیکن کھانا بہت کم کھاتے ہیں۔ عشاء کی نماز پڑھ کر پندرہ منٹ

---

[1] بادشاہ صاحب سب نمازیں باجماعت پڑھتے ہیں۔

بعد سو جاتے ہیں بس اسی پروگرام کے مطابق ان کی زندگی بسر ہوتی ہے البتہ شکار کے موسم میں جمعرات اور اتوار ہفتے میں دو دن شکار کھیلتے ہیں۔

ریڈیو اور خبریں

بادشاہ صاحب کو ریڈیو سے صرف اس قدر دلچسپی ضرور ہے کہ پاکستان ریڈیو کی خبریں سنتے ہیں پاکستان کے ساتھ بادشاہ صاحب کو شدید محبت ہے لہذا ایک محرر ریڈیو سے خبریں سن کر نوٹ کر لیتا ہے جو کہ بادشاہ صاحب کو دوبارہ سناتا ہے۔

پاکستان کے لیے نیک دعائیں

پاکستان کے ساتھ قلبی تعلق اور دعاؤں کا ذکر باب دوم میں مقصود تھا لیکن سہواً رہ گیا۔ بادشاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جس روز کشمیر کے محاذ پر جہاد شروع ہوا اس روز سے لیکر آج تک جبکہ ۱۹۵۸ء ہے میں پاکستان کے لیے نیک دعاؤں میں مصروف ہوں ممکن ہو سکتا ہے کہ دس سال کے اس طویل عرصے میں شاذ و نادر کوئی ایسا موقع پیش آیا ہو کہ مجھے دعا کیلئے موقع نہ ملا ہو۔ ورنہ نماز کے بعد میں پاکستان کے لیے دعا کرتا ہوں بالخصوص دعائے نیم شبی میں سب سے اول پاکستان کو یاد کرتا ہوں اور جب تک زندگی رہے گی۔ میری نیک دعائیں پاکستان کے ساتھ رہیں گی۔ پاکستان دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے اور پاکستان کی ترقی میں ملت اسلامیہ کے عروج اور حیات ثانیہ کا بھی راز مضمر ہے۔

دنیاوی دھندے

حکمرانی سے دستبردار ہونے کے بعد بادشاہ صاحب اب دنیاوی معاملات سے کوئی خاص سروکار نہیں رکھتے۔ بادشاہ صاحب کے اوصاف میں یہ وصف بھی قابل ذکر ہے۔ کہ

جس شخص کو اختیارات دے دیتے ہیں۔ تو پھر اس کے کاروبار میں بے جا مداخلت ہرگز نہیں کرتے۔ چنانچہ گذشتہ دس سال سے جبکہ حکومت سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ بادشاہ صاحب کی ذاتی جائداد یعنی عین المال کے مختار سوات کے علاقہ شموزئی سے متعلق ایک خان ہیں۔

سیکرٹری اور مختار جائداد

طالعمند خان بی اے ایل ایل بی جو کہ "شموزئی" کے خوانین میں سے ایک ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب بادشاہ صاحب کے سیکرٹری اور مختار جائداد ہیں۔ شاہی محل میں سٹاف کے ناظم اعلےٰ بھی یہی خان صاحب ہیں۔ گذشتہ دس سال سے بادشاہ صاحب کے عین المال کے حساب کو بڑی چابکدستی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے مالی اختیارات انہی کو حاصل ہیں۔ اپنے فرائض کو نہایت احسن طریقے سے انجام دیتے جا رہے ہیں بادشاہ صاحب کے رہائشی محل میں ہی ان کا دفتر ہے۔ بڑے سخت قسم کے محاسب ہیں۔ جو کہ ان کے فرائض کے تقاضے بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ مرغزار کے مشہور "سیب" آپ ہی کی جد و جہد کا نتیجہ ہیں۔

شکار

بادشاہ صاحب ابتدائے عمر ہی سے شکار کے شوقین ہیں اس عمر میں جب کہ آپ کی عمر چھہتر سال ہے آپ کا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ شکار کے ضابطوں اور طریق کار میں اور نیز حکمرانی کے طریق کار میں بقول خوشحال خان خٹک ایک خاص قسم کی مشابہت ہے طریقہ یہ ہے کہ نومبر کی تیرہ تاریخ سے جب حکمران سوات "والی صاحب" شکار شروع کر دیتے ہیں تو پھر بادشاہ صاحب بھی شکار کے پروگرام پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ ہفتے میں دو دن جمعرات اور اتوار شکار کیلئے وقف ہوتے ہیں۔ شکار میں بادشاہ صاحب کے ساتھ خاص "احباب" شہزادہ صاحب اور

پاکستان کا کوئی جانا پہچانا افسر اکثر شامل ہوتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ بادشاہ صاحب کو شکار کھانے کا نہیں بلکہ شکار کھیلنے کا شوق ہے۔ شکار شدہ پرندے، مثلاً تیتر اور چکور وغیرہ، جرم ضعیفی کے سزاوار جب اپنے ساتھ لے آتے ہیں تو اکثر شام کو ہی واپس ہوتے ہیں۔ لہٰذا دوسرے دن علی الصبح یہ شکار شدہ پرندے بادشاہ صاحب خود ہی تقسیم کر دیتے ہیں۔ بادشاہ صاحب کے شکار سے بس مخصوص افراد ہی مستفیض ہوتے ہیں۔ پشاور اور مردان کے مخصوص احباب کو بھی کبھی کبھی بھیجتے ہیں۔ طبقہ علمائیں سے مینگورہ کے مولوی فضل الٰہی صاحب کے حصے میں بھی ایک اور کبھی دو تیتر آجاتے ہیں۔ شکار کے لیے کبھی کبھی باز وغیرہ شکاری پرندے بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ ورنہ عموماً اپنے مخصوص بندوق سے ہی شکار کھیلتے ہیں عبادت اور حصول تعلیم کے بعد دوسرے نمبر پر بادشاہ صاحب شکار کے شوقین ہیں اور شکار کا شوق بھی کیا ہے، بس ؎ لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانہ

تیرہ مارچ کو ریاست میں شکار کا موسم ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر شکار نہیں کھیلتے لیکن شکار کے مخصوص دن اتوار کو بادشاہ صاحب کی چھٹی ہوتی ہے۔

حکمرانی کے بعد سوات کا تعمیرِ نو میں حصہ

۱۔ بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء کے بعد ریاست سوات کے تعمیر و ارتقاء کا دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔ بادشاہ صاحب کے جانشین اعلےٰ حضرت والیٔ سوات نے ایک مثالی ریاست بنانے کے لیے یہ منصوبہ بنایا کہ شہر مینگورہ اور دوسرے قصباتی بازاروں کو از سرِ نو جدید طرز کے مطابق خوبصورت اور پختہ تعمیر کیا جائے۔ تاکہ ایک تو شہروں کی نفاست اور رنگینی میں اضافہ ہو دوئم یہ کہ آگ لگ جانے کی صورت میں زیادہ نقصان اور تباہی نہ ہو چنانچہ اس منصوبے میں بھی بادشاہ صاحب نے یوں حصہ لیا کہ مینگورہ شہر کے بازار میں اپنی ملکیت دکانوں کو از سرِ نو تعمیر کروایا۔ جدید طرز کی خوبصورت پختہ دکانیں، ایک عالیشان ہوٹل اور کئی منڈیاں بھی بنوائیں۔ واضح رہے کہ ان سب کی عمارات قابلِ دید حد تک خوبصورت ہیں۔ چنانچہ بادشاہ صاحب کی تقلید میں دوسرے صاحبِ حیثیت لوگوں نے بھی اپنی ملکیت دکانیں اور دوسری بازاری عمارات پختہ بنوائیں۔ لہٰذا قلیل عرصے میں بہت جلد سہر مینگورہ کے بازار نے ایک خوبصورت اور عالیشان بازار کی شکل اختیار کر لی جس کے ساتھ ہی مینگورہ شہر کی صورت بھی بدل گئی۔ چنانچہ والیٔ صاحب نے مینگورہ بازار اور اطراف کی سڑکوں کو پختہ کروا کر بازار کی صفائی اور نفاست میں مزید اضافہ کر دیا۔ اب ریاست سوات کے مرکزی شہر مینگورہ کا بازار اس نفاست اور صفائی کے لحاظ سے سرحدی ماحول میں اپنی طرز کا واحد بازار ہے۔ جبکہ اس شہر اور اس کے بازاروں کی تزئین و تعمیر کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ بادشاہ صاحب نے اسی شہر مینگورہ میں عوامی ضروریات کے پیشِ نظر ایک عالیشان حمام بھی تعمیر کروایا۔ تاکہ ریاست کے خوانین وغیرہ کو محض حمام کے لیے

پشاور اور مردان وغیرہ جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اس حمام کی تعمیر پر کافی روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔

۲۔ حبیب بنک اور کوآپریٹو بنک کے دفاتر اور ان کے مینجروں کی رہائش گاہیں۔ یہ سب عمارات قابل دید ہیں۔ ان خوبصورت عمارتوں کی تعمیر پر صرف کی جانے والی رقم یقیناً اگر دوسرے کاروبار میں لگائی جاتی تو نسبتاً زیادہ فائدہ ہوتا۔ لیکن ان عمارات کی تعمیر سے مقصود ہی شہر مینگورہ میں قابل دید مقامات کا اضافہ تھا۔ تاکہ شہر اور بازار کی رونق دوبالا ہو۔

۳۔ مردان روڈ بریکوٹ برلب سڑک ایک قصبہ ہے جسے اگر ریاست سوات میں داخلے کا دروازہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اسی برلب سڑک قصبے کا یک رویہ مختصر بازار بھی بانیٔ ریاست سوات کا تعمیر کردہ ہے۔ چونکہ شمالی طرف کی یہ سب دکانیں بادشاہ صاحب کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا انہیں جدید طرز کے مطابق تعمیر کرایا ہے۔ اس برلب سڑک بازار کی جدید تعمیر ایک موزوں کارنامہ ہے۔

۴۔ علاقہ بونیر میں دیوانہ بابا تک جانے کے لیے ایک برانچ سڑک بھی بادشاہ صاحب نے ذاتی صرفے سے بنوائی ہے۔ اگرچہ اس سڑک کی تعمیر سے مدعا اس طرف کے شکار گاہوں تک راستہ نکالنے کا بھی تھا لیکن اب عام ٹریفک بھی تو اسی سڑک پر جاری ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس کی افادی حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طریقے سے سوات کی تعمیر نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے بادشاہ صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ بحیثیت معزز ترین شہری اول کے بھی معمار ریاست اپنے فرائض کی ادائیگی غافل نہیں ہے۔ یہ سب کچھ محض اس نیت سے کیا جا رہا ہے کہ ریاست سوات ایک خوبصورت مثالی ریاست بن جائے۔ اور بادشاہ صاحب کے جانشین والی صاحب جس مقصد عظیم کے لیے کوشاں ہیں اس کے پورا ہونے میں ہر صاحب حیثیت شہری کا فرض ہے

کہ حتے المقدور ان کا ہاتھ بٹائیں۔ ریاستی خزانے کی محدود آمدن والی صاحب کن کن ضروریات پر صرف کریں جبکہ ضروریات زیادہ ہیں اور آمدن کم ہے۔

ورزش

بادشاہ صاحب کی زندگی میں ورزش بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کامیاب قسم کی پرمسرت زندگی کی مثال ایک بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی کی ہے۔ اس چوٹی تک پہنچنے کیلئے مضبوط سانس، چست چالاک جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زمانے کے نرم و گرم اور مختلف اور حوادث مہیب پتھروں اور خاردار جھاڑیوں کی شکل میں راہ میں حائل ہوتی جارہی ہیں لیکن بلند ہمت انسان ان سب سے دامن بچاتا ہوا اور نبٹتا ہوا، اپنی راہ نکالتا ہوا چڑھتا جارہا ہے حتےٰ کہ اس بلند چوٹی پر پہنچ جاتا ہے جہاں کہ پہنچ کر پُرمسرت اور خوشگوار فضا میں جانفزا ہوا کی جھونکیں اس کا استقبال کرتی ہیں پھر اس کی ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ کامیابی کا احساس اس کے بدن میں ایک خاص توانائی پیدا کرنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ زندگی تو مسلسل جدوجہد کا ایک نام ہے اس دنیا میں آرام طلب، سست الوجود، کاہل لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ کہ جن کے بدن چربی اور گوشت کے بوجھ سے آزاد ہوتے ہیں۔ اور جن کے وجود پتھر کی طرح سخت اور گرم و سرد برداشت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ سینکڑوں افراد ایسے ہوتے ہیں کہ باوجود دولت مند اور صاحب جائداد ہونے کے محض موٹاپے کی وجہ سے ان کی زندگی ایک دردناک عذاب ہوتی ہے۔ اس قسم کے لحیم و شحیم، موٹی توند والے افراد دنیا میں بالکل بے بس اور لاچار زندگی گذارتے ہیں۔ یہ صاحبان تو ہر مسرت اور زندگی کے ہر حقیقی لطف سے محروم ہوتے ہیں باوجود بھاری تن و توش کے یہ بیچارے تو بس دنیا کو دور سے ہی تکتے جاتے ہیں۔ دنیا میں

رہتے ہوئے دنیا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی زندگی تو بس خورد و نوش کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ دھوتی باندھتے ہیں تو وہ بدن سے بھاگتی ہے۔ سلوار پہنتے ہیں تو گھڑی گھڑی آزار بند کھینچنا پڑتا ہے۔ پتلون پہنتے ہیں تو کچھ اور حالت ہوتی ہے۔ شیروانی اگر اتفاقاً پہن لیں تو بس ہنسی کا گول گپا نظر آتے ہیں۔ سنہری سکوں کے شمار سے ہی دل بہلاتے ہونگے اور پھر بنک کی کتابوں، پاس بکوں وغیرہ کی ورق گردانی کرتے ہوں گے۔ ایک موٹے تکئے پر ٹیک لگائے ہوئے گھڑی گھڑی جس بنک بیلنس میں اضافوں کی تجویزیں سوچتے ہوں گے بس خود اپنے آپ کو دھوکے دے دے کر خوش ہوتے ہیں۔ رنگین تتلیاں پاس ہی آتی پھرتی ہیں۔ لیکن اس بیچارے کے لیے تو اٹھنا ہی مشکل ہے۔ اس قسم کے بے چاروں کے اور کیا شغل رہ جاتا ہے۔ بس پڑے رہتے ہیں۔ یا شام کے وقت ہوا خوری کیلئے کسی سڑک یا مال روڈ پر بھاری انجن کی طرح لڑھکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اس طرح کسی دن زندگی بھی جل دے جاتی ہے۔ اتفاقاً بالکل غیر متوقع حرکت قلب جواب دے جاتی ہے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے بقول اکبر ؎

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

(اکبر الہ آبادی)

بانئے ریاست سوات اور عہد حاضرہ کے آہنی انسان بادشاہ صاحب کی زندگی ہر نوجوان کو یہ پیغام دیتی ہے کہ کاہلی اور سست الوجودی سے اپنے آپ کو بچائے کہ یہ اوصاف نہ صرف انسانی زندگی کے دشمن ہیں بلکہ یہ تو حقیقت میں ہر راحت اور مسرتوں کے بھی خطرناک حریف ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو کہ مالدار اور صاحب جائداد ہوتے ہیں۔ انہیں شائد باوجود کاہل اور سست الوجود ہونے کے بھی مالی مشکلات، اور تنگ دستی کا سامنا کرنا نہ پڑے لیکن اتفاقات زمانہ سے کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت بھی ختم

ہو جاتی ہے جائداد کسی حادثے یا افعال قبیحہ کے نظر ہو جاتی ہے۔ تو پھر چاروں طرف سے مشکلات کی گھٹائیں اُمڈ آتی ہیں۔ حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے

سست الوجود ایسے عالم میں خود کو بے بس اور لاچار پاتا ہے۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ پھر اپنی زندگی کو رسوائیوں کے حوالے کر جاتا ہے۔ بادل نخواستہ مگر مجبور ہوتا ہے۔ ناز و نعم میں پلے ہوئے سست الوجود میں حوادثات زمانہ کے ساتھ مقابلے کرنے کی ہمت ہی مفقود ہوتی ہے۔ تب اُسے احساس ہوتا ہے لیکن پھر کیا فائدہ اس لیے کہ وقت کی رفتار جوانی کا زمانہ اور عمر کی گھڑیاں انتظار تو نہیں کرتیں آخر یہی ہوتا ہے کہ اس نوع کے انسان زندگی سے کچھ بیزار جیسے ہو جاتے ہیں اور پھر چلا چلا کر کہتے ہیں،۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچو پھرو کہ میں سست الوجود اور کاہل تھا۔ مجھ میں مشکلات اور مصیبتوں میں نبٹنے کی قوت نہیں تھی۔ اپنی شخصی بڑائی کے بے چارا غم میں مبتلا تھا۔ یہاں پر میں یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلامی ارکان دین میں نماز اور روزہ، کاہلی اور سست الوجودی کا بھی مؤثر علاج ہیں۔ لیکن جاہ پسند اور آرام طلب حضرات جو بہانہ قسم کے ہوتے ہیں اس کے لیے بھی تاویلیں بناتے ہیں "اجی چھوڑیئے جب دل صاف نہ ہو تو نماز اور روزے کا کیا فائدہ۔ اور یا اس مصروف تجارتی دور میں کس کو فرصت ہے کہ پانچ وقت وضو کرے۔ نمازیں پڑھیں پتلون کی استری بھی خراب ہوتی ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ بھئی نماز اور روزے میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ زندگی جب کسی خاص ضابطے اور اصولوں کے تحت بسر ہوتی ہو تو زیادہ نکھرتی ہے۔ نماز پڑھنے کے ہزاروں فوائد ہیں۔ اپنے نفس کے محاسبے اور تزکیے کے لیے روزے سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ نماز کے وقت اپنی مسجد میں امام کے پیچھے ایک چست سپاہی کی مانند کھڑے ہو کر نماز پڑھو گے تو اس میں تمہارا ہی

فائدہ ہے مانا کہ آپ کی دولت اور جائداد زیادہ ہے تمہیں مشقت اور مزدوری کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن زندگی کے کچھ مقاصد بھی تو ہوتے ہیں۔ باپ دادا کی کمائی سے یا لاکھوں روپیہ کی آمدن سے نت نئے سوٹ بنوانا اور خوبصورت موٹر کاریں خریدنا۔ خود ہی پہننا اور خود ہی کھانا اور اپنے ماحول سے غافل رہنا انسانیت کے فرائض سے چشم پوشی کرنا۔ غریبوں کو بد تہذیب اور جاہل کہہ کر ان سے پیچھا چھڑانا، غیر ملکی جنٹلمینوں کے لیے سراپا اخلاق اور تہذیب کا پیکر بننا۔ محض اسی کا نام بھی تو زندگی نہیں ہے۔ انسان کے کچھ فرائض بحیثیت انسان بھی تو ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانی زندگی کا نصب العین تو بلند اور بہت بلند ہے۔ دولت اور جائداد پر اس قدر اترانا تو نہیں چاہیئے ؎

رقبہ تمارے باغ میلوں ہوا تو کیا
رقبہ تمارے دل کا تو دو انچ بھی نہیں
(اکبر الہ آبادی)

انسان کو اس درخت سایہ دار کی مانند ہونا چاہیئے کہ جو ہر موسم کی ہواؤں اور سختیوں کا مقابلہ کرتا ہوا بڑھتا جا رہا ہے۔ حتےٰ کہ ایک تناور اور سایہ دار چنار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اس کے سایہ میں دوسرے لوگ آرام کرتے ہیں۔ نہ کہ خوبصورت پھول کی طرح دو دن کی جھلک دکھا کر روپوش اور ختم ہونا زندگی کی شان ہے۔ غریب اور مزدور پیشہ لوگ تو موروثی جفاکش ہوتے ہیں لیکن صاحب ثروت لوگوں کے لیے جفاکشی ضروری ہے۔ موٹاپا تو ایک لعنت ہے جو کہ انسان کو کاہل اور بیکار کر دیتا ہے اسلیئے موٹاپے سے بچنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ ورزش کے عنوان پر اس تبصرے کو غیر اہم تصور کریں۔ لیکن اپنا اپنا خیال ہوتا ہے۔ میرے خیال میں انسان کیلئے ورزشی اور چست الوجود ہونا از بس ضروری ہے۔ جفاکش اور چست الوجود لوگ

ہی معاشرے کی تعمیر اور انسانی ارتقا کے لیے موزوں ثابت ہوتے ہیں خواجگان دسترخوان تو خواجگان مرغ پلاؤ ہی ہوا کرتے ہیں۔ انہیں انسانی فرائض اور دوسروں کے دکھ درد سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ موٹاپا تو انسان کو دولت احساس سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ اس قسم کے افراد کبھی انسانیت کے کام نہیں آتے۔ اور نہ ہی ملک اور قوم کے نجات دہندہ ثابت ہوتے ہیں۔ جفاکشی اور چستی خیالات میں پاکیزگی بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اس قسم کے افراد خواجگان شکم پرست بھی نہیں ہوتے۔ اس لیے زندگی ان کے لیے محض ایک ڈراؤنا اور بھیانک خواب بھی نہیں بنتی بلکہ انہیں انسانی زندگی کے نصب العین کی صاف اور پاکیزہ منزل نظر آتی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے متعلق بھی سوچتے ہیں۔ اسلام ہمیں جفاکشی اور چستی کا سبق دیتا ہے۔ اس لیے تو اسے سپاہیانہ دین بھی کہتے ہیں انسان کو

کنوئیں کا مینڈک ہی نہیں بننا چاہیئے۔ بانیٔ ریاست سوات بادشاہ صاحب جو اس خطۂ ارضی میں بسنے والوں لاکھوں افراد کی زندگی بھی سنوارنے کے لیے نہایت مخلصانہ جدوجہد کر چکے ہیں انتہائی جفاکش اور چست الوجود انسان ہیں ورزش ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ورزش اور جفاکشی کی افادی حیثیت سے ابتدا ہی سے آگاہ تھے۔ بادشاہ صاحب کی مستقل مزاجی اور مضبوط قوت ارادی ورزش کے سلسلے میں بھی اپنا خاص سبق آموز پہلو رکھتی ہے۔ ہر صبح نماز سحر کے بعد بلاناغہ ورزش کرتے ہیں۔ ورزش کے لیے انہوں نے پہاڑ پر چڑھنے کا طریقہ ہی مقرر کیا ہے۔ آج سے دس سال پہلے تو ہر صبح ایک ہزار فٹ کی بلند چوٹی پر جانا معمول تھا۔ جبکہ اب صرف پانچ سو فٹ تک ہی جاتے ہیں۔ سردی کا موسم ہو یا گرمی کا یہ ورزش قضا نہیں ہوتی۔ چند سال تو پیشتر بارش اور کڑاکے دار جاڑے میں بھی ورزش قضا نہیں کیا کرتے تھے۔ لیکن اب ضعفِ بصارت کی وجہ سے بارش کی صورت میں یہ ورزش قضا ہو جاتی ہے اس لیئے کہ بارش ہو تو پہاڑ پر دھند اور بادل چھائے رہتے ہیں۔

بادشاہ صاحب کی طرح ان کے خاندان کے دوسرے افراد یعنی غازیٔ ملت والیٔ

سوات اور دوسرے شہر ادگان محترم سب ہی ورزش کے پابند چست الوجود اور سکیل لوگ ہیں۔ ان لوگوں کو روایتی نوابوں سے کوئی نسبت نہیں۔ اور نہ اس قسم کی زندگی پسند کرتے ہیں۔ بادشاہ صاحب کی تقلید میں خاندان شاہی کے علاوہ ریاست کے دوسرے متمول اور صاحب ثروت لوگ بھی ورزش شعار ہیں۔ لہٰذا زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز رہتے ہیں۔ حکمرانی کا احساس بھی بادشاہ صاحب کے لیے موٹاپے کا باعث نہ بن سکا ان کے استقلال طبیعت اور مضبوط قوت ارادی پہ کوئی خیال اور کسی قسم کے تصورات بھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ نہ ہی بادشاہ صاحب نے منصب حکمرانی کو لہو و لعب اور عیش پسند زندگی کا کبھی ذریعہ تصور کیا ہے۔ ان کی زندگی عیاشانہ رنگینی سے بالکل پاک ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بادشاہ صاحب گویا مغرور قسم کے ترش، رو زاہد ہیں بلکہ ایسا نہیں ہے بادشاہ صاحب اس کے برعکس باوجود زاہد اور عابد ہونے کے خوشگوار مزاج کے مالک ہیں ان کی شخصیت باغ و بہار بھی ہے ان کی مختصر وقت کی مجلسیں کبھی بزلہ سنجی اور لطافت کی آئینہ دار بھی ہوا کرتی ہیں۔ مولویوں کی بات چھڑ جائے تو فرماتے ہیں کہ یہ اچھے لوگ ضرور ہیں لیکن اے کاش کہ ان کی کوئی بوڑھی ماں ہوتی کہ ان سادے اور بھلے مانس لوگوں کو سمجھاتی زمانے کے تقاضوں سے خبردار کرتی۔ تو بہت اچھا ہوتا۔ تو یہ ہے بادشاہ صاحب کی زندگی کا صحت مند اور ورزشی پہلو۔ جو کہ قابل ستائش ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے۔ دنیا کے عظیم رہنما سرور کونین ہمارے رسول پاک کا فرمان ہے کہ مسلمانوں کو خاکش اور سپاہیانہ خصائل مالک ہونا چاہیئے اس ضمن میں خود حضور کی زندگی اور سیرت قابل تقلید ہیں مرد آہن بننے کے شوقینوں کو ذرہ سوچنا چاہیئے کہ مرد آہن کیسے بنتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ہم اور ہمارا ملک مرد آہن کے کردار کا متلاشی ہے لہٰذا جونہی کسی پہلوان سٹیج نے قوت تقریر کا مظاہرہ کیا تو یاران سریل اپنے صحافتی حلقوں سے فوراً اسے مرد آہن کا خطاب بخشتے ہیں وقت کا تقاضا یہی ہے کہ سچ مچ کا مرد آہن ہمارے ملک میں پیدا ہو جائے جیسے کہ بانیٔ ریاست سوات ہیں جو کہ اب عمر کی آخری حدیں طے کر رہے ہیں۔

شب بیداری

خال خال اس قوم میں اب بھی نظر آتے ہیں وُہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے ... جو ظالم وضو
(اقبال)

بادشاہ صاحب ۱۹۰۸ء میں فریضۂ حج ادا کر چکے ہیں شب بیداری بادشاہ صاحب کی ابتدائی عادت ہے۔ لہذا سحر خیزی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بادشاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۵ء میں جب قدرت کی طرف سے مجھے ریاست سوات کی تعمیر اور حکمرانی کی عظیم ذمہ داریوں کے فرائض مجھے عطا ہوئے تو اس وقت سے لے کر اس وقت تک میرا یہ معمول ہے کہ بلاناغہ ہر رات نماز سحر سے سوا تین گھنٹے پہلے نیند سے بیدار ہوتا ہوں تہجد کی نماز پڑھ کر کلام پاک کی تلاوت کرتا ہوں۔ تاوقتیکہ مؤذن صبح کی اذان دیتا ہے بادشاہ صاحب کی شب بیداری ایک ایسی حقیقت ہے کہ سوات کا ذرہ ذرہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔ وہ لوگ جنہیں عبادت اور تلاوت کی اہمیت سے انکار ہو انہیں بادشاہ صاحب کی مستقل مزاجی اور زندگی بھر ایک مقررہ پروگرام کے تحت زندگی بسر کرنے کی اس عظمت کردار کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اس قسم کے با اصول اور مضبوط کردار کی نظیر انہیں اپنے حلقوں میں نہیں ملے گی۔ زندگی کو خواب خرگوش سمجھنے والے اس عظمت کا اندازہ کیسے کر سکتے ہیں۔ جو کہ خود دن کے دس بجے کے بعد نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔ ایک مستقل مزاج اور فولاد صفت انسان کی حیثیت سے بادشاہ صاحب نے جو بھی کام شروع کیا ہے اسے نامکمل پھر نہیں چھوڑا۔ اپنی روزمرہ زندگی کے لیے ۱۹۱۵ء سے جو پروگرام وضع کیا ہے بس اسی پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ بادشاہ صاحب ان انسانوں میں سے ایک ہیں کہ جنہیں قدرت ایک مضبوط انسانی کردار کا ایک نمونہ پیش کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً پیدا کرتی

ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

چشم تو از پردگیہا محرم است — دل میان سینہ ات جام جم است
عزم تو پائندہ چوں کہسار تو — جزم تو آسان کند دشوار تو
ہمت تو چوں خیال من بلند — ملت صد پارہ را شیرازہ بند
(اقبال)

علامہ اقبال کے مذکورہ اشعار اُن کے مؤمنانہ تخیل سے قریبی مشابہت رکھنے والی ہستی ایک بادشاہ صاحب کی بھی ہے۔ نہ صرف مذکورہ اشعار سے مطابقت رکھتی ہے بلکہ ذیل کی آئینہ دار بھی ہے ؎

سروری در دین ما خدمت گری ست — عدل فاروقی و فقر حیدری است
در ہجوم کارہائے ملک و دین — با دل خود یک نفس خلوت گزیں
ہر کہ یک دم کمین خود نشست — ہیچ نخچیر از کمند او نہ جست
در قبائے خسروی درویش ذی — دیدہ بیدار خدا اندیش ذی
ہم فقیرے ہم شہ گردوں فرے — اور شیرے باردان بوذرے
آں مسلمانان کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند
خیز و اندر گردش اور جام عشق — در قفسہا تازہ کن پیغام عشق

بادشاہ صاحب کی حکمرانی اس ماحول کے اندر ان مذکورہ اشعار کی ایک تصویر تھی۔ موصوف کی عظیم شخصیت بحیثیت سابق فرمانروائے ریاست اور بانئے ریاست کے اب بھی "در قبائے خسروی درویش ذی" کی آئینہ دار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس عظیم انسان کے مخلصانہ مساعی اور سرفروشانہ جدوجہد سے صرف ریاست سوات اور یہاں کے عوام ہی مستفیض ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بھی عظیم کارکردگی ہے۔ آج سے چالیس سال پہلے حالات مختلف تھے۔ بین الاقوامی سیاست کی حالت بھی کچھ اور تھی۔ آج کے

تقریری دور میں بہتے عوام پر گولیاں چلا کر جس آسانی سے مرد آہن بن جاتے ہیں اس وقت یہ آسانیاں کسے میسر تھیں۔ اور پھر پاکستان اور ہند پر انگریزی حکومت کی گرفت کیسی مضبوط تھی۔ لہٰذا اس زمانے کی مشکلات اور حالات و واقعات اور پیچیدگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جب بادشاہ صاحب کے مساعی جمیلہ اور مجاہدانہ جدوجہد کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ کوہستان سرحد کا یہ غیور دل فرزند بلاشبہ شمال مغربی سرحد پر ایک عظیم انسان ہے۔ بقول شاعر ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اوصاف، اخلاق و عادات،

نگاہ بلند سخن دل نواز، ادا شیریں،
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیئے

مفکر ملت، علامہ اقبال نے اپنے کلام میں مرد مومن کا جو خاکہ پیش کیا ہے موجودہ وقت میں اس کا ایک نمونہ بادشاہ صاحب کی ہستی ہے۔ اور اگر اس ماحول میں بسنے والوں میں پانچ فیصدی افراد ایسے ہوں کہ انہیں مجھ سے اتفاق نہ ہو تو بھی یہاں تک تو اعتراف تو اس قسم کے مخالفین بھی کریں گے کہ اس تخیل سے انتہائی قریبی مشابہت تو ضرور رکھتی ہے مومنانہ تخیل سے مراد یہاں پر مومنانہ کردار کی وہ خصوصیت ہے کہ ہر حالت میں خدائی امداد پر اس کا مکمل عقیدہ ہو۔ اور سوائے خدا کے دنیا میں کسی طاقت سے خوفزدہ نہ ہو۔ اور پھر پٹھانوں کے وہ قبائل جو کہ بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان شاداب دروں اور آزاد فضاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن زندگی کو کوئی اہمیت بھی نہیں دیتے طوفان سے کھیلتے ہیں اور حوادث

کو پھاڑتے ہیں جن کی خبر منظم اور خود سرانہ زندگی کبھی کبھی بربریت کا لبادہ اوڑھ کر ایک خوفناک شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت ۱۹۱۵ء سے پہلے سوات میں بسنے والے پٹھانوں کی تھی تاہم کچھ اوصاف تو ان میں اچھے بھی تھے۔ اور ان کو ایک ایسے فولادی انسان کی سربراہی اور رہنمائی پر متفق کیا جو اس بگڑے ہوئے ماحول کی حالت سنوارنے کی پوری پوری قابلیت رکھتا تھا۔ کسی بھی خطۂ ارض کی حکومت اور اس میں بسنے والے انسانوں کی سربراہی کا منصب ایک امانت ہوتی ہے۔ جو کہ قدرت کی طرف سے ان لوگوں کے حوالے کی جاتی ہے۔ جو کہ ان کے امین ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے کسی خطۂ ارضی پر ایسے نااہل خائن بھی مسلط ہو جاتے ہیں کہ وہاں کے رہنے والوں کے لیے زندگی ایک اذیت ناک عذاب بنا دیتے ہیں۔ اس کا مطلب بجز اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی ابلیسی قوتوں کے سہارے بعض ناموزوں قسم کے افراد بھی کسی قوم پر مسلط ہو جاتے ہیں" آخر کار ایک ہی خدا اندیش "دیدہ بیدار رکھنے والا غازی پیدا ہو جاتا ہے۔ جو کہ خلق خدا کو ناعاقبت اندیشوں کے مظالم سے نجات دلا دیتا ہے سوات اور متعلقات کے یہ لوگ چالیس سال پہلے موت سے کھیلنے والے لوگ تھے۔ قدرت نے ان کے لیے رہبر ہی ایسا پیدا کیا۔ جو کہ شجاعانہ خصائل مردانہ وقار، افغانی روایات، انسانی عظمت کا پیکر ہے۔ بادشاہ صاحب کی طبیعت لڑکپن سے ہنگامہ پسند جیسی تھی۔ لڑکپن میں، موذی جانوروں اور درندوں کو ہلاک کر کے لوگوں کو ان کی ایذا رسانی سے لوگوں کو نجات دلاتے تھے۔ ایک چست الوجود اور پھرتیلے انسان کی حیثیت سے ہر معاملے میں دوسروں سے سبقت لے جانے کے شوقین تھے۔ طبیعت میں جد و جہد کا مادہ تھا ہمت بلند تھی عزائم تھے۔ نپولین کی طرح ہر کام کو ممکن تصور کرتے تھے، حالانکہ تعلیم یافتہ چرب زبانوں کی طرح نہ تو نپولین سے واقف تھے اور نہ نپولین کے اس قول سے بادشاہ صاحب بھی ہر کام کو ممکن سمجھتے ہیں لیکن اس کے لیے عزائم کی مضبوطی بھی ساتھ لازمی تصور کرتے ہیں۔

میں استقلال تھا لہٰذا نوجوانی میں تمام سپاہیانہ اور قائدانہ اوصاف میں ممتاز ہو گئے۔ صحیح معنوں میں ایک فولادی قسم کے انقلابی سردار کے لیے جن اوصاف اور رہبرانہ خصائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ بادشاہ صاحب کی شخصیت اس قسم کی تمام صلاحیتوں سے مزین تھی۔ علاوہ ازیں حسب ذیل اوصاف میں بھی اس ماحول میں بادشاہ صاحب کا حریف کوئی نہیں تھا۔

۱۔ جفاکشی :۔ بادشاہ صاحب ایک جفاکش اور بردبار انسان ہیں نوجوانی میں کشتی بازی میں ہمیشہ اپنے ہم عصروں سے سبقت لے جاتے تھے۔ پیدل سفر کئی کئی دن تک متواتر کر سکتے تھے۔ پہاڑوں پر بلا تھکان چڑھتے تھے پتھریلی زمین پر سونے اور دوسری تکالیف سے قطعاً نہیں گھبراتے تھے اور شجاعت میں ضرب المثل تھے۔

۲۔ شہسواری کے کرتب مثلاً نیزہ بازی وغیرہ میں صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں شہرت رکھتے تھے۔

۳۔ تیراکی :۔ بادشاہ صاحب اپنے عہد جوانی کے مشہور تیراک تھے۔ دریائے سوات کے خطرناک مقامات کو کئی بار تیر کر عبور کر چکے ہیں اور وہ بھی ایسے موسم میں جبکہ دریا کی طغیانی کا موسم ہو۔ حکومت سے پہلے اور مابعد کے ابتدائی سالوں میں اس ماحول میں پل وغیرہ نہیں تھے

۴۔ نشانہ بازی :۔ پٹھانوں کے قبائلی ماحول میں نشانہ بازی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ رائفل سے نشانہ بازی (چاندماری) میں بادشاہ صاحب کا مقابل کوئی نہیں تھا۔ شاید ہی ان کی کوئی گولی نشانے پر نہ لگی ہو۔

۵۔ لانگ جمپ، ہائی جمپ، اور دوڑ :۔ جوانی میں کھیل کود کے میدان میں بھی یکتا تھے۔ دوڑنے میں ہمیشہ آگے نکل جاتے تھے۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ میں اس ماحول میں آپ کا حریف کوئی نہیں تھا۔ چالیس سال کی عمر آپ کی تھی جبکہ آپ جسمانی چستی کی یہ حالت تھی کہ طویل قد کے دو آدمی اپنے سروں کے اوپر رسی پکڑ لیتے موصوف دوڑ کر اس کے اوپر سے کود جاتے۔

اس قسم کے تمام دوسرے اوصاف میں بادشاہ صاحب کا مقابل کوئی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آج کی دنیا میں جبکہ دنیا میں مشینی ترقی زوروں پر ہے لڑائی کے طور طریقے بدل گئے ہیں دنیا کی سیاست وکیلوں کی گرفت میں آتی جارہی ہے محض پروپیگنڈے کے زور سے ذہنوں کو مسخر کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ ممکن ہے بعض حلقوں میں ان اوصاف کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی دل ودماغ کی کسی بھی ایجاد سے خاطر خواہ کام لینے کیلئے ان اوصاف کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں" جیٹ طیاروں کا زمانہ سہی، لیکن جسمانی توانائی اور چستی کی ضرورت آج بھی ویسی ہی مسلمہ ہے جیسے کہ صدیوں پہلے تھی۔ اور پھر ایک تائید کے لیے بہ نسبت دوسروں کے ایک صحت مند اور تندرست قسم کے چست وجود کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ ان اوصاف کی ضرورت ہر دور میں ہوتی ہے ان کی افادی حیثیت سے کسی دور میں بھی انکار کی گنجائش نہیں ہوسکتی دنیا کے مختلف ممالک کے رہنماؤں اور نجات دہندوں کی سوانح عمری پڑھنے سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں کوئی بھی روئی کا گول گپا اور پھسپھسے وجود کا حامل نہیں تھا جب بھی کسی ملک کی سیاست آرام طلب نمائشی قسم کے لیم وسلیم لیڈروں کی گرفت میں آجاتی ہے، تو اس ملک پر قحط سالیوں اور مصیبتوں کی یلغاریں شروع ہوجاتی ہیں۔ پاکستان میں ہمارا محبوب قائداعظم، امریکہ کا ابراہام لنکن، سوویٹ روس کا لینن، ترکی کا اتاترک، مصر کا جمال عبدالناصر یہ سب ہی سپاہیانہ اوصاف کے جفاکش اور چست انسان تھے۔ امارت کی فضاؤں میں ناز ونعم میں پلے ہوئے نازک مزاج فاقون دان قسم کے فربہ بدن لیڈر کسی قوم کے نجات دہندہ ثابت نہیں ہوسکتے۔ محض تقریری "جہاد" ہوائی اڈوں پر ایکٹرانہ شان سے بیانات وغیرہ سے کسی ملک کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی۔ مختلف ممالک کی کانفرنسوں میں دوسروں کو لباس کی شان وشوکت اور خاص قسم کی اداؤں سے مرعوب نہیں کیا جاسکتا اس کے لیے منفرد قسم کی مضبوط شخصیت اور عقابی نگاہوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے صحت مند ضمیر اور پاک

دل کے لیے مضبوط عزائم اور فولادی کردار کے لیئے ایک فولادی اور تندرست وجود کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

۶۔ دوستی اور وفاداری :۔ بادشاہ صاحب کی وفاداری ضرب المثل ہے وطن کے ساتھ وفاداری، رعیت کے ساتھ وفاداری دوستوں کے ساتھ اور اپنے لازموں کے ساتھ غرضیکہ ہر متعلق فرد کے ساتھ بادشاہ صاحب کا خلوص اور وفاداری مسلمہ حقیقت ہے۔ سوات کا بچہ بچہ بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ بادشاہ صاحب جس کو دوست کہیں تو پھر اس کے دوست ہی رہتے ہیں۔ دوستوں کے حق میں ہمیشہ مخلص اور مہربان دوست ہی ثابت ہوتے ہیں۔ بادشاہ صاحب خود کسی کے دشمن نہیں بنتے لیکن اگر کوئی دشمن بھی بنے تو بھی ہمیشہ ایک فیاض اور شجاع حریف ہی رہتے ہیں ادین زئی کی آخری جنگ میں باوجود اختیار رکھنے کے بھی دشمن لشکر کو خوراک اور راشن کی سپلائی سے محروم کروا سکتے تھے لیکن باوجود قوت کے آپ نے ایسا نہ کیا۔ مکاری اور چرب زبانی کو پسند نہیں کرتے بحیثیت ایک شیر دل اور غیور انسان کے اس قسم کے قدر دان بھی ہیں

۷۔ جود و سخا یعنی "فیاضی" :۔ اس میں شک نہیں کہ بادشاہ صاحب نے کبھی حاتم طائی بننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کفایت شعاری ہی ان کا شعار ہے لیکن کسی محتاج سائل کو بالکل محروم بھی لوٹانا آپ کا شیوہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جود و سخا کے معاملے میں بعض لوگوں کے نظریات ہی جدا ہوتے ہیں۔ ذاتی جائداد کی آمدن ایسے طریقے سے صرف ہو رہی ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ تو عام لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ہمارے ماحول میں افلاس انتہائی زوروں پر ہے۔ بغیر منصوبہ بندی اور معاشرے کی اصلاح کیے بغیر انفرادی سخاوت سے افلاس کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ لیکن کہنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سخاوت یا فیاضی نہیں ہونی چاہیئے یہ تو پیغمبرانہ اوصاف ہیں۔ انفرادی سخاوت سے اگر قوم کی نہیں تو کم از کم ایسے افراد کی زندگی تو سدھر سکتی ہے کہ جو معاشرے اور قوم کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہیں پہلے ہی

کہہ چکا ہوں کہ اس ضمن میں ہر ایک کے نظریات جدا ہیں۔ بانیٔ ریاست سوات اگرچہ کفایت شعار انسان ہیں لیکن انہیں فیاض انسان نہ کہنا بھی بے انصافی ہوگی۔ اپنی ذاتی آمدن کے مطابق شرع محمدی زکوٰت باقاعدہ سالانہ نکالتے ہیں۔ البتہ زکوٰت کی یہ رقم اپنے خاص قاعدے کے مطابق ہی تقسیم کرتے ہیں۔ جو کہ ان کی دانست میں نسبتاً زیادہ مفید ہے ورنہ اگر راقم الحروف جیسوں سے پوچھا جائے تو یہی کہیں گے کہ زکوٰت کے چوتھائی حصے سے بھی ہم جیسے خاکساں سو زندوں کی زندگی سنور سکتی ہے۔ لیکن میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس ضمن میں بھی خاص قاعدے مقرر ہیں۔ بہر صورت میرے خیال میں وہ لوگ قابل صد ستائش ضرور ہیں جو آج کے اس ایٹمی دور میں بھی اپنی آمدن سے سال میں مقررہ مہینے میں زکوٰت نکالتے ہیں۔ ورنہ آج تو یہ حالت ہے کہ مسلمان سرمایہ داروں کے لیے پیسہ رگِ جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ زکوٰت نکالنے

والے پھر بھی ان عیاش قسم کے ترقی پسند رئیسوں سے تو اچھے ہیں جو ہزاروں روپیہ بلکہ لاکھوں، وختر انگور پر تو مٹھا کرتے ہیں لیکن کسی غریب سائل کو ایک روپیہ دینا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارا ماحول ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں ذہنوں کی عجیب حالت ہے۔ ہم نے تو ایسوں کو دیکھا ہے کہ جب غریب ہوتے ہیں تو خدا کو گالیاں دیتے ہیں۔ نظام کو کوستے ہیں۔ زکوٰت کے طریق کار کی ہنسی اڑاتے ہیں لیکن یہی بگڑے دل جب مالدار ہو جاتے ہیں تو پھر غریبوں کو ملاحیاں سناتے ہیں۔ زکوٰت نکالنے والوں کی دولت میں سے کچھ تو غریب لوگوں کو مل جاتا ہے۔ لیکن یار لوگوں کے گھر اور آمدن سے پھوٹی کوڑی بھی سائل کے پلے نہیں پڑتی۔ اسکے باوجود انہی حضرات کو ترقی پسندی اور غریبوں کی ہمدردی اور انقلابی ذہنیت کا بھی دعوےٰ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم اس سے کیا فائدہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ماحول میں بعض ایسے لوگ ل جاتے ہیں کہ ان کی زندگی کسی ضابطے اور مذہبی پابندیوں کو برداشت کرنے کی خوگر نہیں ہوتی بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے سینکڑوں تاویلیں کرتے ہیں دوسروں کے نکتہ چین اور معترض بنتے ہیں لیکن خود اپنا محاسبہ نہیں کرتے کہ وہ خود کیسے ہیں۔ ملک اور قوم اپنے

متعلقین اور ہمسایوں کے حق میں کہاں تک مفید اور کتنے فیاض ہیں۔ یقیناً اس کا جواب نفی ہے۔ کچھ بھی نہیں خود ہی کھانا پینا اور پہننا بس ان کا مقصد حیات ہوتا ہے۔ اس لیے ان حالات میں وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ کہ جن کی کچھ دولت تو کار خیر میں صرف ہوتی ہے دوسروں کا محتاج کرنے کے حقدار وہی ہوتے ہیں۔ کہ جن کی اپنی زندگی داغدار نہ ہو۔

۸۔ مہمان نوازی :۔ بادشاہ صاحب انتہائی مہمان نواز انسان ہیں اس ضمن میں یہ مختصر کہوں گا کہ سوات کے ماحول میں بادشاہ صاحب اور ان کے جانشین والی صاحب جتنے مہمان نواز اور مسافر پرور ہیں شاید ہی اس کی مثال کہیں مل سکے۔ اس ماحول میں اگر موجودہ وقت میں کچھ بھی مسافر نوازی کی روایت ہے تو وہ بس صاحب سوات کے خاندان میں اور ان کی جدو جہد اور تقلید کا نتیجہ ہے۔

۹۔ تواضع وانکسار :۔ شیخ سعدی نے ہی غالباً یہ فرمایا ہے ؎

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

بادشاہ صاحب باوجود عظیم شخصیت رکھنے اور باوجود سابق حکمران سوات اور بانئے ریاست ہونے کے انتہائی منکسر المزاج انسان ہیں۔ تکبر اور غرور سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اپنے ہر ایک ملنے والے کے ساتھ اٹھ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ بادشاہ صاحب کی ذات میں اتنا بھی شائبہ نہیں کہ جتنا کسی تھانیدار یا اس ماحول کے کسی دفتری منشی میں ہوتا ہے۔ سوات میں غرور تکا اور غرور بھی ایک فیشن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہر وہ شخص جس کے پاس دو چار ہزار روپیہ ہو غریب کو حقیر سمجھتا ہے۔ البتہ زمیندار طبقے کے یوسف زئی جو کہ خان کے لقب سے مستثنےٰ ہوتے ہیں اس فیشن سے بھی مستثنیٰ ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ زیادہ فرعونیت، زیادہ حسد، زیادہ تعصب اس طبقے کے افراد میں ہوتا ہے جو کہ چالیس سال پہلے مظلوم طبقہ تھا۔ لیکن سوات میں بادشاہ صاحب کی حکومت بننے کے بعد

جب شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پینے لگے تو مظلوم طبقے کی حالت بھی سدھرنی شروع ہوئی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ان لوگوں کی اقتصادی حالت نسبتاً بہتر ہے لیکن تجربے سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ دولت اور قوت ہی انسان کو ظالم اور سنگدل بنا دیتی ہے۔ حتےٰ کہ مظلوم بھی ذی حیثیت ہو کر اپنی مظلومیت بھول جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ قابل تعریف و ستائش ہیں کہ دولت قوت اور حکومت ان سب ذرائع کے ہوتے ہوئے بھی رحمدل اور منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ بادشاہ صاحب ایسی ہی محبوب شخصیت کے مالک ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔ کہ عظیم فاتح وہ ہے کہ جو اپنے نفس پر قابو پا لے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ریاست سوات اور اس ماحول میں آباد لوگوں کے حالات اور ذہنیتوں سے پوری طرح باخبر ہونے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس ماحول میں انسانی قدروں کے سب سے بڑے قدردان بادشاہ صاحب اور والی صاحب ہیں۔ اس خطۂ ارضی اور ان لوگوں کی سربراہی اور قیادت کے لیے قدرت کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ جذباتی بن کر کسی حقیقت کے اظہار پر غصہ ہونا یا ناراض نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ٹھنڈے دل سے حقائق پر سوچنا چاہیئے۔ مولائے روم فرماتے ہیں ؎

پس قیامت شو قیامت را ببیں
دیدن ہر چیز را شرط است ایں

۱۰۔ بادشاہ صاحب وسیع القلب اور حوصلہ مند انسان ہیں۔ ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کے عادی ہیں۔ انتہائی زیرکی اور دور اندیشی، موصوف کے خاص اوصاف ہیں۔

۱۱۔ سیاست دانی:۔ حالات کا فوری تجزیہ کرنے کے ماہر ہیں ہر سیاست سے آشنا ہیں لیکن موصوف کی اپنی سیاست جداگانہ ہے خوشامد اور ریاکاری کو پسند نہیں کرتے وہ لوگ جو خواہ مخواہ گریہ مسکین بن کر ریاکاری کرتے ہیں ایسے افراد کو پسند نہیں کرتے۔

۱۲۔ معتدل طبیعت:۔ ہر کام میں اعتدال کو پسند کرتے ہیں۔ ایک روشن اور بیدار مغز

انسان کی حیثیت سے زمانے کے تقاضوں سے خبردار رہتے ہیں۔ اگرچہ مذہبی انسان ہیں لیکن تنگ نظر اور متعصب قطعاً نہیں ہیں مجتہد قسم کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا عہد حاضر کے مزاج سے بھی بخوبی آشنا ہیں، موصوف کے قیاسیات عموماً درست ثابت ہوتے ہیں۔

۱۳۔ ماتحتوں کے ساتھ برتاؤ:۔ اپنے ماتحت ملازمین جن کی تعداد اس وقت بھی یک صد ہے اور جن میں باڈی گارڈ کے ملازمین خانساماں، پکانے والے۔ بیرے، مشکار، مالی وغیرہ سب شامل ہیں ان سب کی تنخواہ وغیرہ بادشاہ صاحب کی ذاتی آمدن سے دی جاتی ہے۔ ان سب کے ساتھ آپ کا برتاؤ شفیقانہ ہوتا ہے۔ زمانۂ حکمرانی میں تو کبھی کبھی فرائض سے غافل ملازموں کی گوشمالی بھی کرتے تھے لیکن انہیں مالی نقصان یا ذریعۂ روزگار سے محروم کرنے کا خیال تک بھی نہیں کرتے تھے۔ بس یہ گوشمالی تو ایسی ہوتی تھی کہ جیسے کوئی شفیق باپ اپنے شریر بچوں کی گوشمالی کبھی کبھی کان مروڑ کر کرتے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اگر ماتحت ملازمین کی زیادتیوں اور فرض ناشناسی کی داستان بیان کی جائے تو یقیناً یہ حکمران ہی مظلوم جیسے نظر آئیں گے۔ بایں ہمہ اپنے ملٹاف اور ماتحتوں کے ساتھ بادشاہ صاحب کا رویہ ہمیشہ دوستانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے ان کو بے جا تکلفات اور آداب سے منع کیا ہوا ہے ہر ایک کے ساتھ بے تکلف اور آزادانہ گفتگو کرتے ہیں حتے الوسع کسی شخص کو اپنی خدمت سے علیحدہ نہیں کرتے۔ جب تک کہ اس خادم کی زیادتیاں حد سے نہ گزر جائیں۔

۱۴۔ جرگہ بازی:۔ افغانی ماحول میں جرگہ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو کہ پارلیمانی نظام میں پارلیمنٹ کی ہوتی ہے۔ کسی خاص قومی اور علاقائی معاملے میں سوچ بچار اور تجاویز عمل سوچنے کے لیے قومی عمائدین کے مشترکہ اجتماعی اجلاس کو "جرگہ" کہتے ہیں جس طرح سیاسی پارٹیوں کے اجلاس میں، اور پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں شامل ہونے والے ممبر کے لیے "مقرر" اور حاضر جواب ہونا ضروری ہوتا ہے یعنی یہی قابلیت جرگوں میں

بھی درکار ہوتی ہے۔ جرگہ میں شامل ہونے والے ممبر کے لیے تیز زبان اور مقرر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ زور تقریر اور قوت استدلال سے اراکین جرگہ کو قائل کر سکے۔ اس قسم کے قابل اور ذہین مقرر کو پشتو میں جرگہ باز کہتے ہیں۔ پٹھانوں میں جرگے کا رواج قدیمی ہے۔ جبکہ پارٹی سسٹم اور (ٹولہ بازی) کا دستور بھی یونہی صدیوں سے چلا آرہا ہے بابائے ریاست سوات بادشاہ صاحب اپنے عہد کے مشہور جرگہ باز تھے ہمیشہ معقول دلائل سے دوسروں کو قائل کرتے تھے۔ شجاع اور شیر دل ہونے کے ساتھ ساتھ اب بہترین سیاستدان بھی ہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے قبائلی ماحول میں گویا سیاست نہ ہوگی۔ سیاست اور ابن آدم تو لازم ملزوم ہیں البتہ اس قدر ہوتا ہے کہ ہر علاقے کی سیاست وہاں کے مخصوص حالات کی پیدا کردہ ہونے کی وجہ سے دوسرے سے مختلف ضرور ہوتی ہے اس لیے اس قبائلی ماحول کی سیاحت بھی جداگانہ تھی اس فضا میں بھی سیاسی ہتھکنڈوں سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی تھی اور ایک خاموش قسم کی سیاست کھیلی جاتی تھی۔ اس وطن میں دو بڑی پارٹیاں یوسف زئی پٹھانوں کی مختلف ذیلی پارٹیوں سے مربوط ابتدا ہی سے چلی آرہی ہیں۔ جیسے کسی ملک میں دو بڑی سیاسی پارٹیاں مصروف عمل رہتی ہیں۔

۱۵۔ لباس اور سادگی:۔ سادگی آپ کا شعار ہے کسی کی نقل یا تقلید آپ کا آپ کا شیوہ نہیں ہر معاملے میں حتے المقدور اپنی ذہانت سے کام لیتے ہیں۔ لیکن دوسروں کو مجبور کرنے کی عادت بھی نہیں ہے۔ لباس کے معاملے میں بھی ان کی پسند ذاتی ہوتی ہے۔ بس ابتدا ہی سے اپنے لیے ایک خاص وضع کا جو لباس پسند کر چکے ہیں۔ وہی استعمال کرتے۔ آپ کے لباس سے بھی سپاہیت جھلکتی ہے۔ ایک خاص قسم کی شکاری وضع کی قمیض اور کوٹ بنواتے ہیں۔ جن میں کئی جیب ہوتے ہیں۔ چست قسم کا شکاری اور سادہ لباس ہوتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اب شیروانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور خاص وضع کی ململ کی ہلکی پگڑی بھی باندھتے ہیں جو کہ آپ ہی کی جدت پسند طبیعت کی ایجاد ہے۔ سردی کے موسم میں قراقلی کیپ اور سوائی کیپ[1]

[1] یہ سوات اور چترال کی گرم پٹی سے بناتے ہیں۔

(پکول) بھی پہنتے ہیں۔ دھاریدار اور سفید بھڑکیلے لباس کے شوقین نہیں ہیں قمیص اور شلوار، دونوں خاکی فوجی رنگ کے ولایتی پاپلین سے بنواتے ہیں۔ سوائی چھ شاذ و نادر ہی استعمال کرتے ہیں۔

۱۶۔ خوراک جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ بادشاہ صاحب کا اکثر روزہ ہوتا ہے خوراک کے خاص شوقین نہیں ہیں۔ روٹی بہت کم کھاتے ہیں۔ دودھ بطور قہوہ چائے جس میں الائچی اور چینی ڈالتے ہیں۔ صرف دو پیالے پیتے ہیں تصوف کے بنیادی تین اصول:۔ کم خوردن، کم خفتن، کم گفتن پر آپ بھی سختی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔

۱۷۔ بے مثال شخصیت:۔ بادشاہ صاحب ہمیشہ باوضو رہتے ہیں۔ دس سال پہلے جب کہ آپ حکمران سوات تھے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ علی الصباح اپنے محل میں نماز سحر سے پہلے بیدار ہو کر آپ وضو کر لیتے تھے پھر کسی کام کے لیے ریاست سے باہر روانہ ہو جاتے اسی وضو پر ظہر کی نماز راولپنڈی میں۔ شام اور خفتن کی نمازیں اسی وضو پر لاہور میں ادا کر لیتے۔ اپنے نفس اور بدن کو اس قدر اپنے بس اور قابو میں رکھنے کی مثال شاید ہی کسی میں ہو۔ اس دنیا میں تو صرف نفس کو قابو میں رکھنا ہی انسان کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس صورت میں یہ عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ دنیاوی عیش و عشرت کے تمام لوازمات موجود ہوں اور سوائے خوف الٰہی کے کوئی طاقت بھی مانع نہ ہو۔ تب کوئی انسان ان دنیاوی لذتوں سے کنارہ کش ہو جائے۔ تو یقیناً اس کی شخصی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی بے مثال شخصیت صرف بادشاہ صاحب کی ہے۔

۱۸۔ وقت کی پابندی:۔ وقت کی پابندی بادشاہ صاحب کا خاص وصف ہے۔ دوسروں کو انتظار کی زحمت ہرگز نہیں دیتے۔ جو وقت بھی مقرر کر لیتے ہیں، بس ٹھیک اسی وقت پہنچ جاتے ہیں۔

۱۹۔ وعدے اور قول کی پابندی:۔ اسلامی قوانین حیات میں ایفائے عہد اور

پابندیٔ قول کو ہر مسلمان کو خصوصی وصف قرار دیا گیا ہے۔ مگر آج کل صاحب ثروت نمائشی قسم کے نما ہد نما مسلمان تو وعدہ خلافی کے لیے اور اپنے قول سے صاف مکر جانے کیلئے مشہور ہیں۔ میں نے ایسے صاحب حیثیت مسلمان یہاں دیکھے ہیں کہ ان کے وعدے دوسروں کی رسوائی اور ذلت کا باعث بن جاتے ہیں۔ لیکن بادشاہ صاحب قول کے پکے انسان ہیں۔ جب وعدہ کر لیتے ہیں تو اسے ضرور نبھاتے ہیں۔ زمانہ حکمرانی میں آپ کے احکام اور فیصلے اٹل ہوا کرتے تھے۔ جھوٹ بولنے والے باتونی قسم کے افراد کو پسند نہیں کرتے۔

۲۰۔ قیافہ شناسی اور معاملہ فہمی :۔ بادشاہ صاحب انتہائی معاملہ فہمی اور زیرکی کیلئے بھی مشہور رہیں۔ موصوف کے آگے جونہی کوئی بات شروع کرتا ہے تو فوراً بھانپ لیتے ہیں کہ کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہے۔ اور اس کا مدعائے دلی کیا ہے۔ دوربین اور زیرک بھی بہت ہیں۔ اور قیافہ شناس بھی ہیں۔ کسی شخص کے چہرے اور خدوخال سے اس کے اخلاق و عادات کے متعلق صحیح رائے قائم کر لیتے ہیں۔ کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے۔ چالیس سال پہلے اگر کسی کو دیکھا ہو اور پھر چالیس سال بعد بھی ملے تو پہچان لیتے ہیں۔ ترقی پسند قسم کی طبیعت رکھتے ہیں۔ توہمات میں پڑنے کے عادی نہیں۔ محکم یقین، اور مضبوط عقیدہ رکھتے ہیں۔

۲۱۔ دل کش شخصیت :۔ بادشاہ صاحب کی شخصیت دل کش اور مقناطیسی بھی ہے ہر شخص جو کہ موصوف کے قریب رہے۔ ان کے حق میں اپنے دل میں ایک عقیدت مندانہ قسم کی صحبت محسوس کرتا ہے۔

۲۲۔ بادشاہ صاحب کے متعلق یہ تصور کرنا غلط فہمی ہوگی کہ موصوف جابرانہ ذہنیت کے انسان ہیں۔ حکومت سے رعنا کارانہ دلبرداری ہی اس کا واضح ثبوت ہے کہ آپ ۲۱ طبیعت کے مالک نہیں ہیں۔ ان کے عہد حکومت کے ابتدائی ایام میں اور پھر

بعد میں اس ماحول میں بسنے والوں کی جو ذہنیت تھی اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن جس قدر حوصلہ مندی اور ٹھنڈے دل سے آپ نے کام لیا ہے۔ شاید ہی کوئی دوسرا اس میں وسیع القلبی کا مظاہرہ کر لیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مخصوص ذہنیتوں کو بدلنا مشکل کام ضرور ہے۔ مضبوط سے مضبوط انسان بھی اثر صحبت سے اکثر خود کو بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حکمران کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس میں افراد کو پرکھنے کی عادت بھی ہو۔ اور ہر معاملے میں تحقیقات کا شوقین ہو۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کرنا۔ کانوں سے سننا اور آنکھوں سے نہ دیکھنا حکمران کے شایان شان نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حکمران ہی انصاف کا سرپرست اور مدعی ہوتا ہے۔ تاریخ سلاطین کے مطالعے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بیشتر جامع الصفات قسم کے سلاطین بھی یاران صحبت سے خود کو نہ بچا سکے اور اس طرح غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کا شکار ہوتے رہے۔ ان کے ارد گرد بدذہن افراد جو کہ خود غرض ہوتے ہیں۔ ایک حلقہ سا باندھ لیتے ہیں۔ اور کسی مخلص کو قریب پھٹکنے نہیں دیتے لہٰذا حکمران کے لیے صحیح قسم کے افراد کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ خویش پرست جیسے امراء جو کہ ذاتی مفاد کے وفادار ہوتے ہیں۔ اور جن کے سینوں میں دھڑکنے والے دل انصاف سے خالی ہوتے ہیں۔ لہٰذا دوسروں کی بھلائی کے متعلق سوچنے کے قطعاً عادی نہیں ہوتے ان کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ خود ہی فائدہ اٹھائیں۔ اور سلطان وقت کو بھول بھلیوں میں مبتلا رکھنے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں۔ حکمران اور دوسرے افراد کے مابین ایک قسم کی دیوار بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ بادشاہ صاحب کے سوانح حیات اور جدوجہد کی اس تاریخی داستان سے اور ان کے عادات و اخلاق سے واقف ہونے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موصوف اپنے ہم نشینوں اور اہلکاروں کی ذہنیت سے بھی واقف رہا کرتے تھے کسی بہت ہی قریبی منہ چڑھے اہل کار کی بھی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ بادشاہ صاحب کے جذبات کو کسی مخالف شخص کے خلاف بھی ناجائز طریقے سے انگیخت کر سکے۔ بادشاہ صاحب کی

طرح ان کے جانشین والی صاحب کی بھی یہی عادت ہے کہ کسی کے کہنے میں حتے الوسع نہیں آتے۔ سمجھتے ہیں کہ ہر شکایت اور ہر اس قسم کے معاملے کے پس پشت کچھ ذاتی بخش یا رقابت کے جذبات ہی کارفرما ہوتے ہیں لہذا ہر ایک معاملے میں تحقیقات کے بغیر کوئی فیصلہ یا اقدام نہیں کرتے۔ چنانچہ یہی وجوہات بھی ہیں کہ ریاست سوات کی حکومت عام ریاستی حکومتوں سے مختلف ہے۔ یہاں کی حکومت انصاف پروری کی مدعی ہے۔ ریاست سوات کی مضبوطی اور یہاں کا امن یا ریاست کی ارتقائی رفتار یہ سب کچھ بادشاہ صاحب کے عوام دوست سیاست کے نتائج ہیں۔ ہنگامی قسم کے حالات میں سخت گیری کے بغیر بھی چارہ نہیں ہوتا۔ اس لیے بادشاہ صاحب کے متعلق یہ سمجھنا غلط ہے کہ موصوف گویا سخت گیر یا جاندار دل و دماغ کے مالک ہیں۔ بادشاہ صاحب کی سیاست ہمیشہ اس ریاست کے استحکام اور رعیت کے اسودہ حالی کے حق میں رہی ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے ایک خوشحال اور امن و امان کی دولت سے مزین سوات کی خاطر کیا ہے۔ اور بس میں قطعاً یہ دعوے تو نہیں کر سکتا کہ بادشاہ صاحب مافوق البشر ہیں۔ لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ میرا تعلق تصویر کے نورانی رخ سے ہے۔

کردار کا غازی

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما
گفتا کہ یافت مے نشود آنم از دست

بانیٔ ریاست سوات کے اخلاق و عادات اور شخصی عظمت کا یہ مختصر سا خاکہ میں نے پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کے دور میں جسے ترقی یافتہ دور کہتے ہیں اور بقول کسے

بات شمشیروں سے تقریروں تک آپہنچی ہے

اس عہد میں کردار کے مجاہد بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن شمال مغربی سرحد کی یہ تابناک

ریاست سوات کی سرزمین اس نعمتِ بے بہا سے بھی محروم نہیں ہے۔ اس ریاست کے حکمران بجائے گفتار کے کردار کے غازی ہیں۔ بادشاہ کی زندگی سراپا ایک کردار ہے ایک ایسا کردار کہ جو سراپا قابلِ ستائش بھی ہے۔ اس آخری عمر میں موصوف کی دلی تمنا اب یہی ہے کہ ریاست کے لوگ مطمئن اور خوشحال رہیں۔ ریاست دن بہ دن ترقی کرے۔ پاکستان کے ساتھ مربوط یہ ریاست ہمیشہ ایک قابلِ فخر مقام پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ بادشاہ صاحب کی زندگی اور مومنانہ کردار ہر مسلمان کے لیے دعوتِ عمل بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سوات رنگین مناظر اور دلکش آبشاروں کا دیس بھی ہے لیکن اس ریاست کی تاریخ اور بانیٔ ریاست کے حالاتِ زندگی ان کے سرفروشانہ جدوجہد کی سرگزشت اور ان سے ملاقات یہ سب، پھر حسین مناظر اور رنگین آبشاروں سے بھی زیادہ قابلِ دید اور خوبصورت ہیں۔ اگر یہ تصور کیا جائے کہ حکمرانوں کی طرح یہ بھی ایک حکمران ہی ہوں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ غلط فہمی کے شکار ہو ہی گئے۔ یہ درست ہے کہ یہ دنیا ہے اس میں بے فکرے قسم کے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انہیں مناظر اور آبشاروں کے سیر سے دلچسپی ہوتی ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں مناظر اور آبشاروں سے زیادہ مخلصانہ جدوجہد سے بھرپور کرداروں کے مشاہدے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن ریاست سوات کے معمار دونوں سے خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ اس لیے کہ اول الذکر کے تسکین نظر کیلئے راہیں ہموار کرنے کا سہرہ بھی بادشاہ صاحب کے سر پر ہے۔ ورنہ کسے خبر تھی کہ گلام میں سبزہ زاریں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ریاست سوات کی کسٹم پوسٹ لنڈاکی کے پہاڑ کو پار کر کے جونہی آپ اس ریاست کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں تو آپ کی زندگی۔ آپ کی موٹر۔ آپ کی دولت سب کچھ محفوظ ہو گئی یس اب ہے

خطرہ نہ چور کا نہ اُچکّے کا ڈر رہا،

اور پھر لنڈا کی سے کلام کے بلند و بالا پہاڑوں کے دامنوں تک جائیے۔ بالکل بے غم ہو کر سیر کیجئے یہ امن کی وادی ہے، دار السلام ہے یہ دیس یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ خواہ آپ کا تعلق امریکہ سے ہو یا پاکستان سے۔ آپ جس مذہب سے تعلق رکھتے ہوں فکر کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ محفوظ ہیں۔ اور یہ سب کچھ نتائج ہیں۔ "اسی مردِ قلندر کے مجاہدانہ جلال کے" کہ جو اس چھوٹی سی ریاست کا معمار ہے اور جسے یہاں کے "لوگ بادشاہ صاحب کہتے ہیں"۔ اس تقریری دور میں کردار کا غازی جو اب ایک سفید ریش بوڑھا ہے۔ سردی کے موسم میں جب کبھی سوات کی فضائیں بارش اور بادلوں کے سایوں سے آزاد ہوتی ہیں اور تابندہ سورج پورے خلوص سے اپنی روشن شعاعیں اس دلفریب وادی پر نچھاور کرتا ہوا جا رہا ہو۔ کسی اجلی دوپہر کو دامن "گیرا" میں ایک خاموش اور پرسکون محل کے برآمدے میں سنگ مرمر کی کرسی پر ایک سفید ریش اور باوقار انسان "اپنے چوبی بید پر" دونوں ہاتھ رکھے ہوئے سامنے کوہ گیرا کی برف پوش چوٹی پر نظر جمائے ہوئے ہیں چہرے پر کبھی کسی گہری سوچ کی علامتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اور قریب ہی صحن میں سنگ مرمر کے طویل میز پر بیک وقت چالیس پچاس آدمی بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں۔ یوں سمجھو کہ اس سفید ریش نورانی چہرہ رکھنے والے مجاہد کی مخلصانہ جد و جہد کا پھل کھا رہے ہیں۔ اور یہی بوڑھا سفید ریش مسلمان، بادشاہ صاحب ہیں۔ یعنی "بابائے سوات" یہ ۱۹۵۸ء ہے۔ ہوا سے بھی زیادہ تیز رفتار طیارے فضاؤں میں اڑتے ہوئے جا رہے ہیں۔ لیکن انسانی عمر اور وقت کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار چیز اب تک کوئی بھی وجود میں نہیں آئی۔ اور وقت ہے کہ اڑتا ہوا جا رہا ہے۔ جو لوگ وقت کی رفتار سے غافل ہو جاتے ہیں بس وقت بھی انہیں جل دے کر ہی گزر جاتا ہے۔ لیکن وہ عظیم قسم کے انسان جو اپنے ہم جنسوں یعنی بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کام کر جاتے ہیں۔ جریدۂ وقت ان کی عظمت کی داستان بھی اپنے اوراق پر ایسے ثبت کر جاتا ہے کہ خود وقت کی تیز رفتاری اور عمر کی بے وفائی بھی

ان کی عظمت کے بقائے دوام پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اور وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی بہتری اور بہبودی سے متعلق تعمیری جدوجہد سے مقدس عبادت شاید ہی اور ہو۔

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستی ناپائدار دیکھ
(اقبال)

مردِ آہن

۱۔ گذشتہ دس سال سے ہمارے کان نئے خطابات اور نت نئے الفاظ سے بھی آشنا ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ہم سب کچھ اخباری قسم کے طوطے بنتے جا رہے ہیں۔ منجملہ دوسرے دوسرے خطابوں کے ان میں سے ایک خطاب "مردِ آہن بھی ہے"۔ حالانکہ مردِ آہن کوئی کیسے ہو سکتا ہے۔ انسان کی تعمیر تو گوشت و پوست ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن یہی گوشت و پوست کا مرکب بھی کچھ عجیب سا بنتا جا رہا ہے اپنے مفاد اور اپنے اغراض کے لیے بسا اوقات عجیب عجیب باتیں بھی کر جاتا ہے۔ ذرہ ہی کسی زندہ دل نے کسی سٹیج پر کسی مزین شامیانے کے سایہ میں گرمیٔ تقریر کا مظاہرہ کیا اور یا کسی فوج یا پولیس کی مسلح قوتوں سے افلاس کے ستائے ہوئے غریب بہتے عوام کو خوفزدہ کرایا۔ یاروں نے فوراً ہی "مردِ آہن" کا خطاب بخش دیا۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی سے درآمد کردہ یہ خطاب دیا بھی جاتا ہے۔ لیکن مخاطب کو اس خطاب کے مفہوم سے کچھ واسطہ بھی تو ہو۔

لحیم و شحیم قسم کے چربی کے تودے اور بیس فٹ بلند چھت تک بجلی کے جھولوں میں چڑھنے والے۔ رائفل کے استعمال تک سے ناواقف "یہ لوگ مردِ آہن" کیسے بن سکتے ہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سینوں میں دل لوہے کے ہوں۔ اس لیے کہ گوشت

کے ایسے فہیم تو دوں میں صرف لوہے کے دل ہی تو دھڑک سکتے ہیں۔ امارت کی فضاؤں میں اور شہری ماحول میں پلے ہوئے دلدادہ گان عشرت مرد آہن کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس خطاب کے مستحق واقعی ہمارے پاکستان میں صرف قائد اعظم ہی تھے۔ ان میں حوادث کو پچھاڑنے کی قوت تھی وہ ایک مستحکم چٹان کی مانند تھے۔ دنیا میں اپنے مضبوط موقف اور فولادی کردار سے ایک عظیم اسلامی سلطنت کا اضافہ کر گئے۔ جن کی زندگی سراپا جدوجہد تھی۔ اور یا ہمارے سرحدی ماحول میں اس خطاب کی مناسبت بادشاہ صاحب سے ہو سکتی ہے۔ ان کی ذات میں وہ تمام خاصیتیں اور اوصاف موجود ہیں کہ جن کا ہونا ایک فولادی قسم کے کردار رکھنے والے انسان کے لیے ضروری ہوتا ہے فولادی کردار والے مستحکم چٹان جیسے انسان اتنے بکثرت پیدا نہیں ہوتے۔ صدیوں کے بعد جب کبھی قدرت کو انسانوں کو انسانی ہمت اور انسانی قوت کا نمونہ بطور سبق دکھلانا مقصود ہو جاتا ہے تو انسانوں کے گروہ سے اسی قسم کا ایک انسان انہیں میں پیدا کر دیتی ہے، کہ جسے اگر کوئی مرد آہن بھی کہے تو بے جا نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بادشاہ صاحب کی شخصیت اورنگ زیب عالمگیر سے بڑی مشابہ ہے۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر جن کی عظمت اور زاہدانہ قسم کی کامیاب شخصیت کے احترام سے میں منکر بھی نہیں ہوں یقیناً ان کی قوت استقلال بھی مسلمہ تھی، کی مشکلات اور حصول تخت و تاج کے سلسلے میں جدوجہد کی صورت کچھ اور تھی۔ غور سے دیکھا جائے تو اس کی راہ میں مشکلات اتنی زیادہ نہیں تھیں جتنی کہ بادشاہ صاحب کی راہ میں تھیں۔

عالمگیر شہزادہ تھا شاہ جہان جیسے جلیل القدر شہنشاہ کا فرزند تھا۔ شاہانہ تزک و احتشام سے اس کی پرورش اور تربیت ہو چکی تھی۔ سیاست سے واقف تھا۔ اور ساتھ ہی دکن جیسے صوبے کا صوبیدار تھا۔ میر جملہ اور محمد امین جیسے پختہ کار اہل کار ساتھ تھے۔ دولت وافر تھی فوج موجود تھی اپنے بھائی مراد کو ساتھ ملا کر دارا شکوہ سے بازی جیت گیا بنی

بنائی مستحکم سلطنت تھی۔ تختِ حکومت پر بیٹھ گیا۔ ہر شیار اور عقلمند انسان تو تھا ہی لہٰذا حکومت کرتا گیا۔ لیکن ہمارے بادشاہ صاحب اگرچہ مختصر ماحول اور مختصر حدود پر مشتمل ایک ریاست سے متعلق تھے۔ لیکن مشکلات کہیں زیادہ تھیں۔ سب سے زیادہ مشکل یہی تھی کہ نئی ریاست قائم کرنی تھی وہ بھی ایسے ماحول میں کہ جس میں کبھی حکومتی تنظیم تھی ہی نہیں اس دیس کا شہری حکومتی کاروبار اور طور طریقوں سے عملاً تو کجا کتابی طور سے بھی واقف نہیں تھے یہاں پر میں ایک واقع بیان کرتا ہوں تاکہ ہمارے ضلع جوں سے ملحق وزیرستان کا قبائلی علاقہ ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وزیرستان کے ایک ملک نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے ایک ملا صاحب کو استاد مقرر کیا۔ اب ملا صاحب نوجوان ملک زادے کو پڑھانے لگے۔ کہیں اتفاقاً اس نے اپنے شاگرد کو ڈانٹ دیا۔ شاگرد نے پاس ہی پڑی ہوئی رائفل اٹھائی اس میں کارتوس ڈالنے لگا۔ تو مولانا صاحب کیفیت کو بھانپ گئے لہٰذا مسجد سے دوڑ کر نکلے بھاگتے ہوئے نظر آئے اتفاق سے اس شاگرد کا باپ ملک صاحب کہیں سے نکل آئے اور دیکھا کہ مولوی صاحب مسجد سے دوڑتے جا رہے ہیں۔ اور فرزند ارجمند اس کے پیچھے۔ ملک صاحب نے بھی مولانا صاحب کو آواز دے کر یہ اپیل کی کہ مولانا صاحب خدا کے لیے ٹھہر جائیے کہ میرے بیٹے کی یہ پہلی گولی خطا نہ ہو جائے اور مجھے لوگوں کے سامنے نادم نہ ہونا پڑے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مولانا صاحب عزرائیل کے اہل کار کی یہ اپیل کیسے منظور کر سکتے تھے بس بھاگتے ہوئے چلے گئے تو ایسی ہی حالت سوات کی بھی تھی۔ اس لیے یہ ماننا پڑتا ہے کہ باچا صاحب کیلئے بہت زیادہ مشکلات حائل تھیں۔ صورت حال کی کیفیت سرسری طور سے ایک دفعہ پھر دہراتا ہوں تاکہ زیادہ واضح طریقے سے یہ حقیقت ذہن نشین ہو سکے۔ سنئے، صاحب سوات کے

لہ اس وضاحت سے مقصود دونوں شخصیتوں کا مقابلہ نہیں ہے صرف مشکلات کی تشریح مراد ہے۔ بعض اوصاف میں بادشاہ صاحب فی الواقع عالمگیر سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور یا عالمگیر کی سوانح حیات سے متاثر ہو کر اس کی تقلید میں غالباً یہ اصول اپنا چکے ہیں

خاندان کا ایک کمسن بچہ جس کی عمر دس برس کی ہے باپ کا سایہ سر سے اٹھ جاتا ہے ماحول کی حالت منہ کھولے ہوئے نہنگ جیسی ہے۔ تعلیم و تربیت سے محروم رہ جاتا ہے۔ خاندانی ذمہ داریوں کا بوجھ کندھوں میں پڑتا ہے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے خود ہی مکتب عمل میں تعلیم حاصل کرنی شروع کر دیتا ہے خاندانی وقار اور اپنے گھر کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ چچازاد بھائیوں کی شر سے خود اپنے آپ اور اپنے معصوم بھائی اور دوسرے متعلقین کو بچاتا ہے۔ پارٹی بازیوں میں حصہ لیتا ہے رائفل کو اپنا رفیق بناتا ہے۔ دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور دوستوں کے ساتھ دوستی نبھاتا ہے زمانے کے نرم گرم دار سہتا جا رہا ہے خانیان دسترخوان کے خود غرضی اور بے مروتی کے تماشے دیکھتا جاتا ہے۔ لیکن ہراساں اور مایوس نہیں ہوتا مصیبتوں پر مصیبتیں سہتا ہے۔ گولیوں کا سامنا کر کر کے جوان ہوتا ہے تو سب سے اول اسلامی ممالک کا دورہ اور "حج" کا فریضہ ادا کرتا ہے کسے خبر ہے کہ پھر یہ موقع ملے نہ ملے۔ شفیق ماں کی دعائیں ساتھ ہیں۔ واپس آجاتا ہے تو اپنے سگے بھائی کو اپنا مقابل حریف پاتا ہے بغیر کسی معقول وجہ کے اسے اپنا بھائی دشمن کی صف میں نظر آتا ہے حیران رہ جاتا ہے لیکن گھبراتا نہیں اپنے بھائی سے کہتا ہے تمہیں یہ سب کچھ زیب نہیں دیتا۔ لیکن بہت اچھا نوجوان اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو ہو جائیں دو دو ہاتھ۔ لڑائیاں لڑتا ہے اور ہر میدان میں فاتح رہتا ہے حتےٰ کہ وہ نازک وقت بھی آجاتا ہے کہ سوات کا متفق اور متحد لشکر سیدو میں اس اکیلے میاں گل پر حملہ کرنے آتا ہے ایک انسان کے مقابلے کے لیے ہزاروں رائفلیں اور جرار لشکر یہ فولاد صفت انسان جو کہ اپنی جان پر کھیل کر اپنے بھائی کو ساتھ ملا چکا ہے اب چھوٹا بھائی ساتھ ہے ایک لمحہ فکر مند جیسا ہوتا ہے لیکن فوراً ہی پھر اس کی پیشانی چمکتی ہے سیدو کو چھوڑ کر اپنے متعلقین سمیت اپنی ملکیت ایک دوسرے گاؤں دلبار جاتا ہے جو کہ چکدرہ کے قریب ہی ایک بستی ہے۔ اب اسی گاؤں کو مورچہ بنا لیتا ہے وہیں سے آکر مختلف محاذوں پر شجاعت کے جوہر دکھاتا ہے۔ حتےٰ کہ ایک دفعہ پھر فاتحانہ شان سے اپنے

پیدائشی گاؤں سیدو شریف میں داخل ہوتا ہے۔ اب یہ اپنے ہم وطنوں سے اپنی قابلیت اور بے پناہ شجاعت کو لوہا منوا چکے ہیں۔ اہل وطن سوچتے ہیں کہ اس یگانۂ روزگار مرتاید کی صلاحیتوں اور شجاعت سے فائدہ اٹھانا ہی دانشمندی ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اسے اب اپنا بادشاہ بناتے ہیں۔ لیکن کیا بادشاہ، دفتر نہیں، خزانہ ندارد، لشکر منظم نہیں، تعلیم یافتہ کارکن موجود نہیں ہیں۔ کبھی اس علاقے میں حکومت پہلے بنی ہی نہیں۔ بادشاہی کے تمام وسائل بظاہر مفقود ہیں۔ آس پاس کی مسلح اور طاقتور ریاستیں مخالف ہیں آمادۂ پیکار ہیں۔ انگریزی حکومت دشمنی پر آمادہ ہے۔ اب یہ فولادی انسان جنگجو قبائلی پٹھانوں کا سردار ہے۔ یہ اپنی قوم سے مخاطب ہوتا ہے لیکن حکومت اور بادشاہی کے لیے کچھ خزانہ بھی تو ہونا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ صاحب ہمارے پاس خزانے وغیرہ کہاں ہیں۔ ہم تو کسان لوگ ہیں۔ جب فصل کا موسم آئے گا تو آپ کو عشر کی صورت میں غلہ دیں گے۔ یہ جواباً دوبارہ ہنس کر فرماتے ہیں۔ لیکن غلہ تو صرف لشکری ضروریات کے لیے بھی کفیل نہ ہو سکے گا۔ ادھر سے پھر متفقہ طور سے جواب ملتا ہے۔ کہ بس ہم تو زیادہ نہیں سمجھتے ہم نے آپ کو بادشاہ بنایا ہے۔ آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں ہمارے لیے تو یہ ایک چھوٹی سی ننھی منی ریاست بنا دو۔ کہ جس میں ہم پرامن انسانوں کی طرح زندگی گزاریں۔ اب ہم اس وحشیانہ زندگی سے اکتا چکے ہیں۔ ہم تو آپ کے حکم پر لڑیں گے۔ خزانے وغیرہ آپ ہی پیدا کرو۔ مرد آہن کچھ سوچ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ بہت اچھا ہم ایسا ہی کریں گے۔ کہ جیسے آپ لوگوں کی خواہش ہے۔ ہم آپ کے لیے طوفان سے لڑیں گے۔ مصیبتوں سے ٹکرائیں گے۔ حوادث سے مشت و گریباں ہونگے ہر صعوبت اور پریشانی برداشت کریں گے۔ ہم اپنی ریاست کو امن و امان کا گہوارہ بنا کر ہی دم لیں گے۔ ریاست سوات کے بلند و بالا پہاڑ اور ان برف پوش چوٹیوں کو گواہ ٹھہرا کر میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ کشتی جس کی ناخدائی کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈالا گیا سمندر حیات میں اس کشتی کو ساحل مقصود سے ہمکنار کرانے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دونگا

اس اعلان کے بعد پھر عمل کا دور آتا ہے مصیبتوں کی گھٹائیں اُمڈ آتی ہیں ماحول تاریک ہو جاتا ہے۔ لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں مرد مومن کا فولادی کردار بیدار ہے۔ لشکر کی تنظیم کرتا ہے۔ اسلحہ فراہم کرتا ہے روپیہ پیدا کرتا ہے ارادے مستحکم ہیں۔ عقیدہ مضبوط ہے۔ دل میں خلوص اور شجاعت ہے۔ بازوؤں میں قوت ہے ہر میدان میں دشمنوں کو شکست دیتا ہے۔ فرنگی جیسے طاقتور اور گرگ باراں دیدہ حریف سے دامن چھڑاتا ہے۔ اپنی حکومت مضبوط کرتا ہے ایک مرتبہ پھر صلاحیتوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ ریاست کی چاروں اطراف سے بیک وقت حملہ ہوتا ہے۔ شمال مغرب کی طرف سے نواب دیر اپنی پوری قوتوں کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ جنوب کی طرف سے نواب امب کا لشکر کوہ کڑا کڑ پر آتا ہے۔ مشرق کی کوہستان کا مسلم لشکر دین پر حملہ کرتا ہے قبائلی ریاست میں چند جابر قسم کے خوانین لشکر منظم کر کے بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں لیکن یہ شیر دل قطعاً نہیں گھبراتا۔ بہادری کے ساتھ مقابلے کے لیے اٹھتا ہے اپنے ساتھیوں اور لشکریوں کو للکارتا ہے، ہر محاذ پر لڑو، اور شیروں کی طرح غراتے ہوئے لڑو۔ کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ ہم حق پر ہیں اپنے وطن کے لیے لڑ رہے ہیں۔ خدائی امداد ہمارے ساتھ ہے۔ لشکریوں کے لیے راشن کا بندوبست کرتا ہے۔ میگزین فراہم کرتا ہے دوستوں کے حوصلے بڑھاتا ہے۔ سیاست اور ہوشیاری سے کام لیتا ہے ہر محاذ کی نگرانی کرتا ہے۔ اور ہر محاذ کے لیے ہدایات خود ہی جاری کرتا ہے۔ حتےٰ کہ ہر محاذ پر دشمنوں کو شکست دیتا ہے مخالف قومیں اس کی شجاعت اور عظمت کا اعتراف کرتی ہیں۔ مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ کامرانی کا سورج نکل آتا ہے ماحول چمکنے لگتا ہے۔ دشمن قومیں، حوادثات، پیہم مصیبتیں، سرکش موجوں کی طرح اس مستحکم چٹان کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر نادم اور شرمندہ سی واپس سکڑ جاتی ہیں۔ یہ فولاد صفت حکمران اپنے ہم وطنوں کو مژدہ سناتا ہے ہم بفضل خدا کامیاب ہو گئے۔ اب چاروں طرف دیکھتے ہیں تو میدان صاف ہے۔ وقت اور زمانے نے اس کے مضبوط عزائم، شجاعانہ حوصلوں اور محکم قوت یقین کے احترام میں اپنا سر جھکا دیا

ہے۔ یہ ہیں شمال مغربی سرحد کے کوہستانوں کے مرد آہن، مردانہ کردار کا ایک نمونہ، ایک مضبوط انسان اور ایک فولادی کردار، ریاست سوات کے معمار، بادشاہ صاحب۔

۲۔ ہندوستان یعنی متحدہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا دور دورہ ہے۔ بڑے بڑے خوانین اور نواب اپنی قومی غیرت اور اسلامی ناموس کو انگریزی عیارانہ قسم کی نیم مسکراہٹ پر قربان کر کے ہی فخر کرتے ہیں۔ چالیس سال پہلے کا زمانہ ہے لیکن سوات کی حالت مختلف ہے۔ صاحب سوات نے ۱۸۶۳ء میں امبیلا کے مقام پر انگریزی استعمار اور برطانوی لشکر کے فوجی غرور کو شرمندہ کر کے اپنے خاندان کو برطانوی شہنشاہیت کا حریف بنا دیا ہے۔ سوات میں بادشاہ صاحب کی حکومت بنتی ہے تو انگریزی حکومت کوشش کرتی ہے کہ یہ حکومت کامیاب نہ ہو۔ بلکہ صاحب سوات کے خاندان کا کوئی فرد سوات کا حکمران ہی نہ بنے طرح طرح کی مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ اندرون ریاست سرکردہ افراد کو بغاوت پر اکساتے ہیں۔ لیکن بادشاہ صاحب مردانہ وار ان مشکلات پر قابو پا لیتے ہیں۔ آپ نے کبھی انگریزوں کے آگے اس طریقے سے منت خوشامد نہیں کی۔ کہ آپ کی غیرت یا خاندانی وقار پر حرف آئے۔ ایک شجاع فیاض اور جوان مرد انسان کی حیثیت سے اپنے بلند کردار اور قابلانہ صلاحیتوں کے اظہار سے انگریز کو اپنی شخصی عظمت کے اعتراف پر مجبور کیا۔ حتےٰ کہ انگریز نے آپ کی حکومت تسلیم کر لی۔

۳۔ ابتدا میں حکومت بنتی ہے۔ خزانہ وغیرہ نہیں ہے پھر خزانہ قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن برائے نام، مالی حالت کمزور ہوتی ہے۔ بادشاہ صاحب خود مختار حکمران تھے لیکن اپنے لیے کسی قسم کے شاہانہ لوازمات کا اہتمام نہیں کرتے۔ خزانے میں گھوڑا خریدنے کی طاقت ہوئی تو گھوڑا خریدا۔ خزانے کے حالات نے سائیکل کی اجازت دی تو سائیکل خریدی۔ اس دوران میں عین المال کی آمدن بھی خزانے کے استحکام میں صرف ہوتی تھی۔ جب ملکی اقتصادیات مستحکم ہوئے تو تب کہیں جا کر ایک موٹر خریدی۔ حالانکہ ذاتی

آمدن سے بھی ابتدا میں موٹر خرید سکتے تھے۔ لیکن ذاتی اور غیر ذاتی کا سوال ہی پیدا نہیں تھا۔ سب کچھ برائے استحکام ریاست تھا۔ ایک وہ بھی ہوتے ہیں کہ جب وزیر بنتے ہیں تو باوجود اس امر کے کہ ملک میں نرخ گرانی اور افلاس جیسی تباہ کن وباؤں نے تباہی مچائی ہوئی ہے۔ ملکی اقتصادیات پائی پائی تک بچانے کی اپیل کرتے ہیں اور یا رلوگ طرز خاص کے طیاروں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ ملکی عزت کے نام اور وقار کے بھانے ملکی دولت سے گلچھرے اڑاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ قوموں کی مقدار بدلانے کی قوت یا مرد کوہستان میں ہوتی ہے۔ اور یا صحرائی مرد میں یہی این ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان کے راجگان اور والیان ریاست جس زمانے میں سال کے گیارہ مہینے یورپ کے صنم خانوں میں داد عشرت حاصل کرتے تھے۔ اس وقت بھی کوہستان سوات، کا یہ درویش حکمران اپنے وطن اور ریاست کی خدمت میں مصروف تھا۔ اور یا پھر عبادت میں اور آج بھی یہ عظیم انسان صائم الدہر رہتا ہے۔

یہ ہیں وہ مؤمنانہ خصوصیات کے پیکر اور آہنی انسان جس کے شجاعانہ کارناموں سے اب سوات مستفیض ہو رہا ہے۔ یہ سفید ریش فقیر دن رات میں صرف ایک چھٹانک چاول کھا کر ریاضت اور تصوف کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور سوات کا ذرہ ذرہ یہ کہہ رہا ہے کہ کہ یہ آہنی انسان ہے ریاست سوات اور اس کی بے مثال حکومت کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اس ریاست کے اقتصادی حالات جس قدر اجازت دیتے اسی کے مطابق تنخواہیں افسروں کو دی جاتی ہیں۔ اور انہیں سمجھایا گیا ہے کہ آپ قوم اور وطن کے خادم ہیں اس لیے یہ مناسب نہیں کہ آپ اور قوم کی حالت اور رہن سہن میں زمین و آسمان کا فرق ہو۔ اپنے وطن اور اپنی قوم کی خاطر گزارہ کرو۔ کوشش کرو، محنت کرو، ایمانداری سے کام کرو۔ جوں جوں وطن کی حالت بہتر ہوتی جائے گی اس کے ساتھ ہی ہم سب کی حالت بہتر ہوتی جائیگی۔ یہ ہے ایک چھوٹی سی ریاست سوات، جس کی تعمیر کی بنیاد ہی اسلامی اصولوں پر رکھی

گئی ہے، سادگی اور دیانت،

۴۔ عوام اور احکام کا رابطہ:۔ ریاست سوات میں بادشاہ صاحب کی اولین حکومت کا منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ ریاست کی پولیس اور ریاست کے حکام وغیرہ عوام پر حاکمانہ رنگ میں مسلط نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ لوگ کسی کے شہری حقوق میں دخیل ہونے کی جرأت کر سکتے تھے۔ اپنے فرائض اور اختیارات سے اس ریاست میں کوئی بھی تجاوز نہیں کر سکتا یہ وصف بذات خود بھی غنیمت زمانہ ہے۔ ۱۹۳۶ء میں پاکستان اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک ازمودہ کار جرنیل اور ایک مشہور لیڈر نے پشاور کے چوک یادگار میں ایک عظیم الشان جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ انگریز کہتے ہیں کہ ہم ہندوستان والے حکومت کے اہل نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب خیالے انگریزوں کے غلط ہیں۔ شمال مغربی سرحد پر حال ہی میں یعنی ۱۹۱۵ء میں ہمارے ہی ایک بھائی نے سوات جیسے قبائلی علاقے میں انگریزوں کی امداد کے بغیر ہی حکومت بنائی ہے اس کی حکومت اپنے ماحول میں انگریزی حکومت سے بھی زیادہ کامیاب حکومت ہے۔ یہ بادشاہ صاحب کی حکومت تھی کہ جسے مذکورہ الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا۔

۵۔ مجتہد ذہنیت:۔ زمانہ حکمرانی میں باوجود خاص عالم نہ ہونے کے بھی آپ کے مذہبی قیاسات درست ہوا کرتے تھے۔ آپ کے پاس کوئی انجینئر وغیرہ نہیں تھے لیکن تعمیرات وغیرہ کے سلسلے میں بھی آپ کا انتخاب ہمیشہ ہر پہلو سے صحیح ہوا کرتا تھا۔ میاندم، مرغزار، وغیرہ کے مقامات اور آبادیاں اس کا ثبوت ہیں۔

زندگی میں اپنے لیئے آخری آرام گاہ کی تعمیر

بادشاہ صاحب معمار ریاست سوات کے رہائشی محل کے قریب جانب مشرق پہاڑ کے دامن میں زیتون کے جھنڈ و رجھنڈ درختوں کے بیچ ایک خوبصورت اور بے نظیر

مرد اهن حضرت بادشاہ صاحب کی آخری آرام گاہ

عمارت اب تیار ہو چکی ہے جس کا گنبد اور حسین منارے فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔
یہ عمارت ہی ہمارے اس عظیم آہنی انسان یعنی بابائے سوات کی آخری آرام گاہ ہے۔ دو سال پہلے بادشاہ صاحب نے فرمایا کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر ہوگا کہ روضہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ روضہ کی عمارت دو سال میں تیار ہو گئی۔ یہ بھی بادشاہ صاحب کے ذاتی صرفے سے ہی تیار ہوئی ہے۔ بادشاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عہد حکومت میں ایک دفعہ میں نے ہندوستان کے شہر آگرہ میں جلال الدین اکبر کا روضہ دیکھا چنانچہ یہ روضہ بھی اس نقشے کے مطابق بنوایا گیا ہے۔ آخری آرام گاہ یعنی روضے کی تعمیر میں بھی بادشاہ صاحب کی جدت طراز طبیعت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس خوبصورت عمارت کی تعمیر کے بعد ریاست سوات کے قابل دید مقامات میں ایک خوبصورت عمارت اور دلنواز منظر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اکثر صاحب حیثیت افراد موت جیسی سنگین حقیقت سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔ اس طالب علم کی طرح جو کہ کھیل کود کے ہنگاموں میں مصروف ہو کر امتحان سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہی ہوتا ہے کہ پھر امتحان میں ہانپتا اور کانپتا ہوا فیل ہو جاتا ہے۔ لیکن بادشاہ صاحب کی تقدس اور حقیقت پسندی کا یہ عالم ہے کہ موت سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہتے ایک بلند کردار اور قابل طالب علم کی حیثیت سے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کہ جب بھی ممتحن کا جی چاہے امتحان لے سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں قدرت یعنی خدائے زلیست و موت کے انصاف سے یہ امیدیں ہیں کہ خداوند کریم ابھی کافی سے زیادہ عرصہ اس ماحول کو اس نورانی چراغ کی ضیا پاشیوں سے محروم ہونے نہیں دے گی۔ آمین

بابائے ریاست کا ایک اور عظیم افادی کارنامہ

اس کتاب کے باب دوئم میں پشتو زبان کے ساتھ تعلق اور اس کی خدمت

کے سلسلے میں چند کتابوں فتاوائے رودبید، انوار سہیلی، اور تاریخ فرشتہ کا ذکر ہو چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان مذکورہ تین کتابوں کی تصنیف سے پشتو زبان کی معیاری کتابوں میں قابل قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ سوات میں اور سوات سے باہر ان کتابوں سے استفادہ بھی حاصل کیا گیا ہے۔ ان میں انوار سہیلی تو پشتو انرز کے نصاب میں بھی داخل کتاب ہے۔ انوارِ سہیلی وہ مشہور عالم کتاب ہے جو کہ قدیم ہندوستان کی قوت فکر کا ممتاز نتیجہ ہے دنیا کی بائیس زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے ایک رہبر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ عام لوگوں کے لیے بھی اس کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ محض انوار سہیلی کے بغور مطالعے سے انسان کافی سبق آموز تجربات حاصل کر سکتا ہے۔ جو کہ زندگی کے ہر شعبے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس عجیب و غریب کتاب میں صدیوں پیشتر کے زمانے میں انسانی ذہن اور نفس کا تجزیہ کچھ ایسے عالمانہ چابکدستی سے کیا گیا ہے کہ آج کے سائنٹفک دور میں بھی یہ کتاب اتنی ہی مفید اور کارآمد ہے جس قدر کہ آج سے کئی صدی پہلے تھی۔ پانچویں عیسوی صدی میں جبکہ ایران کا بادشاہ خسرو اول تھا اسی خسرو اول کے عہد میں ایران کا ایک مایۂ ناز مفکر اور طبیب اعظم ہندوستان آیا۔ اور واپسی پر ہندوستان سے سنسکرت کی مشہور کتاب مجموعۂ حکایات پنچ تنتر ساتھ لے گیا پنچ تنتر کا ترجمہ پہلوی زبان میں کلیگ، ودمنگ، (کلیلہ ودمنہ) کے نام سے کیا۔ واضح رہے کہ اس کتاب میں اہم کردار دو گیدڑ ہیں۔ ایک کا نام کلیلہ، اور دوسرے کا نام دمنہ ہے چنانچہ خود غرض اقتدار پرست۔ چغلی خور کلیلہ کے مثیل آج سینکڑوں افراد ہی نظر آتے ہیں۔ جو کہ ذاتی وجاہت اور فائدے کے لیے دوسروں کا خون کرتے ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ،

حکیم بروزید نے ہی کتاب کو سنسکرت سے پہلوی میں منتقل کیا۔ جسکا ترجمہ پھر سریانی میں کیا گیا۔ اور سریانی سے ہی ابن المقفع نے اسے عربی میں ترجمہ کیا۔ مشہور شاعر "رودکی" نے پھر فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ "بروزید" کی خود نوشت سوانح عمری کا اضافہ بھی عربی ترجمے میں

شامل ہے۔ ایران کے ساسانی عہد کے مایۂ ناز مفکر حکیم "بروزبید" نے "انوار سہیلی" کو بہترین[1] کتاب کا خطاب دیا ہے۔ چنانچہ خود نوشت سوانح عمری میں بروزبید لکھتا ہے۔ ....

میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں بہت سے مذہب ہیں اور ان کے ماننے والے بھی قسم قسم کے لوگ ہیں۔ بعض لوگوں کو تشدد اور خوف کے ذریعے سے مذہب قبول کرایا گیا ہے۔ اور بعض وہ ہیں کہ جو اپنے مذہب کی بدولت دنیاوی فائدے اور خوشیاں اور عزت حاصل کرنے کے امیدوار ہیں۔ لیکن ہر شخص کا یہ دعوےٰ ہے کہ صداقت اور عدل پر اسی کا قبضہ ہے اور دوسرے مذہب والے گمراہی و ضلالت میں مبتلا ہیں۔ خالق و مخلوق مبدا و معاد اور دوسرے مسائل کے بارے میں سب کے عقاید ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن ہر شخص دوسرے کی تحقیر کرتا ہے۔ اس پر معترض ہوتا ہے اور اس کو لفرین کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے ارادہ کیا کہ عالموں اور عقیدوں کے پیشواؤں کی طرف رجوع کروں۔ اور دیکھوں کہ وہ کس بات کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور کس راستے کی طرف ہدایت کرتے ہیں تاکہ شاید میں حق و باطل کے درمیان تمیز کر سکوں۔ اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے آپ کو صداقت کے ساتھ وابستہ کر سکوں۔ اور آنکھیں بند کر کے ایسی بات کو صحیح مان لوں جس کو میں نہیں سمجھتا چنانچہ میں نے اس پر عمل کیا۔ اور مطالعہ اور مشاہدہ میں مصروف ہو گیا لیکن میں نے دیکھا کہ ان لوگوں میں سے کسی کے پاس بھی سوائے اوہام باطلہ کے اور کچھ نہیں ہر شخص اپنے مذہب کا مداح ہے۔ اور دوسرے کو ضرر پہنچانے کے درپے ہے۔ تب مجھ پر یہ بات روشن ہو گئی کہ ان لوگوں کے عقاید کی بنیاد ہوا پر ہے۔ وہ انصاف کی بات نہیں کرتے۔ میں نے کسی شخص میں بھی ایسی معقولیت اور ایسا خلوص نہ دیکھا کہ عقلمند لوگ اس کی بات تسلیم کر سکیں۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے "بروزبید" کہتا ہے۔ کہ بہتر یہ ہے کہ دنیاوی لذتوں سے ہاتھ اٹھایا جائے۔ زہد و ریاضت کی زندگی بسر کی جائے

---

[1] واضح رہے کہ "انوار سہیلی" کا شمار دنیا کی کلاسیکل کتابوں میں ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ بروزید نزول اسلام سے پیشتر کے دور کا نمائندہ ہے۔ کتاب کلید دمنہ تعلیم اخلاق، اور پند و نصائح کے مضمون پر ایک دلچسپ کتاب ہے بروزید نے پندرہ سو سال پہلے ذہن انسان کا جو کامیاب مشاہدہ کیا ہے آج بیسویں صدی میں جبکہ یہ دعوے بھی کیا جاتا ہے کہ شاہراہ حیات پر انسانیت کا قافلہ ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا بہت آگے نکل چکا ہے۔ لیکن غور سے اگر مشاہدہ کیا جائے تو ہمارے ماحول میں تو ذہنوں کی ہنوز وہی حالت ہے جو کہ پندرہ سو سال پہلے بروزید کے ماحول میں تھی انسان دن بدن انسان سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ خاندانی رشتے اور قرابت داری ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اور ہر ذی حیثیت فرد "بنیا ازم" کو اپناتا جا رہا ہے خود غرضی اور خود پرستی انتہائی عروج پر ہے۔ خدا جانے کہ کیا ہوگا۔ بہر صورت موجودہ عہد میں تو اخلاقی تنزل عروج پر ہے۔ دلوں سے مروت اور رواداری ختم ہوتی جا رہی ہے۔ انسان انسان کو کھلے بندوں لوٹتا ہے۔ بے شرمی، بے حیائی اور ریاکاری عام ہوتی جا رہی ہے۔ ہر شخص صرف نمائشی اداکار بن کر رہ گیا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم سے حالات سدھر جائیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے تعلیم یافتہ فاضل لوگ موجود ہیں۔ ان کی اخلاقی حالت سے یہ ظاہر ہے کہ تعلیم خواہ مذہبی یا غیر مذہبی کسی فرد میں صداقت اور خلوص کا جذبہ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ حرص و ہوس کا دور دورہ ہے۔ دولت پرستی کا جنوں عام ہے۔ انسان دن بدن انسان سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔ ضمیریں اس قدر بے حس اور مردہ ہو چکی ہیں کہ صرف ذاتی غرض اور ذاتی مفاد کے وقت ان میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد وہی حالت وہی کیفیت ہوتی ہے۔ ماحول نے دھکتے ہوئے تنور کی شکل اختیار کی ہے جس میں تمام مذہبی اخلاقی اور تہذیبی اصول جل کر راکھ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر شخص مجتہد بن کر اپنے ضمیر اور اپنے اخلاق اور اپنے مفاد سے مطابقت رکھنے والے مسئلے گھڑتا ہے۔ اجتماعی مسائل سے دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ انسان یہ محسوس ہی نہیں کرتا۔ کہ بحیثیت انسان اس کے کچھ فرائض بھی ہوتے ہیں ہمارے ماحول میں

بعض سطحی نظر رکھنے والے بے اصول قسم کے افراد جب کسی یورپین یا امریکی سے ملتے ہیں تو فوراً اپنے سادہ تمدن اور سادہ تہذیب کی پھبتیاں اڑانے شروع ہو جاتے ہیں۔ اب ایسوں کو کون سمجھائے کہ بھئی فراغت کی گھڑیاں بیت چکی ہیں۔ میرا اپنا تو یہ خیال ہے کہ آج سے بیس سال پہلے کی زندگی اور وہی سادہ دیہاتی تمدن مجھے کوئی لوٹا سکے۔ تو میں یقیناً امریکہ کی صدارت اس کے مقابلے میں نہ کروں۔

ہاں تو بات کلیلہ و دمنہ کی تھی، بادشاہ صاحب نے اس بیش بہا کتاب کا ترجمہ ہی اس خیال اور اس نیت سے کرایا تھا۔ کہ ایک تو پشتو میں ایک گراں مایہ کتاب کا اضافہ ہو جائیگا۔ دوئم یہ کہ عام لوگ اس سے کچھ فائدہ حاصل کریں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں وعظ و نصیحت اور اخلاق کی باتیں، حکمرانی کے اصول، حکمران اور رعیت کے تعلقات اور ان دونوں کے فرائض، راستی، وفا، حب وطن اور خدمت قوم، عدالت کے فرائض، ہنرمندی کے فوائد غرضیکہ انسانی زندگی سے متعلق تمام امورات، قصوں اور کہانیوں کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ وعظ و نصیحت اور اخلاقیات کے مجموعے جو خشک رنگ[1] میں ہوتے ہیں کے مطالعے سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں۔ لیکن انوار سہیلی میں یہ باتیں نہایت دلچسپ رنگ میں بیان کی گئی ہیں۔ اس لیے انوار سہیلی کو محض مجموعہ حکایت سمجھنا اور یا یہ کہنا کہ اگلے وقتوں کے یہ قصے ہیں اور درگذر کرنا غلطی ہوگی۔ پشتو زبان میں اس کا سلیس ترجمہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے پشتو زبان میں اسے منتقل کراتے وقت اس کے انتخاب میں کافی سوچ بچار سے کام لیا گیا ہے۔ انوار سہیلی کے کردار اس ماحول میں بسنے والوں کے جانے پہچانے کردار ہی تو ہیں۔ مثلاً بندر، گیدڑ، شیر، چیتا، لومڑی، سانپ، کوا، ریچھ وغیرہ، اور بعض مقامات انہی کی زبانی انسان کا کردار بیان کیا گیا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں ایران میں جو کتابیں مقبول تھیں وہ دبستان مینوگ خرد وغیرہ تھیں چنانچہ بروزید جو کہ تلاش حق کے سلسلے میں زیادہ مضطرب تھا وہ مذکورہ قسم کی کتابوں سے بھی

---

(۱) خشک رنگ)

خاص مطمئن نہیں تھا۔ بروزید اس کا قائل تھا کہ انسان کو بلا سوچے سمجھے بطور میراث مذہب قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ میراثی مذہب کے پیرو منافقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے مذہب کی تعلیمات اور اصولوں سے واقف ہونا چاہیئے۔ تاہم انوار سہیلی کی یعنی قدیم ہندوستان اور قدیم ایران کی فکری یگانگت کافی دلچسپ ہے۔ لہٰذا یہ کتاب وہاں بھی کافی مقبول ہوئی۔ فکر ایران سے متعلق کتابوں کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ نیکی علم و دانش کا نام ہے۔ کیونکہ انسان کی عمدہ صفات کا منبع علم و عقل ہے۔ نیکیوں میں سب سے بڑھ کر نیکی سخاوت ہے۔

۲۔ محسن ہمیشہ عادل ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب تک جرم کی پوری تفتیش نہ ہو جائے سزا نہیں دینی چاہیئے۔

۳۔ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرنا چاہیئے۔

۴۔ اس مال سے خیرات کرنا جو دیانت داری اور محنت و مشقت کے ساتھ کمایا گیا ہو مستحسن ہے۔ وہ زندگی جو ایسے خیرات کے کاموں میں بسر کی جائے سب سے زیادہ خوشی اور امن کی زندگی ہے۔

۵۔ محنت اور جانفشانی دو ایسی خوبیاں ہیں جو خاص طور سے بہ نظر استحسان دیکھی گئی ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ محنت اور جانفشانی سے دولت کما کر ابنائے جنس کے فائدے کے لیے صرف کرے۔

۶۔ تعریف کے قابل وہ شخص ہے جو بری خواہشوں کو غیرت نفس کے ساتھ، غصے کو تحمل کے ساتھ۔ شہوت نفس کو قناعت کے ساتھ۔ اور جنگجوئی رغبت کو انصاف کے ساتھ دبائے۔

۷۔ فقط پرہیزگاری ایسی چیز ہے کہ جس کے ذریعے انسان کسب فضائل کر سکتا ہے جو کہ زندگی کی زینت ہیں۔

۸۔ آدمی کو ہمیشہ تواضع کے ساتھ گفتگو کرنی چاہیئے۔ اور اپنے مخاطب کے سامنے کبھی تیوڑی نہیں چڑھانی چاہیئے۔ کیونکہ خوش خلقی اور شیریں کلامی عمدہ خصلت کی علامتیں ہیں۔ بدگوئی جادوگری سے بھی بدتر ہے۔ غیبت کرنے والے چغلی خور انسانیت کے خطرناک دشمن ہوتے ہیں۔ انتقام لینے یا دوسروں کو ضرر پہنچانے کی فکر میں نہیں رہنا چاہیئے۔ چاہ کن را چاہ در پیش۔

۹۔ عورتوں کو راز کی بات نہیں بتانی چاہیئے۔ اور نہ احمقوں کے ساتھ بحث کرنی چاہیئے۔ سنی سنائی باتوں کو اس طرح بیان نہیں کرنا چاہیئے کہ گویا چشم دید واقع ہے۔ بے محل ہنسنا نہیں چاہیئے۔ حاسدوں کے سامنے اپنی دولت کی نمائش نہیں کرنی۔ بات کرنے سے پہلے سوچنا ضروری ہے۔ بے سوچے سمجھے بات کہنا تباہ کرنے والی آگ کی مانند ہے۔

۱۰۔ پرانے دشمن کو نیا دوست نہیں بنانا چاہیئے۔ کیونکہ پرانا دشمن کالے سانپ کی طرح ہوتا ہے جو سو سال تک دشمنی کو نہیں بھولتا۔ لیکن پرانے دوست کو نیا دوست بنانا مناسب ہے۔ کیونکہ پرانا دوست پرانی شراب کی طرح ہوتا ہے۔ کہ جوں جوں پرانی ہوتی جاتی ہے تو زیادہ لطیف بنتی ہے۔

۱۱۔ دنیا کی رنج و راحت کے ساتھ زیادہ وابستگی نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ دنیا کو محض ایک سرائے سمجھنا چاہیئے۔ جہاں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

چنانچہ ایرانی کتابوں کی یہ تعلیمات اور کتاب انوار سہیلی کی تعلیمات ہو بہو ایک جیسے ملتے جلتے ہیں۔ یہ سب کچھ بیان کرنے سے ملحوظ ہے کہ کتاب انوار سہیلی جسے بائیبل ریاست سوات نے پشتو کا جامہ پہنایا ہے۔ کی اہمیت واضح ہو جائے۔ اور یہ نہ سوچا جائے کہ گویا مذکورہ کتاب بھی الف لیلہ جیسی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ انوار سہیلی جو کہ بہت ہی قدیمی کتاب ہے۔ میں حکمرانی کے لیے جو پالیسی بیان کی گئی ہے۔ آج کی سیاست میں بھی کم و بیش وہی روح کارفرما ہے۔ مثلاً انوار سہیلی کا ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

شکاری نے جال بچھایا تھا۔ جس میں "بلی" پھنس گئی۔ قریب ہی ایک چوہا اپنی غار سے نکل آیا۔ ادھر سے ایک نیولا بھی نمودار ہوگیا۔ اب چوہے نے سوچا کہ میرے تو یہ دونوں دشمن ہیں۔ ان دونوں کی شر سے اب خود کو بچانا میرا فرض ہے۔ بلی چونکہ خود پھنسی ہوئی تھی۔ اور مجبور تھی۔ لہٰذا دانا چوہے نے بلی کے ساتھ اتحاد مناسب سمجھا۔ اور اسے کہا کہ دوستوں کی طرح میری اور بھگت کرو۔ پھر تمہیں جال سے آزاد کردوں گا۔ بلی نے ویسا ہی کیا۔ نیولے نے جب بلی اور چوہے کو یوں دوستانہ رنگ میں دیکھا تو نامراد ہی واپس چلا گیا۔ چوہے نے عین اس وقت جبکہ شکاری نمودار ہوا اور بلی متوحش ہوئی اس کے بند کاٹے۔ بلی نے جست لگائی اور درخت پر چڑھ گئی۔ ہوشیار چوہا اپنے بل میں گھس گیا۔ ہنگامی حالت ختم ہوئی تو پھر چوہا وہی چوہا تھا۔ اور بلی بہر صورت بلی تھی۔ عارضی اتحاد بلی کی ہزار کوششوں کے باوجود ختم ہوا۔ گذشتہ عالمگیر جنگ میں "برطانیہ، امریکہ اور روس" کا اتحاد اسی قدیمی سیاست کا مظہر تھا۔ ذہن انسان کی وضع کردہ سیاست آج بھی تقریباً وہی ہے۔ جو دو ہزار سال پہلے تھی۔ البتہ ذرائع اور سامان تبدیل ہوتے جارہے ہیں، میکاولی نے یورپی حکمرانوں کیلئے بادشاہ جیسی کتاب لکھی تھی قدیم ہندوستان، یا یوں سمجھو کہ مشرق کے ایک دانشور نے بھی ایک کتاب حکمرانوں کے لیے پنج تنتر یعنی انوار سہیلی لکھی۔ میکاولی کی کتاب ابلیسی سیاست اور درندگی، فریب کاری کی تعلیم دیتی ہے لیکن ذہن مشرق کی یہ شاہکار کتاب "عدل" انصاف و صداقت اور رواداری کی تعلیم دیتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں کہ مشرق اور مغرب میں وہی فرق ہے جو کہ مغرب اور مشرق کے درمیانی فاصلوں میں ہے۔ انسانی دماغ ترقی کرتا جارہا ہے سادگی اور معصومیت ختم ہوتی جارہی ہے چاند اور مریخ کو آماجگاہ فریب بنانے کی کوششیں بھی ہورہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ماحول میں تو کچھ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے فراغت اور اطمینان قلب کا زمانہ شاید گزار چکے۔ کارخانے بنتے جائیں گے۔ یونیورسٹیاں قائم ہوتی جائیں گی۔ شاندار عمارتوں سے یہ زمین بھی مزین ہوتی رہے گی۔ دنیا میں قسما قسم مشینوں کا اضافہ ہوتا

جائے گا۔ ذہن انسان بھی مشینی ہوتا جائے گا لیکن ماضی کے بیتے ہوئے دن، زندگی کے خوشگوار لمحے۔ محبت و خلوص سے لبریز سادہ تمدن، پُرمسرت اور پُرسکون زندگی کے وہ زمانے لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ہر شخص یہی محسوس کرے گا کہ اس کا ماضی اس حال سے بہتر تھا انسان کچھ مضطرب سے ہوتے جائیں گے۔ سکون اور اطمینان کے لمحے ہماری زندگی میں پھر کب آئیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب، فطرتی زندگی اور قوانین قدرت سے انحراف کر کے انسان اپنے فریب کے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار ہو چکا ہے۔

جوں جوں علم حاصل کرتا جاتا ہے انسان مکار اور ریاکار ہوتا جا رہا ہے اس لیے کہ ہمارے ماحول میں علم کے حصول کے مقاصد بھی کچھ اس قسم کے ہیں کہ خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ بقول علامہ صاحب ؎

علم و فن را لئے جوان شوخ و شنگ
مغز مے باید نہ ملبوس فرنگ

یا بقول پیر روم ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

اگلے وقتوں کی یادگار معمر لوگ موجودہ دور میں بھی روشنی کے مینار ہیں۔ کہ جنکی ضیا سے کچھ تو ماحول روشن ہے

فتاوٰے درودیہ حصہ اول و دوم

؎ ایں چشمہ رواں کہ بخلق خدا دہم
یک قطرہ ز بحر زلال محمدؐ است

انوار سہیلی کے علاوہ فتاوٰے درودیہ حصہ اول و دوم دو کتابیں بھی بادشاہ صاحب

پشتو زبان میں معیاری طرز پر طبع کرائی ہیں۔ ان ہر دو کتابوں میں فقہ اسلامی کے اصول اور قوانین عام فہم اور سادہ پشتو میں بیان کیے گئے یہ دونوں کتابیں ہر مسلمان کے لیے رہبر دین و دنیا ہیں زندگی کا کوئی پہلو ہی ایسا نہیں کہ جس کے متعلق ان کتابوں میں مسئلہ نہ ملے۔ صرف ان دو کتابوں کو پڑھ کر ہی ہر مسلمان اچھا خاصہ عالم اور با اخلاق انسان بن سکتا ہے۔ بحیثیت مسلمان ہر مسلمان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اسلامی تعلیمات اور اسلامی اصول حیات کی آئینہ دار ہو۔ چنانچہ فتاوٰے ودودیہ کی تدوین و تصنیف کا مطلب ہی یہی تھا۔ اب تک ہزاروں افراد ان کتابوں سے مستفیض ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں جن کی قیمت بارہ روپیہ ہے۔ بادشاہ صاحب مفت تقسیم کر رہے ہیں۔ اب حصہ اول کی پانچ ہزار جلدیں مزید اور شائع ہو رہی ہیں۔ جو کہ مفت ہی تقسیم ہو جائیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ بابائے سوات بادشاہ صاحب کی طرف سے پشتو زبان اور پٹھان قوم کے لیے یہ ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ جس کی افادی حیثیت بھی مسلمہ ہے۔

حصہ اول:۔ پانچ سو بڑے صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب ہے۔ جس میں مذہبی اور اخلاقی تمدنی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

حصہ دوم:۔ بڑے سائز کے چھ سو پچاس صفحات کی ضخیم کتاب ہے جو کہ رہبر قاضیاں بھی ہے۔ اسے اسلامی قانون قضاوت کی کتاب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے انسان اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ "اسلام میں قاضی کے فرائض کیا ہیں" اور نیز یہ کہ منصفانہ فیصلوں کے لیے کس قدر زور دیا گیا ہے۔

یہ ہے بانئے ریاست سوات کی خدمات کا مختصر جائزہ جو کہ موصوف نے کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ یا کسی دار العلوم کے سند یافتہ فاضل نہ ہونے کے باوجود بھی قوم کے لیے کیے ہیں۔ ریاست کی دفتری زبان پشتو قرار دے کر آپ پشتو زبان کے محسن بن چکے ہیں۔ بادشاہ صاحب کی یہ خدمات ہر لحاظ سے قابل قدر اور قابل صفت ہیں

کپٹن شاهزاده فضل حق اورنگ زیب خان ولی عهد ریاست سوات

صاحب سوات کا گلشن اور اُس کے پھول

یعنی شاہی خاندان کے دوسرے محترم اراکین

۱۔ بادشاہ صاحب کے صرف دو بیٹے ہیں۔

۱۔ سلطان العلوم :۔ غازیٔ ملت میجر جنرل عبدالحق جہان زیب خاں، موجودہ والیٔ سوات ہیں۔ جن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔

۲۔ شہزادہ سلطان روم :۔ بادشاہ صاحب فرزند اصغر ہیں شہزادہ صاحب ستمبر ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے ہیں۔ ملٹری کالج ڈیرہ دون کے فارغ التحصیل ہیں۔ مذہبی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہیں۔ اور موجودہ وقت میں بھی کلام پاک اور احادیث کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ نماز کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے ہیں۔ شکار کے رسیا ہیں۔ ریچھوں کا شکار آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ جبکہ یہ ریچھ موسم خریف میں مکئی کی فصل بھی تباہ کرتے ہیں۔ شہزادہ صاحب مشہور نشانہ باز ہیں۔ ہنس مکھ اور زندہ دل جوان ہیں۔ روایتی شہزادوں کی طرح زندگی کو عیش و عشرت کے ہنگاموں میں ضائع کرنے کے عادی نہیں۔ اور نہ ہی لاڈلے قسم کے نازک بدن ہیں۔ بلکہ چست اور جفاکش جوان ہیں۔ بڑھاپے کی آخری عمر میں اپنے قابل صد احترام والد کے نور نظر بنے ہوتے ہیں وجہ یہ ہے کہ والی صاحب اور دوسرے شہزادگان کرام اکثر مصروف ہی رہتے ہیں۔ والی صاحب حکمرانی کے دھندوں میں اور شہزادے تحصیل علم کے سلسلے میں نیز ان کے رہائشی محل بھی علیحدہ ہیں۔ اور شہزادہ صاحب سلطان روم بادشاہ صاحب

ساتھ رہتے ہیں۔

۳۔ اعلیٰ حضرت والیٔ سوات کے چار فرزند ہیں:۔ یعنی کیپٹن شہزادہ اورنگ زیب خان، ولی عہد ریاست سوات، شہزادہ عالم زیب خان، حافظ قرآن، شہزادہ امیر زیب خان، اور کمسن شہزادہ احمد زیب خان لاہور میں پڑھتے ہیں۔

۴۔ حافظ قرآن شہزادہ عالم زیب کے تین فرزند:۔ (۱) شہزادہ اکبر زیب (۲) شہزادہ اسلم زیب (۳) شہزادہ انور زیب خان ہیں۔ خاندان شاہی کے یہ سب محترم اراکین:۔ صاحب سوات کے گلستان کے خوبصورت اور مہکتے ہوئے پھول ہیں۔ میں انتہائی خلوص دل سے یہ دعا کرتا ہوں کہ گلشن سوات کے ان خوشبودار پھولوں کو خداوند کریم ہمیشہ تروتازہ رکھے کہ بوستان سوات کی رونق انہی سے تو ہے

۵۔ شہزادہ سلطان روم کے دو فرزند ہیں:۔ یعنی شہزادہ امانی روم بعمر چودہ سال جو کہ پڑھتے ہیں۔ اور شہزادہ سلطان احمد کمسن ہیں۔

خاندان شاہی کے یہ سب شہزادگان محترم جبکہ سیدو میں موجود ہوتے ہیں۔ تو ہر جمعہ کی نماز بادشاہ صاحب کے ساتھ ہی عقبے کے محل کی مسجد میں پڑھتے ہیں۔ اور سب ہی پابند نماز لوگ ہیں۔ موجودہ والیٔ سوات کی تعمیری ذہنیت، عدل پروری، اور قوم پروری، اسلامی محبت جیسے عظیم اوصاف اور ہر دلعزیز شخصیت کے سلسلے میں بھی بادشاہ صاحب کی تربیت اور نگرانی پرورش کو بہت بڑا دخل ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ والی صاحب نہایت شریف اور رحم دل انسان ہیں۔ صاحب سوات کے خاندان کی قیادت اس دیس کے لیے قدرت کا سب سے بڑھ کر عظیم عطیہ ہے۔

شہزادہ صاحب سلطان روم۔ بابائے سوات کے نورنظر

ایک پیکرِ وفا

زمانے میں رہ کر وفا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اس دور میں جبکہ لفظ وفا کے شرمندہ معنے ہونے کی امیدیں قطع ہو چکی ہیں۔ بادشاہ صاحب کی وفاداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کئی سال ہو چکے کہ آپ کا ایک امام تھا جو کہ فوت ہو گیا۔ اس کے متعلقین میں سے صرف ایک معصوم بچہ رہ گیا۔ جو کہ امام مذکورہ کا سالا ہے۔ بادشاہ صاحب کے محل میں ایک جوان عمر کا لجیٹ رہتا ہے۔ جو کہ جہاں زیب کالج میں پڑھتا ہے۔ خوب ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ ہم جیسے غریبوں کو خوش آمدید کہنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے۔ تو یہ وہی امام صاحب کی نشانی بچہ ہے جس کی پرورش بادشاہ صاحب نے کی اور اسے اعلےٰ تعلیم بھی دلا رہے ہیں۔

۲۔ بادشاہ صاحب کے مذہبی استاد مولوی محمد ابراہیم مرحوم تھے۔ جو کہ قتاوےٰ دودیہ کے مولف بھی تھے اتفاقاً بیمار ہو گئے۔ پانچ ہزار سے زائد رقم اس کے علاج پر بادشاہ صاحب نے صرف کی۔ لیکن موت مقدر ہو چکی تھی۔ تجہیز و تکفین اور پختہ مقبرہ بنوانے کے اخراجات بھی بادشاہ صاحب نے ہی برداشت کئے اور پھر مرحوم کے والد مولوی عبدالمجید کو بادشاہ صاحب اپنا تنخواہ دار استاد مقرر کیا۔ جو کہ بادشاہ صاحب کے ساتھ ہی محل میں رہتے ہیں۔ کافی حد تک دلچسپ انسان ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ دولت دنیا سے ساتھ لے جانے کی چیز نہیں ہے۔ خود بڑی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ تاکہ پسماندگان کو پھر تکلیف نہ ہو۔ دارالعلوم حقانیہ کے ناظم اعلےٰ مولانا خان بہادر کو بھی ان کی علمی فضیلت اور بزرگی کے پیش نظر محل میں ہی رہائش کے لیے کمرہ دیا ہوا ہے۔

بادشاہ صاحب کی وفاداری کے اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن میں سے مشتِ نمونہ از خروارے کے مصداق یہ دو تین مثالیں میں نے پیش کی ہیں۔ وفاداری آپ کا شعار ہے اور جزوِ عمل بن چکی ہے۔

مخلص قیادت

دنیا میں اچھی حکومت اور مخلص قیادت ہر ملک کے لیے نعمت عظمیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سیاسی ہنگامے۔ جماعتی محاذ آرائی سے اگر انسانی مشکلات اور دکھ درد کا کچھ علاج ہو سکتا ہے۔ تو یقیناً ہم پاکستان والوں کی حالت آج کچھ اور ہوتی۔ انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے مسلسل جدوجہد اور دردآشنا دل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سادہ زندگی عظیم نعمت ہے۔ کسی سالک کا قول ہے کہ انسان اپنے لیے مصروفیت اور نئی نئی مشکلات پیدا کرنے کا خود ذمہ دار ہے۔ کسی بھی ریاست کے عوام کے لیے امن اور انصاف مخلصانہ قیادت کا ثبوت ہوتے ہیں۔ امن کی زندگی ہر فرد کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ بانیٔ ریاست سوات بادشاہ صاحب کی حکومت کی بنیاد انہی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ ریاست مثالی امن وامان کے لیے مشہور ہے۔ حصول انصاف میں کوئی دقت نہیں۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ کہ جنہیں مخلصانہ قیادت میسر ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی قوانین کی پیچیدگیاں تہذیب کے نام پر فیشن پرستی کی دہائیں، عوام دوستی کے بھاتے جمہوریت کے ہنگامے جس خطۂ ارضی میں پہنچ جاتے ہیں۔ حالات گواہ ہیں کہ پھر اس دیس کے باشندوں کی فراغت اور سکوں کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں کہ جو آج کل کے ہنگامہ پرور زمانے میں سادہ زندگی گذارتے ہیں۔ اور جن کی محدود آمدن بے شمار ٹیکسوں کے بوجھ اور قسما قسم فنڈوں کی اپیلوں سے آزاد ہوتی ہے۔ مغربی

ہیں حالات جو کچھ بھی ہوں لیکن اپنے ہاں تو حالات دگرگوں ہیں۔ یہ میرے ذاتی تاثرات ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے ایک ہی مضبوط شخصیت عوام کے دکھ درد کا سہارا بنتی ہے۔ ہمارے ملک میں باتیں بنانے والے اور بال کی کھال اتارنے والے نکتہ چین بہت ہیں۔ ہمارے ہاں بلند پایہ تصنیفات پیش کرنے والوں کی بھی کمی نہیں اور ضخیم کتابوں کی بھی کمی نہیں، شاعر اور ادیب بھی بے شمار ہیں۔ شعر و ادب کے صحیفے بھی بہت ہیں چرب زبانوں کی باتیں سنیئے، لچھے دار تقریریں سنیئے۔ مصالحے دار تحریریں پڑھیے، تو یوں معلوم ہوگا کہ ہمارا ملک تو بس مفکروں و دانشوروں کی ایک بستی ہے۔ جن میں سے ہر ایک انسانی مشکلات اور زندگی کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کی پوری پوری اہلیت رکھتا ہے ہر ایک، ایک نیا نظام اور نیا منشور پیش کر سکتا ہے۔ اور ان کے محاسن و عیوب پہ تو تبصرے کر سکتا ہے۔ ہماری زمین مردم خیز ہے۔ لیڈر، شاعر، مولوی، مجدد، مہدی وغیرہ سب کچھ پیدا کر سکتی ہے۔ نہیں پیدا کر سکتی تو صرف کام کے آدمی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ کام کرنے والے دیانت دار افراد کی ہمارے ہاں فقدان ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں اور اس ضمن میں تفصیلات کی باریکیوں میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ حالات خود ہی شاہد ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ ہم اور ہمارا ملک، ہمارا کردار، ایک مضبوط کردار کے بری طرح محتاج ہیں۔

سوات اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے جو کہ درحقیقت ۱۹۳۱ء میں مضبوط ہوئی ہے۔ اس سے بیشتر تو اس ریاست کی تعمیر و استحکام کا زمانہ تھا۔ تاہم اس کمسن ریاست میں مخلصانہ قیادت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جو کہ غنائم زمانہ میں سے ہیں۔ اپنی بساط کے مطابق یہ کافی حد تک ترقی کر چکی ہے۔ یہاں کی سادہ طرز کی حکومت اور سادہ مختصر دفتری نظام سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بغیر نوکر شاہی اور سراپا پیچیدہ قسم کے کاغذی دفتری نظام کے بغیر بھی حکومتی کاروبار چل سکتا ہے۔ پورے خلوص اور صدق دل کے ساتھ بغیر کسی ریا کے

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس جز کا رنگ بھی سادہ رنگ اگر اپنے کل سے منفرد ہی رہے تو یہ اپنے کل کے زیب و زینت کا باعث رہے گا۔ جیسے سرخ انگشتری میں سفید نگینہ یا چست و چوبند سپاہی کی سبز رنگ کی ٹوپی میں چمکتی ہوئی سفید کلغی، یہ ہے بادشاہ صاحب کا سوات، شمال مغربی سرحدی ملکت خداداد عظیم پاکستان کا ایک صحتمند جز، جیالے غازیوں کا دیس، جس کا معمار صغیر بانئے ریاست ایک سفید ریش جری دل مؤمن انسان ہے۔

ایک چینی شاعر نے لکھا تھا۔

میری آنکھوں نے ماضی کے جری دل شہیر نہیں دیکھے اور اب ان کا زمانہ گزر گیا۔

لیکن یہ سوچ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں کہ میں مستقبل کے جری دل شہیر کو زندہ دیکھوں گا۔

(مقتبس از فلسفۂ انقلاب)

اور اگر اس دور کے جری دل "شہیر" کو دیکھنے کا شوق کسی کو ہو تو ان کی رہنمائی کیلئے بجا طور سے عرض کر سکتا ہوں کہ معمار ریاست سوات بادشاہ صاحب کو دیکھ سکتے ہیں۔

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

مینو سواد

پنجم حصہ

از

محمد آصف خان

صحت افزا اور قابل دید مقامات

ریاست سوات میں وادیٔ سوات یوں تو بحیثیت مجموعی دلکش مناظر کا ایک مرقع ہے۔ تاہم اس میں کچھ مخصوص قسم کے زیادہ دلفریب خوبصورت مقامات بھی ہیں جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ **وادیٔ کلام:۔** بحرین سے بتیس میل کے فاصلے پر ایک خوبصورت وادی ہے یہ وادی قدرتی رعنائی کے لیے زیادہ مشہور ہے۔ اس وادی کے گھنے جنگلات بلند و بالا پہاڑ، برف پوش چوٹیاں، قدرتی بنے ہوئے تراشیدہ بسنرہ زاریں قابل دید ہیں کلام تک جانے کے لیے یک طرفہ ٹریفک کی سڑک حال میں تیار ہو چکی ہے۔

۲۔ **بحرین:۔** دو دریاؤں کے اتصال کا نظارہ بحرین میں قابل دید ہے۔ موجودہ عہد میں جو کہ وحشت کا دور ہے انسان انسان سے مل کر خوش نہیں ہوتا۔ لیکن برق و نور کے یہ مجموعے بلند و بالا برف پوش چوٹیوں کے فیض رساں فرزند یعنی یہ دونوں دریا جب بحرین کے قریب گلے ملتے ہوئے آپس میں ملتے ہیں تو ان کے سینوں کا خلوص اور محبت نور کی شکل میں اچھل اچھل کر ظاہر ہوتا ہے اور پھر یہ دونوں یک قالب و یک جان ہو کر نہایت تیزی کے ساتھ نشیبی علاقوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنے فرائض کا احساس رکھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ان کی روانی اور بہاؤ پر ہی تو لاکھوں انسانوں کی خوشحالی کا دار و مدار ہے بجلی کی مشین اور دوسرے کارخانے، صنعتی ادارے۔ ان سب کے چلانے کا ذمہ دار

یہی دریا ہے۔ شفاف پانی کے سانپ کی طرح بننے والی نہریں اور گندم کے لہلہاتے کھیت سب ان ہی کے منتظر رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ دوڑتے ہوئے جا رہے ہیں بھئی یہ دریا ہیں، دریا، انسان نہیں ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے فرائض سے غفلت کے نتائج کچھ اچھے نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی سوئے ہوئے غافل انسانوں کو جگانے کے لیے یہ دریا غضبناک ہو کر اپنی حدود سے باہر بھی ہو جاتے ہیں جسے سیلاب کہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمارے سوات کے دریاؤں کا تعلق ہے یہ معتدل مزاج بھی ہیں۔ بحرین کا قصبہ کوہستان کا دروازہ ہے۔ زندگی کے چند پرسکون اور خاموش لمحے گزارنے کے لیے یہ بہترین اور موزوں مقام ہے۔

۳۔ مدین:۔ بحرین سے سوات کی طرف سات میل کے فاصلے پر مدین بھی ایک پُرفضا مقام ہے۔ جہاں انسانی دماغ کی جدتیں، بجلی، بنگلوں اور شاندار ہوٹلوں کی صورت میں پہنچ چکی ہیں۔ صحت افزا ماحول سے تجارتی منڈی اور ترقی پذیر قصبہ ہے۔

۴۔ کروڑہ لائن:۔ وادیٔ کانا اور غوربند میں شانگلہ اور الپورہ بھی۔ نیز چکیسر قابل دید مقامات ہیں۔

۵۔ مرغزار:۔ ریاست سوات کے صدر مقام سیدو شریف سے تین میل جانب جنوب مغرب مرغزار کی پرفضا وادی شروع ہو جاتی ہے۔ اور آٹھ میل کے فاصلے پر کوہ ایم کے دامن کو پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ وادی بادشاہ صاحب کی ملکیت ہے۔ کوہ ایم کے دامن میں قصر سفید (سفید محل) کی شاندار اور خوبصورت عمارت، بادشاہ صاحب کی طرف مخصوص مہمانوں اور سیاحوں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ سفید محل ایک شاندار اور قابل دید عمارت ہے یہ بادشاہ صاحب کی گرمائی آرائش گاہ ہے۔ یہ کنج عافیت جسے اب سفید محل کہتے ہیں۔ بانیٔ ریاست سوات کے زاہدانہ ذوق کا بہترین انتخاب اور فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہے۔ مرغزار کے پہاڑوں میں اب پھل دار درختوں کے باغات ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ان درختوں کے سیب کابل اور کشمیر کے سیبوں سے زیادہ لذیذ

"مرغزار" کا سفید محل

ہوتے ہیں۔ بہر صورت یہ تو میں بھی شہادت دے سکتا ہوں کہ خوبصورتی اور جسامت میں یقیناً ان سے یہ بڑھ کر ہیں۔ یہ اپنا اپنا مقدر ہے۔ قسمت کے دھنی جو ہوتے ہیں ان کے کام ودھن کراچی میں بھی مرغزار کے سیبوں کی لذت سے لذیذ ہو جاتے ہیں۔ ایک ہم جیسے بدنصیب ہوتے ہیں کہ چشمے کے کنارے رہتے ہوئے پیاسے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مکہ شریف کے مضافات میں بسنے والے حاجی نہیں بن سکتے۔

بہر صورت جو کچھ بھی ہو مرغزار ایک خوبصورت وادی ہے۔ یہاں سیبوں کی افزائش نسل کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ اس موقع پر ایک مشہور شاعر خواجہ نظری کا شعر یاد آیا ہے

تنگدستے چوں تو کیے یا بد نظیری قرب دوست
آں چناں نوبادۂ ہرگز، قراداں کے شود

سیدو شریف سے صرف ایک میل ہی آگے چل کر پختہ فضا ماحول میں داخل ہو جاتی ہے۔ یکم مارچ سے پندرہ اپریل تک ہر سال یہاں کے نظارے بڑے دلفریب ہوتے ہیں

۶۔ میاندم:۔ مدین روڈ پر فتح پور، ایک قصبہ ۲۶ میل کے فاصلے پر مینگورہ سے واقع ہے۔ اسی قصبے سے آگے دائیں ہاتھ کو ایک سڑک پہاڑ پر چڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ سڑک میاندم کو جاتی ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے کچھ نیچے ہی خوبصورت نگلے بنائے گئے ہیں یہ بھی پُرفضا مقام ہے۔ ان مذکورہ مقامات کے علاوہ سوات میں کبل، جبد، پل ڈھیری وغیرہ دوسرے خوبصورت مقامات بھی ہیں۔

قابل دید عمارات

ریاست سوات میں بادشاہ صاحب کے عہد حکومت سے متعلق قابل دید عمارات

مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ سیدو شریف کی عالیشان جامع مسجد۔
۲۔ عقبے میں آپ کا رہائشی محل۔ (محل)
۳۔ عقبے میں بادشاہ صاحب کی آخری آرام گاہ۔
۴۔ سیدو شریف میں بعض افسروں کی رہائش گاہیں، اور شاہی مہمان خانہ، اور دوسرے مکانات رہائشی۔
۵۔ سوات ہوٹل کی بنگلہ نما رت۔ جس میں کافی حد تک اضافہ موجودہ والی صاحب کر چکے ہیں اور قریب ہی ایک شاندار دو منزلہ جدید ہوٹل بھی تیار ہو رہا ہے جو کہ والی صاحب کے تعمیری منصوبوں سے متعلق ہے۔
۶۔ شفاخانۂ حیوانات۔
۷۔ سٹیٹ ہسپتال بہ استثنائے دو منزلہ وارڈوں کے جو کہ عہد جہانزیبی سے متعلق ہیں۔
۸۔ مرغزار کا سفید محل
۹۔ علاقہ بونیر میں حاکم ڈگر کا بنگلہ اور عدالت۔
۱۰۔ ریاست سوات میں سیدو کے جہانزیب کالج کی شاندار سہ منزلہ عمارت، کالج کے ارد گرد خوبصورت بنگلے شاندار ہوسٹل وغیرہ سب قابل دید عمارات ہیں۔ لیکن ان کی تعمیر کا سہرا اعلےٰ حضرت موجودہ والیے سوات کے سر ہے۔

ریاست سوات کا رقبہ اور پیداوار

ریاست سوات کا رقبہ چار ہزار مربع میل ہے۔ آبادی اس وقت چھ لاکھ ہے۔ اس ریاست کی پیداوار میں گندم، جوار، چاول اور جو مشہور ہیں۔ میوہ جات میں سیب،

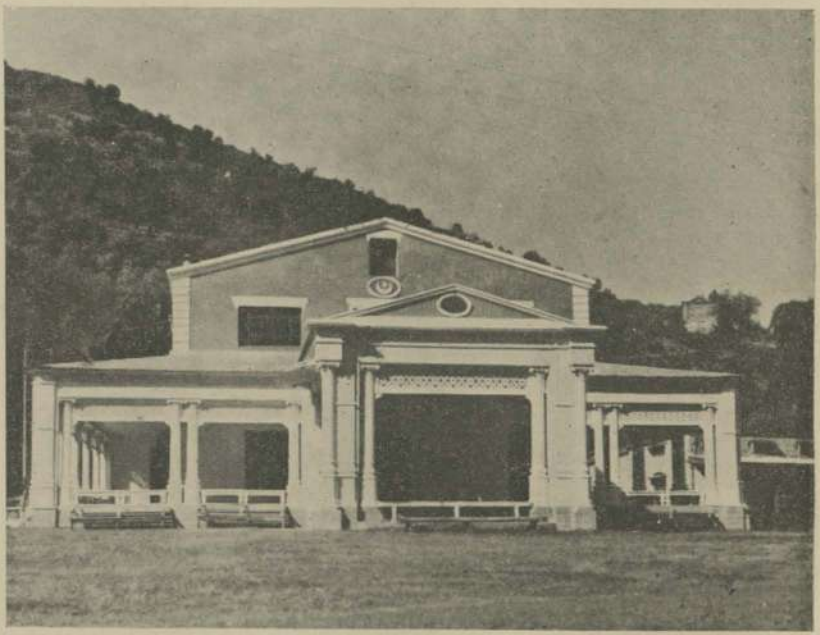

(عقبہ) بادشاہ صاحب کے رہائشی محل میں مرمرین مسجد

انگور، خوبانی، ناشپاتی، سنترہ، مالٹا، املوک، اخروٹ وغیرہ مشہور ہیں۔ شہد اور گھی بھی یہاں سے برآمد کیا جاتا ہے۔ اب جا بجا تمباکو کی کاشت اور فارمی گنے کی کاشت بھی شروع ہو چکی ہے۔ خدا کرے کہ موخر الذکر دو چیزوں کی کاشت، اس خوبصورت دیس میں غلے کی پیداوار پر اثر انداز نہ ہو۔ یہ امر خوش کن ہے کہ والی صاحب کی دور بین نگاہیں اس حقیقت کو بھانپ چکی ہیں۔ اور ان دونوں یعنی گنے اور تمباکو کی کاشت محدود کرنے کی پابندیاں عاید کی ہیں۔ ورنہ یہ تختے تو جس خطۂ ارضی میں بھی پہنچ جاتے ہیں وہاں لہلہاتے ہوئے گندم کے کھیت پھر کم نظر آتے ہیں۔

سوات کے مشہور پہاڑ

سوات کے مشہور پہاڑ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ مانکیال:- ریاست سوات میں ایک اونچی چوٹی مانکیال کی ہے اس پہاڑ کی بلندی ساڑھے اٹھارہ ہزار (۱۸۵۰۰) فٹ ہے۔ یہ چوٹی ہمیشہ برف پوش رہتی ہے۔ تابناک سورج کی شعاعیں بھی اس کو برف کے بوجھ سے چھڑانے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔ سب سے اونچی چوٹی کوہ فلک سیر کی ہے ۲۱۰۰۰ فٹ بلند ہے۔

۲۔ دوسری:- یہ پہاڑ دس ہزار فٹ کی بلند چوٹی رکھتا ہے۔

۳۔ کوہ الم:- اس کی چوٹی کی بلندی نو ہزار دو سو پچاس فٹ ہے۔ گھنے جنگلات اور زرخیزی کے لیے مشہور ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک چبوترہ بھی ہے۔ جس کے متعلق ہندو کا خیال ہے کہ رام چندر جی کا بنایا ہوا ہے۔ اور وہ کچھ عرصہ اس چوٹی پر بن باس کاٹ کر اس پہاڑ پر گذار چکے ہیں۔

ریاستی پہاڑوں میں جڑی بوٹیاں بکثرت ملتی ہیں۔

جھیلیں

درال اور سید گئی :- سوات کی مشہور جھیلیں ہیں۔ بحرین کے قریب بہتا ہوا دریائے درال اسی جھیل سے نکلتا ہے۔ درال کا پانی صحت بخش ہے۔ بحرین کے اوپر پہاڑ کی چوٹی پر یہ جھیل واقع ہے۔ اور اس سے آٹھ میل کے فاصلے پر دوسری جھیل سید گئی ہے۔ سید گئی کا ماحول بھی رنگین اور دلکش ہے۔ موجودہ وقت میں ان جھیلوں تک پہنچنے کیلئے کٹھن اور دشوار گذار راستوں سے جانا پڑتا ہے۔ لیکن ریاست کی ارتقائی رفتار سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں جب انسانی ہمت ان مشکلات پر قابو پالیگی تو اس پر فضا اور رنگین ماحول کی سیاحت سے بھی یار لوگ لطف اندوز ہوتے جائیں گے۔ موجودہ وقت میں پیدل سفر کر کے جانا پڑتا ہے۔ ان جھیلوں کے ارد گرد خوبصورت سبزہ زاریں ہیں۔

مذہب

ریاست سوات اور متعلقات میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد مشکل دو سو (۲۰۰) ہوگی۔ چھ لاکھ کے لگ بھگ آبادی ہے۔ سب کے سب حنفی مذہب کے مسلمان ہیں۔ صاحب سوات کے خاندان کی قیادت کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ریاست فرقہ بندی کی لعنت سے پاک ہے۔ مسلمان اور فرقہ بندی تو موجودہ زمانے میں اور اس سے پہلے ہر دور میں لازم و ملزوم رہے ہیں۔ یہ یہودی وزیر اعظم بن گوریاں کا قول ہے کہ مسلمان کبھی متحد ہو نہیں سکتے لیکن سوات میں صورت حال مختلف ہے۔ کہ یہاں قادیانی۔ اسماعیلی۔ شیعہ وغیرہ کے جھگڑے نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ بادشاہ صاحب کے فولادی کردار کے نتائج ہیں۔ جو کچھ کہ ہندو اور سکھ یہاں

یہاں رہتے ہیں انہیں ابتدا ہی سے شہری حقوق حاصل ہیں امن اور شانتی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ریاست کے عوام

سوات کے عوام خوش ہیں ان کی جہالت اور پسماندگی کے دن بیت چکے ہیں اب ان کا قافلہ شاہراہ حیات پر ایک خوشگوار منزل تک پہنچنے کے لیے آگے بڑھتا جا رہا ہے فیشن پرستی کے اثرات بھی اس ماحول میں داخل ہو رہے ہیں۔ تاہم سادگی ہنوز باقی ہے ان لوگوں کا سیاسی شعور بیدار ہے حکمران خاندان کے لیے انتہا خلوص اور مہربانیوں کا انہیں احساس بھی ہے بادشاہ صاحب نے اس ریاست کو قائم کر کے ان کے لیے ترقی کے دروازے کھول دیے ہیں۔ یہاں کا تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ ان حقائق سے بھی باخبر ہے کہ اسلامی ممالک اور دوسری ریاستوں کے سربراہ کس قسم کی گھناؤنی عیاشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اپنی رعایا کے حق میں کتنے سخت دل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس حکمران سوات کا کردار ہر قسم کی آلودگی سے پاک و صاف ہے۔ بادشاہ صاحب سوات کے محسن ہیں۔ ان کی شخصیت اور کردار سوات کے لیے ایک سرمایۂ افتخار ہے۔ ریاست کی سادہ طرز کی حکومت ہر لحاظ سے کامیاب ہے اور اس کے شاندار افادی نتائج ظاہر ہیں۔ یہی وجوہات ہیں کہ ریاست کے حکومتی طرز کو یہاں کے لاکھوں افراد کی سرفروشانہ حمایت حاصل ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ شمال مغربی سرحد کی یہ چھوٹی سی نیک نام ریاست پاکستان کا ایک صحت مند جز۔ مملکت پاکستان کے لیے بھی ایک سرمایۂ ناز ہے جو کہ دنیا کے ہر ملک کے سیاحوں اور دانشوروں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ ایک باغ ہے۔ خوبصورت اور پُرفضا باغ۔ جس کا سفید ریش بوڑھا باغبان اپنے خون جگر سے

اس کی آبیاری کرتا ہوا یہ دعوت دیتا ہے ؎

میں نے ایک باغ لگایا ہے ذرا دیکھو تو

جابرانہ قسم کی خان ازم ختم ہو چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پہاڑوں میں محصور رہنے اور صدیوں سے ایک محدود اور دنیا سے کٹے ہوئے ماحول میں رہنے کی وجہ سے ان لوگوں کی ذہنیت کچھ جداگانہ رنگ بھی رکھتی ہے۔ ان کے دلوں اور نگاہوں میں وہ وسعت نہیں ہے جو کہ افغان قوم کے دوسرے قبائل کا طرۂ امتیاز ہے۔ انہیں دنیا کی آبادی و بربادی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بس ان کی تو یہی اپنی الگ دنیا ہے۔ لیکن اس خامی کو دور کرنے کی سعی بھی جاری ہے۔ یہ لوگ اور ریاست خوش نصیب ہیں۔ کہ جوانی میں اپنے بانی معمار کی شجاعت، بلند ہمتی، اور تدبر سے مستفیض ہوئے۔ اور اب بڑھاپے میں موصوف کی تقدس اور نیک دعاؤں سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

نئے انکشافات

اس کتاب کے حصہ اول میں اس سرزمین میں یوسف زئی کے تسلط تک کے واقعات سرسری ہم نے بیان کیے ہیں جس کے متعلق مختلف کتابوں، تاریخ خورشید جہان وغیرہ کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے یہ سب کچھ محض تاریخی تسلسل قائم رکھنے کے لیے ہم نے لکھا ہے۔ ورنہ ہمارا تعلق اس ریاست کی تاریخ اور بانیئے ریاست کی سوانح عمری سے ہے۔ تاریخی تسلسل کے ان واقعات کو جب تک کہ مستند اور معقول اثباتی دلائل اس کے برعکس حاصل نہ ہوں۔ غلط بھی نہیں کہا جا سکتا۔

گزشتہ دو سال سے سوات میں اطالیہ کے ایک ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ٹوچی کی سرکردگی میں باہر ین کی ایک جماعت آثار قدیمہ کی تحقیقات میں مصروف عمل ہے جا بجا کھدائی ہو رہی ہے۔ یہ لوگ سال میں صرف دو مہینے کام کرتے ہیں۔ لہٰذا انکشافات

کی توقع کی جارہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جدید تحقیقات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سکندر اعظم سے قبل اور مسیح سے پانچ سو برس پہلے جب ھن قوم بربریت اور درندگی کے نشے میں مست ہو کر انسانیت کے لیے ایک تباہ کن آفت بن گئی۔ تو سوات کی سرزمین بھی ہن قوم کے تاخت و تاراج سے محفوظ نہ رہ سکی۔ خوخوار مہرگل کی قیادت میں ہن لشکر نے سوات کو بھی تباہ کیا تھا۔ اس طرح دوسرے واقعات کا بھی سراغ ملتا ہے سوات کا تاریخی سلسلہ ڈھائی ہزار سال پہلے کے زمانۂ قدیم سے شروع ہوتا ہے۔ اس سرزمین کو مختلف قوموں کا مسکن بننے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ سب سے آخیر میں یہ ارضی جنت یوسف زئی پٹھانوں کے حصے میں آئی اور اب انہی کا وطن ہے۔ اور پھر جب قدرت کو اس کی زیادہ بہبودی اور ترقی منظور ہوئی تو خطۂ قندہار کے نواح سے صافی قبیلے کے ایک محترم خاندان کو سوات میں آباد کیا۔ اسی خاندان نے اس ماحول میں ایک مینار نور کی شکل اختیار کی۔ یہ صاحب سوات کا خاندان ہے۔ بادشاہ صاحب کی سرفروشانہ جدوجہد نے ہی اس ریاست کی ترقی اور عروج کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔ اب بادشاہ صاحب کے جانشین مصروف عمل ہیں۔ اس طرح سوات اور سواتی قوم کا بیسویں ترقی یافتہ منزل کی حدود میں داخل ہو کر آگے بڑھتا جارہا ہے۔ اب سوات کی مثال شتر آوارہ کی نہیں ہے۔ بلکہ سفر حیات کے تقاضوں سے خبردار، اپنے فرائض سے آگاہ ایک سالار کے توسط سے یہ مختصر سا قافلہ بھی، قافلۂ عالم سے منسلک شاہراہ حیات پر اپنا سفر طے کرتا ہوا جارہا ہے۔ یہ درست ہے کہ سوات رنگین۔ آبشاروں برف پوش چوٹیوں، دلکش سبزہ زاروں پر فضا مناظر کا ایک مجموعہ ہے۔ حسن و صحت کا ایک توانا پیکر ہے۔ وہ لوگ جو سوات کی حسین وادی میں زندگی کی چند خوشگوار گھڑیاں بسر کرنے یا سیاحت کے لیے آتے ہیں۔ انہیں اس منفرد اور سادہ سے خوبصورت ماحول شہری قسم کے لوازمات یا مشینی دور کے پیدا کردہ تکلیف دہ خصوصیات کی جستجو

نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ اپنی زندگی کو اس سادگی اور سکون کا خوگر بنانا چاہیئے۔ تاکہ ان کے دل و دماغ درحقیقت سکون محسوس کر سکیں۔ میں دل کے انتہائی خلوص سے یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے کہ اس خوبصورت ولیس کی انفرادیت ہمیشہ قائم رہے۔

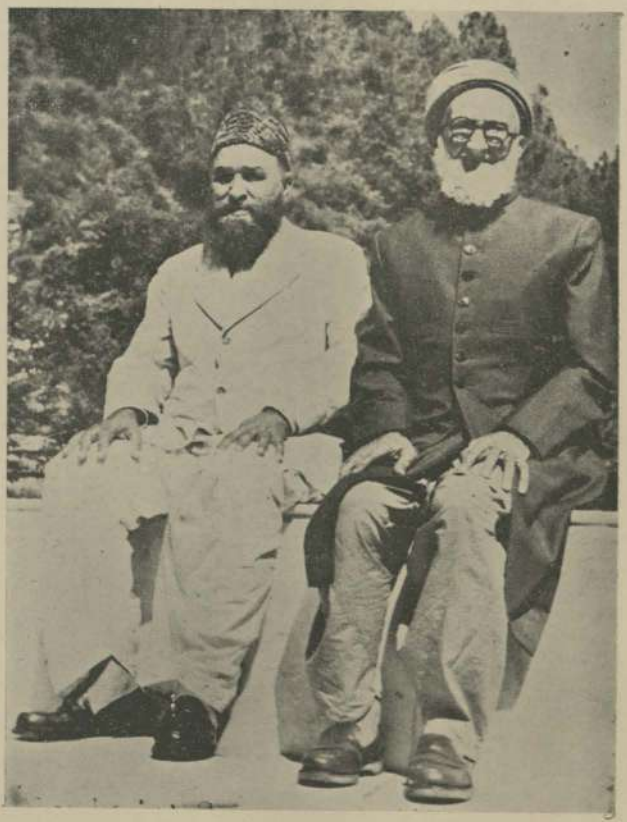

شاہراہ حیات کے دو تھکے ہوئے راہی
زندگی کے آخری موڑ پر
بادشاہ صاحب اپنے وفادار رفیق خان بہادر سلطنت خان
کے ہمراہ

گفتنی و ناگفتنی

حرف آخر

ہم اور ہمارا ماحول

نوالہ حصۂ تن پروراں نظیری شد
بیا کہ قسمت ما و تو غیر نالہ نماند
(نظیری)

مرا بدست تہی گوشۂ نقاب سپرد
کم است آدم مفلس بہ اعتماد افتد
(نظیری)

حرفِ آخر

۱۔ ریاست سوات کی تاریخی جدوجہد کی تاریخی سرگزشت تک اور بابائے ریاست کی سوانح عمری کا یہ ضخیم مجموعہ آپ کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گا۔ اسے ختم کرنے سے پہلے کچھ اپنے متعلق اور اس کتاب کے متعلق بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ملک میں باتیں کرنے والوں اور کتابیں تصنیف کرنے والے مصنفین و مؤلفین کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہماری زمین "بڑی" مردم خیز ہے۔ ہمارے ہاں کتابوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ شاعروں کی بھی کمی نہیں۔ ایک سفید ریش جیسا شاعر۔ کاغذوں کا ایک ضخیم بنڈل پھراتا ہوا ملا۔ جناب زندگی یعنی عمر عزیز کے چالیس سال شاعری میں ضائع کر چکا ہوں۔ ایک لاکھ اشعار کا ذخیرہ میرے پاس ہے۔ کوئی قدردان نہیں ملتا۔ میں نے کہا بڑے میاں اگر آپ کا یہ کہنا درست ہے تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ زندگی کو شاعری میں ضائع کرنے کا حق قطعاً آپ کو حاصل نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں بلند پایہ تصانیف کی بھی کمی نہیں ہے۔ تصانیف کے ذخیرے دیکھئے۔ چرب زبان نکتہ چینوں کی نکتہ چینیاں سنیئے۔ لچھے دار تقریریں پڑھیئے۔ مصالحہ دار تحریریں پڑھیئے۔ تو یوں معلوم ہوگا کہ ہمارا ماحول، اور ہمارا ملک، دانشوروں اور مفکروں کی ایک حسین بستی ہے۔ جن میں

ہر ایک انسانی مشکلات، اور زندگی کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے ہر ایک دوسرے پر اس انداز سے معترض ہوتا ہے کہ گویا وہ دنیا میں بس خود ہی واحد، باکمال بستا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نیا مکتب فکر بسانے اور نیا نظام زندگی تک پیش کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ موجود ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی حالت دیکھئے۔ افلاس کی تباہ کاریاں دیکھئے۔ تو ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ نہیں ہے تو صرف کردار نہیں ہے۔ کام کرنے والے ایماندار نہیں ہیں معترضین کی کمی نہیں ہے۔ دوسروں کے کام میں کیڑے نکالنے والے ہزاروں ہیں۔ لیکن کام کر کے دکھانے والا کوئی نہیں۔ دنیا کے مختلف نظاموں کا مسخر خوب اڑا سکتے ہیں۔ لیکن اپنا کوئی کمال نہیں دکھا سکتے۔ بس یہ تو گزرے ہوئے زمانے کی کہانیاں اور سلف صالحین کے کردار کی داستانیں بنا سکتے ہیں، خالدؓ، اور محمد بن قاسم اور دوسرے قابل ستائش غازیوں کے کردار سے متعلق ضخیم، ناولیں مرتب کرنے میں عمر عزیز ضائع کر سکتے ہیں۔ لیکن خود ان میں سے کسی ایک کے کردار کو اپنانے کی غلطی ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے۔ بس جی ہم تو شیش محل میں بیٹھ کر راہ چلنے والوں پر پتھر پھینکنے کو ہی معراج عمر سمجھتے ہیں۔ تو یہ ہم ہیں اور یہ ہمارا ماحول ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں جب کوئی کردار کا غازی بن کر اپنے فولادی کردار سے صفحۂ ہستی پہ کچھ پائدار نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ تو یقیناً ایسے جیالے غازی کے کردار اور شخصیت کے متعلق جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ ہم اور ہماری یہ کتاب اس کے متعلق ہمیں قطعاً یہ دعویٰ نہیں کہ یہ کوئی بلند پایہ تصنیف ہے۔ اور یا ہمچو قسم کی تصانیف میں اضافہ کرنے کے خیال سے ہم نے یہ کوشش کی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک سادی کتاب ہے۔ سادے رنگ کی تاریخی تصنیف جس میں ایک خوبصورت۔ سادے ماحول میں بسنے والے سادے پٹھانوں کے حالات زندگی، کوہستان کے ایک سادہ مزاج۔ سادگی شعار مومن رہنما کی سوانح حیات اور اس کی تعمیری جد وجہد کی سرگزشت ہے بس صرف اتنی کہ اس نے کام کیا ہے۔ اور

کام بھی اپنے وطن اور ہم جنسوں کی بھلائی کی خاطر کیا ہے اس کی زندگی میں باتوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ اپنے عہد کا ایک جری دل شیر ہے۔ لہٰذا ہمارے اس تاریخی مجموعے میں ان خصوصیات کو دخل نہیں ہے جو کہ کسی بلند پایہ تصنیف میں ہوتے ہیں۔

۲۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ناصح اور مفکر بن کر دوسروں کو نصیحتیں کرتا پھرے جب ہم خود اپنی زندگی نہ بنا سکے تو دوسروں کو زندگی کے مسائل اب کیا سمجھائیں گے ہم کسی عقل و دانش کے دعویدار نہیں ہیں۔ عقل و دانش ہوتی تو یوں افلاس کی تاریک وادیوں میں سرگرداں نہ پھرتا۔ اپنی شخصیت اور زندگی کو کم از کم ان لوگوں کی حقارت آمیز نظروں سے تو محفوظ کر لیتا جو میرے نزدیک انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی اور اتفاق زمانہ سے ہمارے وطن عزیز کے سرخ نوٹوں سے کھیلتے ہیں۔ لہٰذا میں ناصح اور مفکر کیوں بنوں۔ جبکہ رزاق دوجہاں کے خزانوں سے ہمیں صرف ؎

ملتا ہے غم تو وہ بھی کسی کا دیا ہوا

ہمارے اسلامی ماحول میں ناصح وہی بن سکتا ہے جس کی نصیحت وزن دار ہو۔ اور کچھ روپہلی سی ہو۔ یعنی جو کہ زردار ہو۔ غریب اور تہیدست کی باتیں فی الحال ہمارے ماحول میں بے اثر ہوتی ہیں۔ لہٰذا بے اثر باتیں کرنے سے فائدہ کیا۔ میں فطرتاً بھی خاموش طبع اور کم گو انسان ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ خاموشی میں بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کو کہے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ناصح و دانشور کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک لٹے ہوئے راہگیر کی حیثیت سے جو کسی شاہراہ پر لٹ گیا ہو ؎

بڑے خطرے ہیں اس راہ میں

چنانچہ اس کتاب کے اول تا اخیر اگر کہیں بھی میرے قلم نے ناصحانہ رنگ اختیار کیا ہے تو صرف اسی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ فی الحال ہمارے ماحول میں لکھنے پڑھنے کا شغل ایک بیکار وصف ہے۔ بڑے بڑے فاضل مصنف بھی اپنے آپ

کو روتے پھرتے ہیں۔ لہٰذا ادیب یا فاضل بن کر اگر کوئی اترا تا پھرے تو یہ اس کی حماقت ہوگی۔ ہاں اگر حسن اتفاق سے اس کی مالی حالت کچھ اچھی ہو تو پھر بیشک اس کو فخر کرنے کا حق ہے۔ لیکن مجھ جیسے قلاش لکھے پڑھے کے لیے تو لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ یہ مفید ہوگا کہ بہترین قسم کا بیرڈ لیبر بنے۔ عالیشان شہروں میں رہے۔ اور امیروں کے بنگلوں سے جواہرات چرا کر عیش کرے۔ پیارا نوجوان، لولی بوائے، بنا رہے۔ اور یا کوئی قمار خانہ کھول کر ہزاروں روپیہ پیدا کرتا جائے۔

۳- چونکہ یہ تاریخ ریاست سوات کی تعمیر و قیام سے متعلق ہے اور بابائے سوات کی سوانح عمری ہے لہٰذا صرف بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء تک یعنی بادشاہ صاحب کی حکومت سے دستبرداری تک کے واقعات اور حالات کا مجموعہ ہے۔ بارہ دسمبر ۱۹۴۹ء کے بعد تاریخ سوات کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جو کہ روشن اور چمکدار ہے۔ یہ تاریخ چونکہ بادشاہ صاحب کی طرف سے ان کی نگرانی میں لکھی گئی ہے ظاہر ہے کہ موصوف صرف انہی واقعات پر تبصرہ کر سکتے ہیں جو ان سے متعلق ہوں۔ اور یہ بھی اس خیال سے نہیں کہ گویا انہیں اپنی تشہیر مطلوب ہے بلکہ صرف اس خیال سے کہ ؎

تاریخ واقعات شہاں تا نوشتہ ماند

بحیثیت معمار ریاست ان کی ہستی ایک سند کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اور صحیح واقعات صرف وہی بیان کر سکتے تھے۔ لہٰذا موصوف نے یہ ضروری تصور کیا۔ کہ اس فرض کو بھی ادا کیا جائے تاکہ بعد میں کوئی الجھن نہ ہو۔ ورنہ ۱۹۴۹ء کے بعد سوات کے دوسرے دور کی تابناکی اور حیرت انگیز ارتقائی تعمیری رفتار سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن اگر دوسرے دور کے حالات کو بھی اس مجموعے میں شامل کیا جاتا تو اس تاریخی مجموعے کی کتابی ترتیب کچھ مناسب سی ہو جاتی۔ دوم یہ کہ یہ ایک قسم کی علو، تصور کیجاتی کیونکہ دوسرے دور کے معمار بھی بادشاہ صاحب کے فرزند رشید تو ہیں۔ جو کہ اپنی

شخصیت اور عظمت کو خود ہی اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے متعارف کرا چکے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ ہمارے ماحول میں چڑھتے سورج کے "پجاری" ہزاروں ہیں مجھے فخر ہے کہ غروب ہونے والے سورج کی سنہری کرنوں کے شفق پاشیوں کی منظر کشی میرے نصیب میں آئی۔ یہ ماحول بھی ایسا ہے کہ سورج کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی چودہویں کا چاند (بدر کامل) اپنی تمام نمود فشاں تابناکیوں سمیت جلوہ گر ہو چکا ہے۔ اس دیس میں بادشاہ صاحب اور والی صاحب کی حیثیت یقیناً آفتاب و مہتاب جیسی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت بھی اس لیے پیش آئی کہ وہ یاران بہانہ جو رائی کا پہاڑ بنانے کیلئے ہر وقت کمر کسے ہوئے مستعد رہتے ہیں۔ لگے ہاتھوں کہیں انہیں یہ بھی بہانہ ہاتھ نہ آجائے اور اگر میں ان کے اس قسم کے جذبات کے دسترس سے محفوظ رہ جاؤں تو یہ بھی میری خوش نصیبی ہوگی۔

۴۔ میران اردو کے شہسواروں سے بصد ادب میں التماس کروں گا کہ اگر انہیں اس مجموعے کی ترتیب و تصنیف میں کچھ فنی خامیاں یا لسانی کمزوریاں بھی نظر آئیں۔ تو مجھے امید ہے کہ مندرجہ ذیل وجوہات کو بھی ملحوظ رکھیں گے۔ اور خواہ مخواہ میری ذات کو لعن وطعن نہیں بنائیں گے۔ ہر چند کہ میں اپنی شخصیت کو لعن وطعن کی سزاوار گردانتا ہوں۔

(۱) کچھ مشکلات ایسی تھیں کہ جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن بری طرح میری تخلیقی اور دماغی صلاحیتوں کی راہ میں حائل تھیں۔ ان مشکلات میں سے جن کا اظہار میرے خیال میں مناسب ہوگا ذکر آگے چل کر کروں گا۔

یہاں پر صرف اتنا کہوں گا کہ آخر ہم پشتو بولنے والے پٹھان ہی تو ہیں۔ لہٰذا ہم دیسی اردو تو یقیناً نہیں لکھ سکتے۔ کہ جیسے وہ لوگ لکھتے ہیں۔ جن کی مادری زبان اردو ہو۔ لیکن اپنے محبوب ملک کی قومی زبان اردو کے احترام کا خیال رکھتے ہوئے ہم نے یہ کتاب اردو زبان میں ہی پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اور حتے المقدور بساط بھر ہم نے کوشش

کی ہے۔ کہ قابل احترام اردو کی لذت اور محبوبیت کو دیدہ دانستہ ہمارا قلم مجروح نہ کرے اور اگر اسے بیجا علو پر محمول نہ کیا جائے تو ہم بعد عجز و نیاز یہ گذارش کریں گے کہ ہم اپنی کوششوں میں آخر اس حد تک تو یقیناً کامیاب ہوں گے کہ تاریخی حقائق کی ایک ایسی کتاب آپ کی خدمت میں (اردو دان طبقے) پیش کر رہے ہیں کہ جسے پڑھتے ہوئے آپ بہت زیادہ اجنبیت یا دقت تو محسوس نہیں کریں گے۔ یہ ایک پٹھان مجاہد کی سوانح عمری ہے۔ اور ایک پٹھان ریاست کی تاریخ ہے جس کے حکمرانوں کو اردو کے ساتھ بھی ویسی ہی محبت ہے۔ کہ جیسی کہ اپنی علاقائی زبان پشتو کے ساتھ ہے۔ بلکہ اردو کے ساتھ زیادہ ہے۔ کیوں کہ بحیثیت قومی زبان اس کے احترام کا خیال زیادہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ تو میں عرض کر چکا ہوں کہ لکھنے والا بھی پٹھان ہے۔ گردش روزگار کا ستایا ہوا ایک خانماں سوز قسم کا پٹھان جس کے معمودہ احساس میں ہر وقت ایک حشر سا برپا رہتا ہے۔ ایک مظلوم اور تباہ حال انسان جس کی شخصیت کے حق میں کسی سے بھی انصاف یا ہمدردی کی توقعات سے اس کا ذہن مایوس ہو چکا ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ لہٰذا اردو میں لکھنے کوششیں ہم کیسے ترک کر سکتے ہیں۔ "بابر اکبری" میں مولانا آزاد نے اپنے محبوب ٹوڈرمل کے حق میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے ایک قوم اور ایک علاقے کے علاقائی خود مختاری کی جدوجہد کو یوں بیان کیا ہے۔

۹۹۳ھ اسی سن میں کوہستان یوسف زئی و سواد وغیرہ کی مہم ہوئی۔ بیر بر مارے گئے۔ بادشاہ کو نہایت رنج ہوا۔ دوسرے دن انہیں (ٹوڈرمل) کو روانہ کیا۔ مان سنگھ جمرود میں تھے۔ تاریکیوں کے ہجوم میں تلوار سے روشنی کر رہے تھے۔ حکم ملا کہ راجہ سے جا کر ملو، انکی صلاح سے کام کرو۔ راجہ نے کوہ لنگر کے پاس سواد کے پہلو میں چھاؤنی میں ڈال دی۔ فوجوں کو پھیلایا۔ راہزنوں کی حقیقت ہی کیا ہے مارے گئے، باندھے گئے۔ بھاگ گئے۔ یہ سرکشوں کی گردنیں توڑ کر سربلند اور سرفراز واپس آئے۔

(صفحہ ۵۲۶ بابر اکبری)

تو یہ ہوتے ہیں نتائج حالات اور واقعات سے بخوبی واقف نہ ہونے کے یا ذہنوں کے تاریک تہہ خانوں میں چھپے ہوئے خاص قسم کے تعصب کے، لہٰذا ہم نے خود ہی یہ مجموعہ لکھنے کی کوشش کی۔

۵۔ موجودہ وقت کے متعلق یعنی عہد حاضرہ کے متعلق میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ "شکوک" بدگمانیوں، شبہات اور علاقائی اور قبیلوی تعصب کے عروج کا دور ہے۔ انسان اگر جائز بات بھی کرے تو اس پر شک کیا جاتا ہے۔ ذہن تاریک اور دلوں کی وسعت تنگ ہو چکی ہے۔ ہر انسان دوسرے انسان کو مشتبہ اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جس شخص سے کسی کو دو پیسے کا نفع حاصل ہونے کی امید نہ ہو اس سے بات تک نہیں کرتے۔ اخلاقی بدرنگی کی یہ حالت ان لوگوں کی ہے جو بزعم خود تعلیمیافتہ بھی ہیں۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ میں نے انتہائی مسرت اور تنگدستی کے عالم میں اس کتاب کی تدوین و تصنیف کی ذمہ داری قبول کی۔ لہٰذا اس دوران میں کچھ مشکلات ایسی تھیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو یقیناً میرے دل و دماغ سے زیادہ بہتر طریقے سے کام لیا جا سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ان مشکلات کا دفعیہ نہ ہو سکا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ دنیا میں چغل خور، حاسدوں کی کمی نہیں ہے۔ اس قسم کے چغل خور حاسد لوگ ذاتی خیر خواہی اور وفاداری جتلانے کے لیے مجھ جیسے لاتعلق اور خاموش طبع انسان کو بھی معاف نہیں کرتے۔ ذرہ سی معمولی عزت افزائی بھی کسی غریب کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی ہے۔ لہٰذا اس غریب کی شخصیت کو اپنے تاریک ذہنوں کی گولہ اندازیوں کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ غالباً کچھ ایسی ہی وجوہات تھیں۔ کہ پیش آمدہ مشکلات کا دفعیہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ اگر کیا جاتا تو نتائج خوشگوار ہوتے۔ مطالعے کا کوئی موقع بھی نہ ملا۔ جو کہ ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ انتہائی تنگدستی کے عالم میں

میں نے یہ کام شروع کیا۔ اس کے بعد جاڑے کا ناخوشگوار اور اذیت ناک موسم سر پہ آگیا۔ جو کہ قلمی محنت اور دماغی کام کے لیے بہت ہی ناموزوں ہوتا ہے۔ غریب اور مفلس ہونا دنیا کے ہر حصے میں گناہ ہے۔ لیکن اس ماحول میں تو یہ احساس انسان کو نیم پاگل کر دیتا ہے اور پھر بعض لوگوں کی مشتبہ قسم کی کھا جانے والی نظریں تو حساس قسم کے دل میں خنجر کی طرح اترتی ہیں۔ اور بعض وہ لوگ جو کہ غلط سوچنے والے بدگمان قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی مفلوک الحال قسم کے پڑھے لکھے کو دیکھ کر جب ان کے ہونٹوں پہ ایک خوفناک قسم کی طنزیہ تبسم آجاتی ہے۔ اس قسم کا تبسم یا زہریلی مسکراہٹ دل و دماغ میں ایک زہر الود پلیتے کی طرح اترتی ہے۔ اور ایسے میں انسان کے دماغ میں ہتھوڑے جیسے چلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ اور ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی کسی کا مقدر نہیں چھین سکتا۔ میں نہیں سمجھا کہ اس قسم کے عقاید کا زبانی اقرار کرتے ہوئے بھی یار لوگ اپنے دلوں کو باطل توہمات اور غلط اندیشوں کا مسکن کیوں بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجوہات ہوتے ہیں کہ بسا اوقات انسان کی مفلسانہ حیثیت اس کے فنکارانہ اہمیت کی راہ میں بھی دیوار چین بن جاتی ہے۔ تاہم میں اپنے آپ کو ان افراد میں سے ایک سمجھتا ہوں کہ جن کی زندگی کی انتہائی اہم ضروریات کا مسئلہ حل ہو۔ تو سونے چاندی یا روپیہ پیسے کے انبار دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں زلزلے نہیں آتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شرافت اور دیانت داری کے مظاہروں کے شوق میں انسان خوشحالی اور فراغت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے کہ باوجود ہر کوشش اور جدوجہد کے بھی آسودہ حالی کا دامن ہاتھ میں لینے سے محروم ہو جاتا ہے موجودہ عہد میں معمولی قسم کی ملازمت یا مزدوری تو بس گذارا وقات کا ہی ایک ذریعہ ہو سکتی ہے۔ بگڑی سنوارنے کا نہیں جب آبائی جائداد اور دوسرے ذرائع آمدن ختم ہو جاتے ہیں اور کوئی خاص موقع جوڑ توڑ کا بھی نہ ملے، تو پھر کیا رہ

رہ جاتا ہے بقول غالب ؎

صرف بہائے مئے ہوئے آلات میکشی
تھے یہ ہی دو حساب جو بیباق ہو گئے
(غالب)

بایں ہمہ میں نے اپنی طرف سے کوئی سستی نہیں کی ہے۔ بساط بھر جو کچھ کہ مجھ سے ہو سکا میں کر چکا ہوں۔ اور جو کچھ کہ میرے بس میں نہیں تھا اس کے لیے شاید مجھے قصوروار بھی نہیں سمجھا جائے گا۔ کیوں کہ اپنی طرف سے اس کتاب کو دلچسپ بنانے میں میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ کسی قسم کے مالی فوائد کی توقعات اور امیدیں نہ تو درمیان میں ہیں اور نہ ہی ہمچوں قسم کی توقعات دل میں رکھتا ہوں۔ میرے دل میں خلوص کی جس قدر بھی دولت ہے اسے انتہائی کشادہ دلی سے اس کتاب پر نچھاور کر چکا ہوں۔ ؎

شادم از زندگی گئے خویش کہ کارے کردم

ان مذکورہ معروضات سے مطلب یہ ہے کہ میں نے مبالغے سے حتے الوسع گریز، قلم کو بچانے کی ہر ممکن سعی کی ہے

صیدِ زبوں کی کہانی

۶۔ کئی سال پہلے کی بات ہے یعنی نو دس سال پہلے کی، جبکہ اس کی عمر چوبیس سال کی تھی۔ اقتصادی حالت گوارہ تھی۔ معمولی سی زمینداری بھی تھی۔ شہری فضاؤں سے دور پہاڑوں سے گھرے ہوئے دیہاتی ماحول میں رہائش تھی، ایک رائفل بھی پاس تھی۔ اکثر اپنے دیس کے پہاڑوں میں شکار کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور شکار بھی وحشی

مزاج ہرنوں کا، پھر یہ بدن کی وہ ہرنیاں جن کی آنکھیں خوبصورت ہوتی ہیں معشوق صفت ہرنیاں، جن کی چال ایک نمونۂ بانکپن ہوتی ہے جو کہ شکاری کو دیکھ کر قلانچیں بھرتی ہوئی نکل جاتی تھیں۔ شکاری کی رائفل سے ان میں شاذ و نادر ایک آدھ شکار ہو جاتی ورنہ رحمدل شکاری تو سارا دن حسین ہرنیوں کی بانکی اداؤں کے تماشے دیکھ کر شام کو خالی ہاتھ اپنے گھر کو لوٹ جاتا۔ اس کے دوسرے رفیق شکاری اکثر اس پر برس پڑتے، بوقوف نہیں آئے ہوئے شکار کو چھوڑ دیا۔ اور پھر بانکے ہرن کا بھنا ہوا گوشت کتنا لذیذ ہوتا ہے۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا، لیکن وہ چپ ہو جاتا۔ اس کے لیے شکاریوں کو یہ سمجھانا مشکل تھا کہ محض لذت کام و دہن کے لیے ایک خوبصورت اچھلنے اور کودنے والی ہرن کو لذت زیست سے محروم کرنا بھی تو ظلم ہے۔ اور پھر مائزر کے چھیرنے والی گولی سے تو بہت زیادہ سنگدلی ہے۔ کہیں دام سے پھنس جائے پیار اور محبت سے اسے ذبح کیا جائے۔ تو بھی کچھ سلیقے کی بات تو ہوئی۔

ایک دن وہ اکیلا شکار کو نکلا۔ گاؤں کی ایک خوبصورت ہرنی کی خوبصورت آنکھیں آنکھوں میں بسائے ہوئے وہ پہاڑوں میں چلا گیا۔ ایک پہاڑی سبزہ زار میں خوبصورت ہرنیاں چرنے میں مصروف تھیں۔ شکاری پہلے سے ہی پہاڑیوں میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی مشرق کے دریچے سے شاہ خاور سر نکال کر سنہری کرنیں پہاڑ کی چوٹیوں پر نچھاور کر رہا تھا۔ انتہائی حسین منظر تھا۔ شکاری سوچ رہا تھا کہ نپے تلے شارٹ مائزر کے ایک ہی ہیبتناک فائر سے ان معصوم ہرنیوں کے دل دہل جائیں گے اور ایک آدھ کا خون شاید خاک پر لوٹتا ہوا نظر آئے۔ اتنے میں ایک متوحش ہرن کہیں سے بھاگتا ہوا پہنچ گیا۔ اب یہ سب چوکنے ہو گئے۔ ادھر ادھر دیکھا تو وارد ہرن سے کچھ سرگوشیاں کیں دو چار منٹ تو یہ مستعد سپاہی کی طرح چوکنے کھڑے رہے۔ اس کے بعد پھر گھاس چرنے میں مشغول ہو گئے۔ شکاری نے کہا کہ میں

اپنے دل کی ذرہ سی خوشی کے لیے ان معصوموں کی خوشیوں کا خون نہیں کروں گا، چلا آیا۔ دوپہر سے پہلے گاؤں پہنچ گیا۔ اور پھر اپنے ایک شکاری دوست سے یہ واقع بیان کیا تب اس کے دوست شکاری نے کہا کہ تم بیوقوف ہو شکار کے لیے پتھر کا دل چاہیئے اور سیمنٹ کا کلیجہ تم نے نہیں سنا کہ علامہ اقبال اس باب میں فرما چکے ہیں ؎

جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانا

سنو گوتم بدھ کے مرید، دنیا میں رہتے ہو تو پختہ کار شکاری بنو۔ ورنہ استعفا دے دو، جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ شکاری نہیں بنو گے تو شکار ہو جاؤ گے زندگی کے دن سرعت کے ساتھ گزرتے گئے۔ پانچ سال کے بعد وہ رحم دل شکاری گردش روزگار کا شکار ہو ہی گیا۔ وہ مختصر سی زمینداری جس کی حیثیت اس کے لیے ایک ریاست کی تھی ختم ہو گئی پے در پے حادثات اور کردار میں کچھ خامیاں ہونے کی وجہ سے وہ نیم دیوانہ سا ہو گیا۔ دستر خوان کے مجاہد لوگ نو دو گیارہ ہوئے۔ اس کی دماغی قوت فیصلہ کچھ مفلوج سی ہو گئی۔ اور اپنے جلتے ہوئے آشیانے کا تماشہ دیکھنے کی ہمت اس کی ذات میں باقی نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کے حقائق اور اذیت ناک تلخ احساسات سے فرار اختیار کرنے کے لیے تیار ہوا۔ بغیر سوچے سمجھے اور منزل متعین کیئے ہوئے ایک سمت کو بھاگتا ہوا چلتا گیا۔ شیخ چلی کی طرح خیالی پلاؤ پکاتا ہوا کسی مرد خدا رسیدہ کی دعائیں حاصل کرنے کے لیئے کسی بہت بڑے مہربان قسم کے امیر کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے منصوبے بناتا ہوا اور کبھی بمبئی والے حاجی قاسم کی طرح دیا سلائی بیچنے کی مہم سے از سر نو زندگی شروع کرنے کی سکیمیں بناتا ہوا اپنے دیس اور وطن کی حدود سے دور، بہت دور چلا گیا۔ تاکہ خود غرض اور کینہ دوز عزیزوں کی دسترس سے محفوظ ہو جائے۔ ایک اجنبی دیس، اجنبی قبیلے کے علاقائی

سرزمین میں داخل ہوگیا۔ اپنے چوٹ کھائے ہوئے زخمی دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ایک دیس میں پہنچ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ قدرت نے مہربان ہوکر اسے ایک ارضی جنت میں پہنچا ہی دیا۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ زندگی کے حقائق سے گریز کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کے ظالمانہ قوانین سے فرار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان قوانین کو قوانین کی حد میں رہ کر بدلانے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ وہ قوانین جو بقول سولن، جال عنکبوت ہوتے ہیں۔ کمزور کو پھانس لیتے ہیں۔ اور طاقتور سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اب اسے معلوم ہوگیا کہ پرائے دیس میں انسان کس قدر مشتبہ اور مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اور ذات کتنی پیہودہ قیاس آرائیوں کی مرکز بن جاتی ہے۔ اس کے خلوص اور عقیدت کا کیسے کیسے مذاق اڑایا جاتا ہے کوئی اسے جاسوس سمجھے کوئی سیاسی ایجنٹ وغیرہ وغیرہ اس نے سوچا کہ جب اپنے ہی ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کی یہ حالت ہے تو خدا جانے غیر ملک میں جانے کی کیا سزا ہوگی۔ خواہ وہ ملک سعودی عرب یا شہر مکہ شریف ہی کیوں نہ ہو۔ سب اسے یاد آئے کسی شاعر کے وہ اشعار ؎

پرائے دیس کی راہوں میں کس نے پایا ہے
سکون دل کا خزانہ متاع دل کی مُراد
پرائے دیس میں کب اجنبی ہوئے آباد

تو یہ ہوتی ہے پرائے دیس میں آباد ہونے کی سزا کہ کوئی اسے مسلمان کہے، کوئی کافر، اور کوئی کہے کہ خطرناک ڈاکو ہے۔ ہمارے دولت کی شہرت سن کر آیا ہے۔ موقع ملے تو سب اٹھا کر بھاگ جائے گا۔ کسی نے فرمایا کہ اب یہ ہمارے سردار سے اپنے لیئے نوکری مانگے گا تو ہمارے دیس کی ایک دیکنسی ضائع ہو جائیگی

اب تو وہ حیران ہو گیا۔ کہ کیا کرے۔ شریف بنتا ہے تو مشتبہ ہو جاتا ہے لہٰذا یہی بہتر ہے کہ اپنی سطح کو پست سے پست کر دے۔ تاکہ یہ لوگ اب اسے درگزر ہی کر دیں۔ اب اسے معلوم ہوا کہ خوش فہمیوں کے نتائج کیا ہوتے ہیں علاقائی تعصب اور قبیلوی حسد انسان اور انسان کے مابین دیوار چین بن چکا ہے۔ اور اس دنیا میں کچھ روشن ضمیر اور نیک دل بھی تو تھے جنہوں نے کہا کہ بھئی چھوڑ دو۔ یہ انسان ہے اور کچھ بھی نہیں۔ قسمت کا مارا گردش زمانہ کے مظالم کا ستایا ہوا ایک انسان ہے۔ اور بقول کسی شاعر ؎

جہاں پناہ مجھے بازوؤں میں لے لیجئے
میری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ انسان اپنے ہم جنس انسانوں کے مظالم سے بچنے کے لیے بھی اپنے ہم جنس انسانوں کے ہاں جاتا ہے۔ خدا بھلا کرے اس علاقے کے روشن ضمیر اور شریف النسب سردار کا، کہ اس نے ان لوگوں کے کہنے میں آکر غریب الوطن اس خانماں سوز شکاری کو دیس سے نکلنے کو نہ کہا۔ مسافر شکاری نے محسوس کیا کہ تجربات کے بغیر زندگی نہیں نکھرتی۔ تجربے کے بغیر ہر علم بیکار ہے۔ انسان غریب الوطن ہو کر اور بھی مظلوم ہو جاتا ہے۔ طارق نے کنارہ اندلس پر کھڑے ہو کر ہر ملک ملک ماست کا نعرہ بلند کیا تھا۔ لیکن بارہ ہزار جرار لشکر اس کے ساتھ تھا اور اگر آج کے دور میں طارق زندہ ہوتا۔ یکہ و تنہا بغیر زور مال کے ہمارے ملک میں کہیں سے آجائے تو شاید اس قسم کا جیدری نعرہ لگانے سے پہلے کچھ دیر سوچ بچار کرنے پر مجبور ہو جائے مسافری میں کوئی شخص ہزار شریف اور بے ازار بن جائے۔ لیکن حاسدوں کے حسد سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اب اس غریب الوطن شکاری کو دس سال پہلے کا وہ زمانہ اور جنگل میں اس سراسیمہ اور متوحش ہرن کا وہ واقعہ یاد آیا۔ اور اس تجربہ کار

شکاری کے وہ الفاظ بھی اسے یاد آئے۔

دنیا میں رہتے ہو تو پختہ کار شکاری بنو، شکار بجائے خود کو ایک علم ہے اس علم کو سیکھو، اس پر عمل کرو۔ یاد رہے کہ یہ دنیا ایک وسیع شکار گاہ ہے ہم سب انسان شکاری بھی ہیں، اور شکار بھی۔ اپنے اپنے بساط کی بات ہوتی ہے، زد میں آتے ہوئے شکار کو وہی درگذر کرتے ہیں جو تجربہ کار نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ خود کسی دن تجربہ کار شکاری کی زد میں آ جاتے ہیں۔ پھر اپنے لیے شاید ہی وہ رحم حاصل کر سکیں۔ یا ان پہ رحم کیا جائے۔ کچھ اس قسم کے احساسات دل میں سما گئے اس شکاری کے جو کہ اب صید زبوں ہی کہلانے کا مستحق آخر کار ہو ہی گیا۔ پھر ماحول نے اس کے لیے ایک گرم اور تپتے ہوئے بھٹی کی شکل اختیار کی۔ بس سرخ اور گرم اینٹوں سے سر پھوڑنا ہی اس کا پسندیدہ شغل ہو گیا ہے

بہلانہ دل نہ تیر گئے شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا، نہ گھر کو میں
(فانی خان)

لکھنے اور پڑھنے کا ذوق بھی جاتا رہا۔ اس لیے کہ جب ذرائع ہی نہ ہوں تو پھر یہ ذوق کیسے جاری رہ سکتا ہے۔ بس زندگی کے دن گذارنا ہی مقصود خاطر رہ گیا۔ جب کسی باشعور انسان کی زندگی محض تن کی پرورش تک محدود ہو جائے۔ مقصدیت اور افادیت کی توانائی کھو دے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ نامرادی کا، ڈیپریشن کا احساس اور موت کا

انتظار اس لیئے کہ ؎

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

اور جب آشیانہ ہی نہ ہو تو ایک آوارہ بلبل کی وقعت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اور جب کسی کی شخصیت میں بے شرمی۔ بے حیائی اور چرب زبانی جیسے قابل فخر اوصاف نہ ہوں تو محض کسی ایک آدھ صلاحیت کے بل بوتے تو اپنے لیے روزی پیدا کرنا بھی غنیمت ہوتا ہے۔ ہماری مثال ان پودوں کی نہیں جنہیں کسی ہمدرد مالی کی پرورش و نگہداشت میسر ہو۔ ہم تو مقبروں میں اگنے والے خودرو نرگس یا کسی صحرا میں اگنے والے گل لالہ سے مشابہ ہیں۔ کچھ محکمۂ تعلیم میں سمانے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں بھی دال نہ گلی۔ چپ اور خاموش ہو گیا۔ غریب انسان کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ خدمت کرے تو بے ثواب عبادت ہوتی ہے۔ جو کہ منظور ہی نہیں ہوتی۔ عقیدت کا اظہار کرے تو جواب ملتا ہے کہ معتقدین کی کمی نہیں ہے۔ تمہاری عقیدت کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

تو یہ ہے اس صید زبوں کی کہانی جسے لوگ محمد آصف کہتے ہیں۔ کچھ نسلی شریف، طبع لوگ اسے آصف خاں بھی کہتے ہیں۔ اور بعض فرعون مزاج قسم کے نخوت پسند اسے صرف آصف بھی کہتے ہیں۔ اس عہد کے ایک فولادی انسان اور جری دل شہر بانیئے ریاست سوات بادشاہ صاحب کا سیرت نگار جس کی قلمی اور دماغی کوششوں کا نتیجہ اس کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ میں خوش ہوں کہ مجھے یہ شرف حاصل ہوا۔ میں بادشاہ صاحب کی ملنساری اور خوش خلقی کا قائل ہوں۔ خوشی صرف ایک بات کی ہے کہ میرے حسب بساط صلاحیتوں سے آخر کچھ تو کام لیا گیا یا کسی کے کام آ ہی گئیں۔

یقیناً میں ان افراد کا بھی مشکور ہوں کہ جنہوں نے از راہ کرم اس کام کے لیے مجھے متعارف کرایا اور اس کام کے سلسلے میں تو کم از کم میری صلاحیتوں پر بھروسہ کیا گیا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اقتصادی لحاظ سے میں آسودہ حال انسانوں کے شمار میں نہیں آسکتا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کے آخیر میں اپنی مشکلات یا غربت کا رونا رونے کے باوجود میں نے اس کتاب کو ٹھوس حقائق کا "مجموعہ" بنانے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہونے نہیں دیا۔ اور یہ کوشش کی ہے کہ بادشاہ صاحب کے حسب الحکم کسی قسم کی مبالغہ آرائی درمیان میں نہ آئے۔ اس لیے کہ مبالغے کی کوئی ضرورت ہی درمیان میں نہیں ہے۔ ایک مصنف اور دیانت دار ضمیر رکھنے کیلئے میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ صاحب ضمیر، صاحب حیثیت بھی ہو۔ اگرچہ موجودہ صنعتی عہد میں عام طور سے یہی سوچا جاتا ہے لیکن عموماً ہوتا اس کے برعکس ہے

جہاں تک مجھے موقع ملا ہے میں نے بحیثیت سیرت نگار کے بادشاہ صاحب کی سیرت اور کردار کے ہر پہلو سے واقف ہونے کی کوشش کی ہے۔ اور ہر وصف سے متعلق معلومات کو پایۂ تحقیق تک پہنچانے کے بعد سپرد قلم کر چکا ہوں۔

اس کتاب میں جا بجا "اگر اخلاقیات اور کردار کے متعلق" میں نے تنقیدی لہجہ بھی اختیار کیا ہے۔ تو اس کا مطلب کسی خاص فرد سے نہیں ہے۔ بلکہ بحیثیت مجموعی ہمارے سارے ملک یعنی ماحول میں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور قحط الرجال کا دور ہے۔ بڑے بڑے عالم اور مذہبی علوم کے ماہر قسم کے افراد بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ اپنے آپ اور اپنے ضمیر کی اصلاح کرنے سے قاصر ہیں۔

ہمارے ماحول میں آج کل کے زمانے میں علمیت اور کردار کو بھی خوبصورت اور گراں بہا ملبوسات میں تلاش کرنے کی ناممکن سعی جاری ہے۔ مفلوک الحال افراد کے

ساتھ حقارت سے پیش آنا ایک فیشن کی صورت اختیار کر چکا ہے محض بحیثیت انسان کسی سے اپنے لیے خاطر تواضع یا خوش اخلاقی کی توقع ایک حماقت ہے۔ اور اس حمام میں ہم نے ان کو بھی ننگا ہی پایا ہے کہ جو بڑے مشہور قسم کے اہل قلم فاضل ہوتے ہیں۔ اور ان کے نام سے پہلے کبھی کبھی علامہ کا لفظ بھی چپکا ہوا پڑھنے میں نظر آجاتا ہے۔

لیکن بانیئے ریاست سوات کی عظیم شخصیت اور کردار کو میں نے اس قسم کی ہر برائی سے پاک ہی پایا ہے۔ اس لیے میں موصوف کی خوش خلقی اور عظمت کا بہت زیادہ قائل اور مداح ہوں۔

اور یہ بادشاہ صاحب کی تابناک شخصیت ہے جس کی ضیا سے یہ ساری ریاست تابناک ہوئی جا رہی ہے۔ یہ بادشاہ صاحب کی مخلصانہ جد و جہد کے نتائج ہی تو ہیں کہ ہر ایک کو اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کے موقعے فراہم ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس ضمن میں دو چار گنتی کے افراد میرے ساتھ متفق نہ بھی ہوں تو اس کے متعلق میں صرف اتنا کہوں گا کہ اس بحث میں الجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انسانی ذہن اب اس قدر چالاک اور منطقی ہو چکا ہے کہ ہر اثبات کے لیے نفی کے اور ہر نفی کے لیے اثبات کے دلائل فراہم کر سکتا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت میرے ساتھ اس پر متفق ہے کہ بادشاہ صاحب اس ریاست اور اس قوم کے محسن ہیں۔ صاحب سوات کا خاندان اس دیس کے لیے ایک سایۂ رحمت ثابت ہو چکا ہے۔ اور بانیئے سوات فی الواقعہ عظیم انسانوں میں سے ہیں۔ میں نے بادشاہ صاحب کی شخصی عظمت اور کردار کی جو تعریف و توصیف کی ہے یقیناً میرے خیال میں موصوف اس کے مستحق ہیں۔ یہاں پر میں یہ بھی عرض کر دوں گا کہ اس تقریری مہم میں عظمت کردار کا تجزیہ کرتے وقت اردگرد کے حالات لوگوں کی ذہنی حالت اور عام کردار اور نیز صاحب حیثیت ہم عصر افراد کی ذہنیتوں اور کردار سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ

ہمارے ماحول میں صاحب کردار افراد کی اکثریت تو کجا بلکہ بہت بڑی کمی ہے۔ عام تعلیم یافتہ قسم کے افراد کے کردار میں حقیقت سے زیادہ نمائش ہوتی ہے۔ ہر شخص صرف قوت زبان سے دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب منافقت یا ریاکاری اتنی عام ہو چکی ہے کہ دوست اور دشمن، خیر خواہ اور بد خواہ میں تمیز کرنا ہی مشکل ہو چکا ہے۔ ہر شخص کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ سامنے ہو تو آپ کی تعریف کرے گا۔ آپ کے حق میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گا۔ لیکن جونہی اس کو موقع ملے پس پشت وہی مہربان آپ کو ملامتیاں سناتا پھرے گا۔ اس لیے نہیں کہ آپ نے اس کو کوئی نقصان پہنچایا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ بے چارہ ذہنیت سے مجبور ہے۔

اس کے سینے میں وہ ظرف ہی نہیں ہے کہ جو دوسرے کو اچھا کہنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا آج کا عہد سراسر جوڑ توڑ ریاکاری اور منافقت کا دور ہے۔ آج ذہنوں کی یہ حالت ہے کہ اچھائی کو ہرگز ہرگز برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آپ کسی جگہ بھی اپنے دو چار واقف کاروں کی محفل میں بیٹھ جائیں۔ فرض کیجیے کہ وہ محفل حسب ذیل افراد پر مشتمل ہے۔ ایک لحیم و شحیم تسم کا قاضی ہے۔ ایک دبلا پتلا سکول ماسٹر ہے اور ایک متوسط الحال قسم کا مولوی صاحب ہے۔ دو پتلون پوش انگریزی خواندہ جنٹلمین ہیں۔ لیکن جونہی کہ آپ ان کی محفل سے اٹھ گئے یہ سب متفق اور یک زبان ہو کر آپ کی غیبت شروع کر دیں گے۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ توقع نہ رکھیے کہ وہ آپ کو معاف کر دے گا۔ اور آپ کے حق میں خاموش ہو جائے گا۔ ٹکے ٹکے کو ایمان بکتے ہیں۔ کسی سے بھی خلوص اور صداقت کی توقع فضول ہے۔ ہر شخص ظالم اور سنگدل ہے۔ جب اسے چوٹ پہنچتی ہے تو انصاف کی دہائیاں دیتا پھرتا ہے۔ لیکن جب اس کے منصف بننے کا موقع آتا ہے تو انصاف کا خون چوس جاتا ہے۔ دوسروں سے ہر کوئی یہ توقعات

رکھتا ہے۔ کہ وہ اپنی دولت لٹائیں، رحم دل بنیں لیکن خود اپنی حتے المقدور حیثیت سے کسی ذی روح کو مستفیض ہونے نہیں دیتا۔ میں ایک بار پھر عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ ہمارے ملک میں ادیب، شاعر، مصنف، مفکر، دانشور، پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں کبھی کبھی مجدد اور نبی پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کام کرنے والے یعنی کردار کے غازی بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سراسر نمائشی اور لباسی دور ہے۔ قول اور وعدے کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ ہر طاقت ور کمزور کا گوشت مزے لے لے کر کھاتا ہے ہم نمازیں پڑھتے ہیں ہم روزے رکھتے ہیں۔ ہم حج کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے ہم جنسوں یعنی بنی نوع انسان کی بھلائی کے متعلق قطعاً نہیں سوچتے اور نہ ہی یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بھی کچھ فرائض بحیثیت انسان کے ہیں۔ ہر معاملے اور ہر کام، ہر اصلاح کی ذمہ داری حکومتوں پر تھوپتے ہیں۔ تو یہ ہے ہمارے ماحول کی حالت ایک دفعہ میرے سامنے ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا، یار یہ "گلاب دیوی ہسپتال" کا کیا مطلب ہے۔ دوسرے نے جواب دیا ایک ہندو عورت گلاب دیوی نے ذاتی صرفے سے یہ ہسپتال بنوایا ہے۔ پہلے نے سوال کیا کہ یہ کیوں دوسرے نے کہا بیوقوف تھی۔ اپنا پیسہ خراب کر گئی۔ اور یہ ہے ہمارے سوچنے کا ڈھنگ اور ہماری ذہنیت اس کے باوجود ہم مدعی ہیں کہ جنت پر بھی قبضہ ہمارا ہی ہوگا۔ لہٰذا ان حالات میں اگر کوئی روشن ضمیر انسان صرف ان مذکورہ برائیوں اور صاف سے بھی پاک رہے تو یقیناً اس کی شخصیت قابل ستائش ہے۔ عظمت کردار کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی کی بھی ذاتیات سے ہمارا تعلق نہیں ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ کوئی شخص اپنے ہم جنسوں کے حق میں کتنا مفید اور کس قدر ضرر رساں ہے۔ موجودہ وقت میں ہمارے ماحول میں نیکی اور بدی کا مفہوم ہی کچھ الٹا ہے۔

بانیٔ ریاست سوات کی مضبوط شخصیت اور مضبوط کردار کا یہ عالم ہے کہ زمانہ بدل گیا، حالات بدل گئے، ذہن تبدیل ہوئے اخلاقیات کے طریقے تبدیل ہوئے۔ غرضیکہ ہزاروں تبدیلیاں آگئیں۔ لیکن یہ سب تبدیلیاں بادشاہ صاحب کے مستقل مزاج اور مضبوط شخصیت پر اثر انداز نہ ہوسکیں ان کی صورت ایک مستحکم اور چٹان جیسی ہے۔ ابتدا سے ہی انہوں نے اپنے لیے جو اصول وضع کیے ہیں اور جو پروگرام اپنا چکے ہیں بس اسی پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ ان کی ہستی اگر ایک طرف سے مؤمنانہ اوصاف کی آئینہ دار ہے۔ تو دوسری طرف سے قابلِ فخر افغانی روایات کا ایک آئینہ بھی ہے۔ مخلص، غیور، شجاع، وفادار، مہمان نواز، قول کے پکے، ماتحت پرور، دوستوں کے دوست انسان ہیں۔ ماحول کی تاریکی قطعاً ان کے نورانی کردار کو متاثر نہیں کرسکتی۔

زمانہ سازی ان کا شیوہ نہیں ہے۔ کبھی جوان تھے تو زمانہ ستیز کے قائل تھے زمانے کی مخالف ہوائیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ دوست اور دشمن دونوں اس کے مضبوط کردار، اور فولادی شخصیت کے معترف ہیں۔ غریب سے غریب شخص کو اگر چالیس سال پہلے دوست کے نام سے پکارا ہے تو آج بھی اسی طرح اس کے دوست ہیں جیسے کہ چالیس سال اول تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ

"اس دوران میں خود اس غریب کی دوستی کئی رنگ بدلتی گئی۔ ورنہ بادشاہ صاحب کے خلوص میں فرق نہیں آسکتا۔"

ہم اور ہمارے ماحول میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ہم ہمیشہ نظروں سے اوجھل افراد کی پرستش کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم کچھ مردہ پرست جیسے واقع

ہوئے ہیں۔

"تو یہ ہیں ہمارے بادشاہ صاحب ایک روشن ضمیر پاک باطن اور لاکھوں افراد کا محسن، ایک عظیم درویش صفت انسان؟

معذرت

اس کتاب میں جا بجا یا اس حرف آخر کے سلسلے میں اگر میرے قلم سے تنقیدانہ رنگ میں کچھ ترش قسم کے جملے سرزد ہوئے ہیں تو اس کا مطلب کسی کی تحقیر یا برائی بیان کرنا نہیں۔ بحیثیت مجموعی ماحول سے مراد صرف سوات نہیں بلکہ ہمارا ملک ہے۔ بایں ہمہ اگر کسی کو ناگوار گزرے تو میں اس قسم کے سب افراد سے معذرت چاہتا ہوں۔ میرا مقصود خاطر یہ قطعاً نہیں کہ گویا میں اپنے اس پیدائشی ماحول اور علاقے کو سوات پر فوقیت دینا چاہتا ہوں۔ بلکہ اس کے متعلق تو میرے احساسات بہت زیادہ تلخ ہیں۔ اس لیے کہ ہم لوگ تو فرنگی راج کے کچلائے ہوئے ہیں۔ اور پھر صنعتی فضا کے اثرات کی زد میں بھی آئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے متعلق تو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ سوات تو آزاد قبائلی اور اسلامی ماحول ہے لہٰذا یہاں پر خلوص کی بہتات ہونی چاہیئے۔ شہری اور صنعتی فضاؤں سے دور بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان اس جنت نظیر دیس میں خلوص اور یگانگت کا دور دورہ ہونا چاہیئے۔ اس پر فضا ماحول میں اگر وہ تمام اوصاف نہ ہوں جو کہ صنعتی فضاؤں میں بسنے والے انسان کو بدصورت بنا چکی ہیں۔ تو یہ سونے پر سہاگہ ہوگا۔ تاکہ خوبصورت مناظر کا یہ دیس اپنی قابل تعریف قیادت کی طرح ہر لحاظ سے قابل تعریف ہو۔ یہ خلوص اور محبت

کا ایک پاکیزہ چشمہ ہو۔

سوات کو وقت کی مہلت سے یہ فائدے بھی حاصل کرنے چاہئیں۔ میری دعا ہے کہ خداوند کریم کی لاکھ لاکھ رحمتیں اس خوبصورت سرزمین پر نازل ہوں اس میں بسنے والے لاکھوں افراد فراغت اور سکون کی دولت سے مالا مال ہوں۔ اور رب العالمین سوات کی بے پناہ فراوانی بخش دے تاکہ مجھ جیسے مفلوک الحال مسافروں کو دیکھ کر سوات کی خوبصورت جبین پر شکن در شکن شکنیں نہ ابھریں۔ آمین۔

اس باغ و بہار وطن میں بڑے شریف، خوش اخلاق، ملنسار، اور وسیع ظرف افراد بھی بہت ہیں۔ ہر چند کہ میں اپنے ذہن کو داد و دہش کی توقعات سے خالی کر چکا ہوں۔ لیکن ایسے ہی مذکورہ قسم کے نیک دل اور حقیقت شناس افراد کے ظرف کرم سے ناامید بھی نہیں ہوں۔ کہ میری دماغی جد و جہد اور قلمی کوششوں کے اس مظہر مجموعے کو جہاں تک کہ یہ حقدار ہو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ قطع نظر اس امر کے کہ اس کے لکھنے والا ایک غریب الوطن تلمکار ہے مجھے اعتراف ہے کہ زندگی میں ہر سمجھ دار اور باشعور انسان کو زندگی بنانے کا ایک موقع قدرت کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ یہ موقع مجھے بھی دیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت جبکہ شعوری لحاظ سے میں بالغ نہیں تھا۔ اور یہ سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا کہ دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھنے کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ بہر صورت جو کچھ بھی تھا کچھ ماحول کا اثر کچھ رنگین مزاجی کی وجہ، کچھ پرورش اور تربیت کی خامیاں، صحبتِ یاراں کی عنایات، خود غرض اور مطلب پرست دوستوں کی مہربانیاں، حاسد اور حریص عزیزوں کے مظالم، طبیعت میں ضرورت سے زیادہ خلوص اور سادگی، ان سب نے مل کر مجھے افلاس کی عمیق ترین گہرائیوں کی طرف دھکیل دیا۔ اور اب اس تاریک کنوئیں میں پڑا ہوا اس چیز کو کوس رہا ہوں جس کو دنیا والے مقدر

کہتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ انسانی زندگی میں مقدر کا دخل کہاں تک ہے لیکن انسان کبھی کبھی اس قسم کی تاویلات کے سائے میں بھی پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے ساحل کے تماشائی سمندر میں ڈوبنے والے کی مشکلات اور بے بسی کا اندازہ نہیں لگا سکتے وہ تو یہی چلاتے ہیں کہ شاباش، کوشش کرو، ہمت کرو، ہاتھ پاؤں ہلاؤ، یہ کرو، وہ کرو، لیکن ان تماشائیوں میں اس قسم کا کوئی تیراک شیر دل، جوان مرد شاذ و نادر ہی پیدا ہوتا ہے کہ بجائے چیخنے چلانے کے فوراً کود کر اسے گرداب سے نکالدے زندگی میں کچھ لمحے مسرت اور شادمانی کے بھی آئے تھے۔ کہ جن کی یاد ہی اب زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔ کبھی کبھی تو بعض لوگوں کی قیاس آرائیوں سے بہت ہی دکھ ہوتا ہے۔ میر کے وہ اشعار یاد آجاتے ہیں ؎

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش دروں سے جلتا ہے جوں چراغ
ہے نام مجلسوں میں میرا میر بید ماغ

میں ان لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا کہ وہ جب اپنے وطن یعنی اپنے ماحول میں ہوتے ہیں تو وہاں آپ کو اپنے وطن اور ماحول سے شکوہ کناں ملیں گے۔ اجی کچھ نہیں "ہمارا یہ وطن" یہ نقص ہے، وہ نقص ہے وغیرہ وغیرہ شکایت کریں گے لیکن جونہی کہ ایسے افراد اپنے وطن سے نکل کسی دوسرے ماحول میں بستے ہیں تو پھر فوراً اپنے ماحول کو یاد کرتے ہیں۔ اس کی تعریفیں کرتے ہیں۔ اور جہاں رہتے ہیں اس ماحول کو کوستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سارے ماحول میں بسنے والوں کی یہ فطرت ہے۔ کہ خود اپنا محاسبہ نہیں کرتے۔ دوسرے ماحول کی مثال آئینے کی ہوتی ہے۔ کہ جس میں وہ اپنے ہی ماحول کا عکس دیکھتا ہے۔ جب اسے بدنما اور بھیانک دیکھتا ہے تو پھر شکوے شروع کر دیتا ہے۔

ہم سب کی ذہنیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اپنی چیز بُری ہو تو بھی اسے اچھی کہتے ہیں اور دوسرے کی اچھی ہو تو اسے بھی بُرا کہتے ہیں۔ پشتو کے مشہور صوفی شاعر عبدالرحمٰن نے کہا تھا کہ انصاف کا ترازو اگر کوئی تمہارے ہاتھ کو سونپ دے، تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے گدھے کو دوسروں کے گھوڑے کے مساوی ہی تولو گے اس لیے مناسب یہی ہے کہ اب ہم حقیقت پرستی کو اپنا شعار بنالیں۔ باتیں کرنا یا باتیں بنانا کوئی خاص انسانی کمال نہیں ہے۔ لہٰذا اس پر اترانا بھی نہیں چاہیئے۔

ریاست سوات کی نیک شہرت اور نیک نامی کو برقرار رکھنے کا احساس ہر کاروباری شہری میں ہونا چاہیئے۔ اس شخص کی طرح نہیں ہونا چاہیئے کہ باپ دادا کی کمائی فضولیات میں ضائع کرتا پھرا۔ لہٰذا یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ حکومت اور بادشاہ صاحب نے اپنی بلند کرداری سے سوات کے لیے جو نیک نامی حاصل کی ہے یا موجودہ وقت میں حاصل کی جارہی ہے۔ یہ قیمتی اثاثہ محض کاروباری شخصی مفاد کی خاطر ضائع کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ حصول دولت کی خواہشوں کو اپنے وطن اور علاقائی شہرت اور نیک نامی پر ترجیح دینا آزاد اور غیور قوموں کا شیوہ نہیں ہوتا۔

۱۰۔ یہاں پر میں پھر وضاحت کروں گا کہ گذشتہ صفحات میں اس تصنیفی کام کے سلسلے میں میں نے اپنی جن مشکلات کا اظہار کیا ہے تو اس سے مدعا کسی کی شکایت یا ناشکری کا اظہار نہیں صرف میرا مطلب یہ ہے کہ یہ جھنجھٹیں، دماغی سکون اور قلبی آرام کی راہ میں مائل نہیں اور اس قسم کی قلبی اور دماغی محنت کے لیے دماغی سکون اور قلبی آرام کی از حد ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ایک پڑھے لکھے انسان کی حیثیت سے تو میرے لیے یہ کام نسبتاً بہت زیادہ بہتر اور آرام دہ ہے۔ جبکہ اس سے پیشتر میں سوات میں جسمانی مشقت کی مزدوری ہتوانڈہ چار سال کرتا رہا اس لیے خود میری

ذات کے لیے تو یہ قلمی محنت غنیمت تھی۔ میں نے جو کچھ بھی عرض کیا ہے اس تاریخی اور سوانحی مجموعے کی اہمیت کے پیش نظر کیا ہے۔ لہٰذا اس سے کوئی الٹا مطلب اخذ کرنا میرے خلوص اور صداقت کے ساتھ بے انصافی اور زیادتی ہوگی۔

حزر زآہ نظیری کہ خانماں سوز است
مبادا ایں خس سوزاں بدست باد افتد
(نظیری)

۱۱۔ بادشاہ صاحب کی سیرت نگار کی حیثیت سے میں نے کوشش کی ہے کہ ان کی سیرت کے ہر پہلو سے واقف ہو جاؤں۔ بلاشبہ میں نے موصوف کو ایک مضبوط، فولادی کردار، اور غیر معمولی سا دل و دماغ رکھنے والا قابل ستائش شخصیت رکھنے والا پایا ہے۔ ان کے تجربات سے بھرپور ہستی بجائے خود ایک مکتب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی ہم نشینی، اور مختصر وقفے کی مجلسیں، غنائم زمانہ میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قدرت کی طرف سے انسان کو غیر معمولی قوتیں ودیعت ہوتی ہیں۔

انسانوں کے گروہ میں اس قسم کے انسان کہ جن کے ارادے مضبوط ہوتے ہیں، اپنی صلاحیتوں کو بہت آگے حد تک بڑھا سکتے ہیں۔ مسلسل عبادت اور ریاضت اور تزکیۂ نفس سے انسان میں ایک ایسی قوت بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ جسے روحانی قوت کہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں بعض میٹرک پاس قسم کے وہ لوگ جو اسلامی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ دین اسلام کے متعلق صحیح معلومات سے عاری ہوتے ہیں۔ البتہ اخبارات اور ادھر ادھر کے رسائل کے مطالعے سے چرب زبانی کی قوت ان میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ لوگ ان تمام قوتوں سے انکار کرتے

ہیں۔ حالانکہ خود مغربی مفکرین اور فلاسفر بھی اس حد تک متفق ہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو بہت آگے حد تک نشو و نما دے سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دوسروں سے منفرد ہو جاتا ہے۔

ریاست سوات کے کسی بھی شہری سے لیئے یقیناً بادشاہ صاحب کے متعلق اس کے خیالات اور جذبات آپ یہی پائیں گے جو کچھ کہ میں نے بیان کیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ

> ہم لوگ جاگیردارانہ دور سے نکل کر اب صنعتی قسم کے سرمایہ دارانہ دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ سراسر مصنوعی دور ہے۔ اس دور میں منافقت اور خود غرضی جیسے اوصاف پر لوگ فخر کرتے ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کی تکلیف قطعاً گوارہ نہیں کرتے اور آج کے دور میں کسی ملازم پیشہ ان پڑھ قسم کے انسان سے لیئے تو آپ اس کی چرب زبانی پر حیران رہ جائیں گے۔

گذشتہ چھ آٹھ مہینے سے یہ ایک اتفاق پیش آیا ہے کہ ہر روز تقریباً ایک ان پڑھ یا نیم خواندہ قسم کے صاحب کے ساتھ میں ملتا ہوں۔ اور تقریباً نصف میل تک سیر کے لیے شام کو ہمراہ جاتا ہوں۔ لیکن ان آٹھ مہینوں میں اس نے کبھی مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ہمیشہ بس اپنی ہی سناتا ہے۔ غرضیکہ جس کسی سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے بجائے اس کے کہ وہ مجھے کچھ سنانے کی فرمائش کرے خود ہی سنانے شروع ہو جاتا ہے بغیر کسی تمہید اور موضوع کے بس وہ اپنی قابلیت جتلانے کا مظاہرہ شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ ان میں کسی قسم کی قابلیت ہوتی ہی نہیں۔ لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ

کہ یہ دورِ جہاد بالسان کا دور ہے۔ اس دور میں ہر کوئی گفتار کا غازی ہے۔ کردار کے غازی بہت کم ملتے ہیں۔ صحیح معنوں میں بے ریا اور پاک باطن افراد اگر موجودہ دور میں ملیں تو یقیناً ان کے ہاتھ چومنے کے لائق ہوتے ہیں۔ اور ہر احترام کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس قسم کے افراد خال خال ہی ملیں گے۔

اکثریت ریاکاری اور تصنع کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ اور اسی کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ باشعور اور منصف مزاج قسم کے افراد یقیناً قابل ستائش ہوتے ہیں۔ جو کہ موجودہ دور میں اپنے کردار کو اس قسم کی آلودگیوں سے بھی بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ

ہمارے قول و فعل کا یہ تضاد ختم ہو جائے اور بانیٔ ریاست سوات[۲۲] کے کردار سے یہ بھی سبق حاصل کریں۔

بادشاہ صاحب کے اخلاق اور سیرت کے سلسلے میں ان کی ایک اور عادت کا ذکر کرنا میں بھول گیا ہوں۔ اور وہ ہے

عید کی دعوت

زمانۂ حکمرانی سے بادشاہ صاحب کا یہ اصول ہے کہ

ہر عید کی تقریب پر دو دن متواتر خصوصی کھانا کھلاتے ہیں۔ عید کے دوسرے دن ریاست کے سرکاری عہدیداروں اور افسروں کو جن کا تعلق خطۂ بابوزئی

سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ عمال اور حکام جو کہ ریاستی
صدر مقام سیدو شریف سے متعلق ہوتے ہیں۔
کی دعوت بادشاہ صاحب کے رہائشی محل میں
ہوتی ہے۔

اور عید کے تیسرے روز خطۂ بابوزئی کے معززین
اور خواتین کو جن میں تجارت پیشہ طبقے کے معزز
افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ کو دوپہر کا خصوصی کھانا
شاہی محل میں کھلایا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ ان سب کو گھروں سے لانے اور گھروں تک پہنچانے کا بندوبست بادشاہ صاحب کی طرف سے ہوتا ہے۔ لاریوں اور موٹروں میں سب کو پہنچایا جاتا ہے۔ جب کسی کام کے لیے ریاست کے کسی بھی معززشخص کے فرد کو بادشاہ صاحب کبھی طلب کرتے ہیں۔ تو پھر اس کو بھی واپس موٹر یا جیپ میں اپنی جائے مسکونہ پر پہنچاتے ہیں۔ یہ عادت بادشاہ صاحب کی اوائل حکومت کے عہد ہی سے چلی آرہی ہے۔ اس کے علاوہ جب بھی کوئی ملاقاتی ملاقات کے لیے آتا ہے تو بادشاہ صاحب اسے نہایت خلوص سے ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز دوپہر کے کھانے پہ مہمان شامل ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن خالی گزرے۔ مہمان نوازی، بادشاہ صاحب کے کردار کا خاص وصف ہے۔

اب میں اس کتاب کو حکیم مشرق کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں اور خداوند کریم سے دعا کرتا ہوں کہ

اللہ پاک عہد حاضر کے اس عظیم انسان اور بڑی دل

شیر کو عمرِ خضر نصیب کرے۔ اور خدائے پاک کی لاکھ لاکھ رحمتیں ریاست سوات کی خوبصورت سرزمین اور اس میں بسنے والے تمام افراد پر نازل ہوا کریں۔
(آمین)

بعشوہ ہائے جوانان ماہ سیما چیست
در آ بحلقۂ پیرے کہ دلبری داند
(اقبال)

(محمد اصف خان)

تمام شد

تصحیح نامہ

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۹		۔58A چھپنے سے رہ گیا ہے	۔58A "صاحب سوانح" از مولانا اسمٰعیل ندوی
۹		حصّہ اول میں	حصّہ اوّل کے
۱۹	چوتھی سطر	واوئی سوات وہ	واوئی سوات کو وہ۔
۲۳	گیارھویں سطر	حکمران کی ذات قابل صد ستائش۔	حکمران کی ذات اور بھی قابل صد ستائش واحترام ہو جاتی ہے۔
۲۳	سترھویں سطر	فرائض کی بجا آوری پر مجبور"	فرائض کی بجا آوری پر مجبور ہو جاتا ہے۔
۳۰		جبیں پہ کاتب تاریخ کی جلی تقدیر	جبیں پہ کاتب تاریخ کی جلی تقدیر
۴۴		مداد تو یہی ہے،	مداد تو یہی۔
۵۱		پوزیشن"	پوزیشن۔
۵۲		زین خان لوکد۔	زین خان کوکہ۔
۵۲		اکبر اعظم کو دیکھا۔	اکبر اعظم کو لکھا۔
۵۳		حکیم سے بہتر	حکیم سے بالاتر۔
۵۴		راجہ ٹوڈرمل اور بازید کے غلا۔	راجہ ٹوڈرمل اور بازید کے خلاف
۵۹		سلسلہ نشر۔	سلسلۂ نشر۔
۶۳		نیا ازم	بنیا ازم۔
۷۰	دوسرا شعر	بایں فساد	بایں فصاحت

صفحہ نمبر و سطر نمبر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۸۸ پہلا شعر	گریز از صفت۔	گریز از صفِ ما۔
۹۱ آخیر تیسری سطر	اگر چہ فوج۔	انگریزی فوج۔
۹۲ اوّل تیسری سطر	علاقائی ناموں"	علاقائی ناموس۔
۹۹ آخری سطر	برگزید۔	برگزیدہ۔
۱۰۰	المعروف ھڈے ملا صاحب۔	المعروف ھڈے ملا صاحب۔
۱۰۱	سٹوما ملا صاحب (۱۱)	(۱۱) سوٹا ملا صاحب۔
۱۰۹	حرف مسلمانوں کا مسئلہ۔	نہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ
۱۱۰	ایک جگہ دیکھا کہ اِک جگہ	اِک جگہ دیکھا کہ گائے۔
۱۱۱	ثابت ہوئے تھے۔	ثابت ہوتے تھے۔
۱۱۲	رات کے لوگوں۔	سوات کے لوگوں۔
۱۱۶	میاں عبدالخالق۔	میاں گل عبدالخالق۔
۱۱۷	عبدالخالق کے عہدیں۔	عبدالخالق کے عہد میں۔
۱۱۸	مرحون منت۔	مرہونِ منت۔
۱۲۶	یا لوڑ دونگا سارے ھی یہ ساغر۔	یا لوڑ دونگا سارے ھی یہ ساغر
۱۳۴ آٹھویں سطر	سوات کے افراد قبائلی ماحول۔	سوات کے آزاد قبائلی ماحول۔
۱۴۳ ساتویں سطر	ھمارے گاؤں سیدو کو نوٹ	ھمارے گاؤں سیدو کو لوٹ۔
۱۴۴ دوسری سطر	شہوزئی۔	شموزئی۔
۱۴۵ دسویں سطر	پُدخاش	پرخاش
۱۵۴	بہرصورت ہیں۔	بہرصورت اُن کی۔
۱۵۹ چھٹی سطر	زیادہ خصہ	زیادہ حصّہ۔

صفحہ نمبر و سطر نمبر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۱۷۱	مدہم ہے۔	ڈاکٹر گستاؤلی بان۔
۱۷۹ آخیر دوسری سطر	مجھے جانتا تھا۔	میں جانتا تھا۔
۱۷۹ آخری سطر	دھچکا لگنا۔	دِھکا لگنا۔
۱۸۰ چھٹی سطر	اس کی امون	اُس کی آمدن۔
۱۸۲	تازہ کوام	تازہ گدام۔
۲۰۴ اٹھارویں سطر	اس پرسوات کے لوگ۔	اپرسوات کے لوگ۔
۲۱۴ آخیری سطر	ھدایات سُنا کریں اب۔	ھدایات سنا کر میں سیدُ چلا آیا۔
۲۱۵ چوتھی سطر	چار گھنٹوں کی مصافت۔	چار گھنٹوں کی مُسافت۔
۲۴۱ آٹھویں سطر	سپہ سالار سے نہیں کی۔	سپہ سالار سے نہ کی۔
۲۵۱ سولھویں سطر سے	صحیح قِسم کے وفادار بھی عموماً۔	صحیح قسم کے وفادار اور حق پرست جیسے افراد بھرتی کرے، جن کا ایمان غیر متزلزل ہو۔ اور نیز اپنے مخلِص اور وفادار احباب کی دانشمندانہ اور مخلصانہ رائے کو محض حکمرانی کی رعونت کیوجہ سے درگذر کرنا نہ تو دانشمندی ہے اور نہ مروت، مضبوط کردار رکھنے والے افراد بھی عموماً۔
۲۵۵ آخری سطر	علاقہ قد کانا۔	علاقہ کانا۔
۲۷۲ آخری سطر	مسلسل چنگی مہمات۔	مسلسل جنگی مہمات۔
۲۷۵ تیرھویں سطر	مُہر صوابی	مہر عنوانی۔
۲۷۴	قاضی کے بعد بھر	قاضی کے بعد پھر۔

صفحہ نمبر و سطر نمبر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۲۹۰ نویں سطر	آپ لوگ اسلمہ	آپ لوگ اسلمہ۔
۳۰۲	معتدل نستم۔	معتدل قسم۔
۳۰۴	دردویہ ہائی سکول۔	دودویہ ہائی سکول۔
۳۰۴ پندرھویں سطر	سید وشریف ہیں۔	سید وشریف اور منگورہ ہیں۔
۳۰۵	کی کاوشوں کا۔	کی کوششوں کے نتائج ہیں۔
۳۰۶ چوتھی سطر	عرائض نویس وستم۔	عرائض نویس قسم۔
۳۰۶ اٹھارویں سطر	کلیلد رمند	کلیلد ومند۔
۳۰۸ تیرھویں سطر	اور دوسرے مغالات۔	اور دوسرے معاملات۔
۳۰۸ آخری سطر	ضرورت ہیں۔ نہیں۔	ضرورت نہیں۔
۳۰۹	اپنے حکمران کے سپرد۔	اپنے حاکموں کے سپرد۔
۳۱۲ آخری سطر	لاوارث قسم۔	لاوارث قسم۔
۳۱۵ دسویں سطر	نوجوان قرض خوار۔	نوجوان قرض خواہ۔
۳۱۷ دوسری سطر	انچارج تحصیلدار	انچارج حاکم۔
۳۲۳ آخری سطر	برعظیم مسلمانوں۔	برعظیم کے مسلمانوں۔
۳۲۶ نویں سطر	جذبات سے آہنگ۔	جذبات سے ہم آہنگ۔
۳۲۹ گیارھویں سطر	احادیث شریعت۔	احادیث شریف۔
۳۳۱ آخری سطر	اہل تھے	اہل ہیں۔
۳۳۳ چوتھی سطر سے	وفات کے بعد	وفات کے بعد دس سال کی عمر سے چودہ برس کی عمر تک یعنی چار سال تو میں خلوت نشین رہا۔

صفحہ نمبر و سطر نمبر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۳۳۵ آخری سطر	بین الاقوامی سیات۔	بین الاقوامی سیاسیات۔
۳۳۴ پندھویں سطر	اپنے منہ آپ قسم۔	اپنے منہ آپ اس قسم۔
۳۴۱ آخری دوسری "	حلوہ مرنے سے	حلوہ مرنے سے۔
۳۴۷ دوسری "	جم غضیر۔	جم غفیر۔
۳۴۷ بارھویں "	زیادہ اُس نے۔	زیادہ اس نے مکرّر ہے۔ جو غلط ہے۔
۳۴۸ چھٹی "	دین اسلام کی۔	دین اسلام کی شعاعوں۔
۳۴۹ چوتھی "	شجاع الملک جو اُس کا بھائی تھا۔	شجاع الملک کا اِک بھائی تھا جس نے۔
۳۵۶ اٹھارھویں "	تقدس کی حقیقت۔	تقدس کے حقیقی۔
۳۶۰ چودھویں "	سوات ملاقاتیوں۔	سوات کے ملاقاتیوں۔
۳۶۶ دسویں "	بہت جلد سہر	بہت جلد شہر۔
۳۶۷ اٹھارویں "	ادائیگی غافل نہیں	ادائیگی سے غافل نہیں۔
۳۶۹ چھٹی "	گھڑی گھڑی جس	گھڑی گھڑی بس۔
۳۶۹ نویں "	پاس ہی باتی پھرتی ہیں۔	پاس ہی اُڑتی پھرتی ہیں۔
۳۶۹ دسویں "	بیچاروں کے اور۔	بیچاروں کے لئے اور۔
۳۷۰ بارھویں "	بے چارا غم۔	بے جا زعم۔
۳۷۱ نویں "	رقبہ تمہارے باغ میلوں۔	رقبہ تمہارے باغ کا میلوں۔
۳۷۱ بارھویں "	بڑھتا جارہا ہے۔	بڑھتا جارہا ہو۔
۳۷۵ دوسری "	چشم تواز پردگیما۔	چشمِ تواز پردگی ہا۔
" دوسری "	دِل میان رمیندات۔	دِل میان سینہ ات۔
" بارھویں "	اوریشے۔	اردشیرے۔

صفحہ نمبر و سطر نمبر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۳۷۷ پہلی سطر	کو پھاڑتے۔	کو پچھاڑتے۔
۳۷۷ اٹھارویں "	عزائم تھے۔	عزائم مضبوط تھے
۳۸۰ بارھویں "	اس قسم کے۔	اس قسم کے اِنسانوں کے۔
۳۸۰ اٹھارویں "	معاشرے کی اصلاع۔	معاشرے کی اِصلاح۔
۳۸۱ دوسری "	ذاتی آمدن کے۔	ذاتی آمدن سے۔
۳۸۱ چوتھی "	ورنہ اکر۔	ورنہ اگر۔
۳۸۱ گیارھویں "	انگور پر تو کرتے۔	انگور پر تو صرف کرتے۔
۳۸۲ سولھویں "	کی ذات میں اِتنا بھی۔	کی ذات میں غرور کا اِتنا بھی۔
۳۸۲ پندرھویں "	اُٹھ کر مُسافحہ۔	اُٹھ کر مصافحہ۔
۳۸۲ ستارھویں "	سوات میں کا اور غرور بھی۔	سوات میں غرور بھی۔
۳۸۳ آخری سطر	اِک روشن اور بیدار مغز۔	اِک روشن خیال اور بیدار مغز۔
۳۸۵ چھٹی "	کرنا چاہیے قبائلی	کرنا چاہیئے کہ قبائیلی۔
۳۸۶ گیارھویں "	ظہر کی نماز وضو پر۔	ظہر کی نماز پڑھ لیتے۔
۳۸۶ آخری "	اِیضائے عہد۔	اِیفائے عہد۔
۳۸۷ پہلی "	ہر مسلمان کو۔	ہر مسلمان کے لئے۔
۳۸۷ پہلی "	آج کل صاحب۔	آج کل کے صاحب۔
۳۸۷ اٹھارویں "	عقیدت مندانہ قسم کی صحبت	عقیدت مندانہ قسم کی محبّت
۳۸۸ تیسری "	دوسرا اِس میں۔	دوسرا اِس وسیع القلبی۔
۳۸۸ پانچویں "	افراد کو پڑھنے۔	افراد کو پرکھنے۔
۳۸۹ آٹھویں "	سخت گیر یا جاندار۔	سخت گیر یا جابرانہ۔

صفحہ نمبر و سطر نمبر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۳۸۹ بارھویں سطر	بادشاہ صاحب مافوق البشر۔	بادشاہ صاحب قوی البشر۔
۳۸۹ پندرھویں "	گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما۔	گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما۔
۳۹۰ دوسری "	بادشاہ کی۔	بادشاہ صاحب کی۔
۳۹۳ دوسری "	دلدادہ گان عشرت مرد کیسے۔	دلدادہ گان عشرت مرد آہن کیسے۔
۳۹۶ چوتھی "	لیکن کیا بادشاہ۔	لیکن کیسا بادشاہ۔
۳۹۸ چوتھی "	انگریزی عیارانہ قسم۔	انگریزی کی عیارانہ قسم۔
۴۰۲ پہلی "	فتاوے درودیہ۔	فتاوے دودیہ۔
۴۰۲ پندرھویں "	کلیگ ورمنگ (کلیلہ ودمنہ)	کلیلگ ودمنگ (کلیلہ ودمنہ)
۴۰۲ آخری "	بروزیہ۔	"بروزیہ"۔
۴۰۳ ساتویں "	دوسرے مذہب۔	دوسرے مذہب۔
۴۰۵ چھٹی "	کلیلہ ودمنہ	کلیلہ ودمنہ۔
۴۰۵ نویں "	حکمران اور رعیت۔	حکمران اور رعیّت۔
۴۱۴ آخری "	مغربی۔	مغرب۔
۴۱۹ آخری "	بجلی کی مشین۔	بجلی کی مشینیں۔
۴۲۰ اٹھارویں "	بادشاہ صاحب کی گرمائی آرائش گاہ۔	بادشاہ صاحب کی گرمائی رہائش گاہ۔
۴۲۲ آخری "	بن بانس کلاں پہاڑ پر گذار چکے ہیں۔	بن بانس کا گذار چکے ہیں۔
۴۲۷ تیرھویں "	سواتی قوم کا بیسویں ترقی یافتہ۔	سواتی قوم کا قافلہ بیسویں صدی کے ترقی یافتہ
۴۲۷ آخری "	ماحول شہری۔	ماحول میں شہری۔
۴۳۴ آخری دوسری "	کتابی ترتیب کچھ مناسب بسی ہو جاتی۔	کتابی ترتیب کچھ مناسب سی ہو جاتی۔
۴۳۴ آخری "	دوسرے دور۔	دوسرے دور۔

صفحہ نمبر و سطر نمبر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۴۳۵ تیرھویں سطر	ذات کو لعن وطعن نہیں بنائینگے۔	ذات کو لعن وطعن کا نشانہ نہیں بنائینگے۔
۴۳۷ سولھویں "	کسی غریب کی آنکھوں	کسی غریب کی اُن کی آنکھوں۔
۴۳۸ اُنیسویں "	محروم ہو جاتا ہے۔	محروم رہتا ہے۔
۴۴۶ آٹھویں "	اِک مُصنِف اور دیانتدار۔	اِک مُنصِف اور دیانتدار۔
۴۵۰ آخری "	رو جھل	اُو جھل۔
۴۵۵ چوتھی "	حذرز آہ نظیری۔	حذرز آہ نظیری۔
۴۵۶ آخری "	ہتواتر۔	متواتر۔
۴۵۸ چھٹی "	بابوزئی کے معززین اور خواتین۔	بابوزئی کے معززین اور خوانین (جمع خان کی)

نوٹ :۔ جہاں جہاں جری دِل شیر لکھا ہے اُسے جری دِل شہیر پڑھا جائے۔